دعوت وارشاد

کورس برائے بی ایس علومِ اسلامیہ

کورس کوڈ:1911　　　　　　　　یونٹ01-09

تالیف

ڈاکٹر محمد سجاد

چیئرمین/ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبہ مطالعات بین المذاہب

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

ایڈیشن: ———— 2021ء

سال اشاعت ———— 2021ء

تعداد اشاعت: ———— 1000

نگران طباعت ———— ڈاکٹر سرمد اقبال

طابع: ———— علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

ناشر: ———— علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس ٹیم

چیئرمین	پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی ڈین کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد
مؤلف	ڈاکٹر حافظ محمد سجاد چیئرمین شعبہ انٹر فیتھ اسٹڈیز علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد
نظر ثانی	(۱) پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی ڈین کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (۲) ڈاکٹر احمد رضا اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ فکر اسلامی تاریخ وثقافت (۳) ڈاکٹر طاہر اسلام عسکری اسسٹنٹ شعبہ فکر اسلامی تاریخ وثقافت
کورس رابطہ کار	ڈاکٹر حافظ محمد سجاد چیئرمین شعبہ انٹر فیتھ اسٹڈیز
تدوین	عنبرین اعجاز

فہرست عنوانات

صفحہ نمبر

کورس کا تعارف	v
کورس کے مقاصد	ix
دعوت وارشاد پر اہم کتب	x
یونٹ نمبر 1: دعوت دین کا مفہوم، ضرورت واہمیت	01
یونٹ نمبر 2: داعی کے اوصاف	31
یونٹ نمبر 3: دعوت: منہج واصول	75
یونٹ نمبر 4: تاریخ دعوت انبیا کرام علیہم السلام	123
یونٹ نمبر 5: داعی اعظم ﷺ کی دعوت (مکی ومدنی دور)	173
یونٹ نمبر 6: داعی اعظم ﷺ کا منہج وحکمت عملی	229
یونٹ نمبر 7: دعوتی تحریکات، جماعات وتنظیمات	263
یونٹ نمبر 8: مکالمہ	341
یونٹ نمبر 9: عصر حاضر میں دعوتی مسائل ووسائل	401

کورس کا تعارف

اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُوہٗ و نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ. اَمَّا بَعْدُ! فَاِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ وَ خَیْرَ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ شَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا وَ کُلَّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ وَ کُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ وَ کُلَّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ [1]۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا [2]

دعوت دین ایک اہم دینی فریضہ ہے۔ یہ امت مسلمہ کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ علماء اور امت کے باشعور طبقہ پر بالخصوص فرض ہے کہ وہ دعوتِ دین کا کام انجام دیں۔ تبلیغ دین کا مشن ہر زمانے میں جاری رہا ہے اور موجودہ حالات میں بھی اس کی اتنی ہی ضرورت ہے۔ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے امتی کے مشن کو بیان کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ) [3]

(اے نبی) آپ کہہ دیجیے یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں بصیرت کے ساتھ، میں اور میرے ساتھی بھی۔ اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔

یہی امت کا اصل مشن ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ امت مسلمہ میں ہر دور میں کم از کم ایک ایسی جماعت کا وجود ضروری ہے جو عام لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿وَلْتَکُنْ مِنْکُمْ أُمَّۃٌ یَدْعُونَ إِلَی الْخَیْرِ وَیَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَأُولَئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ [4]

---

1 مسلم، کتاب الجمعۃ، باب خطبتہ فی الجمعۃ: ٦۔ ١٥٣۔

2 الاحزاب ٣٣: ٧٠، ٧١

3 سورۃ یوسف: ١٠٨

4 سورۃ آل عمران ٣: ١٠٤

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہیے جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اندر ضرور بالضرور ایک ایسی جماعت ہونی ہی چاہیے جو لوگوں کو خیر و بھلائی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔ نیز اس آیت کے سیاق میں علماء نے صراحت کی ہے کہ اہل کتاب کا ذکر کرنے کے بعد، پہلے تو امت کو ہدایت دی گئی تقویٰ، ایمان باللہ اور ایک ساتھ متحد ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کی اور اختلاف و تفرقہ سے دور رہنے کی۔ آگے اس آیت میں امت کو خارج کا پروگرام دیا گیا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں اور اللہ کی بندگی واطاعت کی طرف انہیں بلائیں۔ دعوت دین یعنی غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینا شہادتِ حق بھی ہے، اللہ کا واضح فرمان موجود ہے۔

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾[1]

اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک ''امت وسط'' بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ دنیا کے لوگوں پر حق کی گواہ ہو۔ یعنی جس طرح رسول اکرم ﷺ نے اپنے قول و فعل سے پوری زندگی حق کی گواہی دی اور اس کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اب امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ دنیا کے لیے حق کی زندہ شہادت ہو اور اس دین حق کا عملی ثبوت فراہم کرے۔ امت مسلمہ کو دیکھ کر دنیا کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس دنیا میں بسنے والے انسانوں کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور انسانیت کے لیے حقیقی راہِ نجات کیا ہے؟ اس گواہی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جس طرح نبی مکرم ﷺ نے تبلیغ دین کا حق ادا کیا، پوری زندگی اللہ تعالی کا پیغام انسانوں تک پہنچاتے رہے اسی طرح اس کا حق ادا کیا جائے اور پوری زندگی اس مشن کو زندہ اور قائم رکھا جائے۔ اس آیت کی شرح و تفسیر میں مفسرین کی یہ صراحت ملتی ہے کہ ہم مسلمانوں کو روز محشر اللہ کی عدالت میں اس بات کی شہادت دینی ہوگی کہ اے اللہ تیرے رسول ﷺ کے ذریعہ ہم کو جو ہدایت ملی تھی، ہم مسلمانوں نے اسے تیرے عام بندوں تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اے اللہ! ترے آخری نبی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے ہم کو جو دینِ حق ملا تھا، ہم نے اسے من و عن پوری دنیا تک پہنچادیا اور اسے قبول کرنے کی عام دعوت

---

[1] سورۃ البقرۃ ۲:۱۴۳

دی۔ ظاہر ہے اس دنیا میں اگر ہم نے دعوت دین کا کام نہیں کیا اور اللہ کے بندوں تک دین حق کا پیغام لے کر نہیں پہنچے اور ان کو قبول اسلام کی دعوت نہیں دی تو آخرت میں اللہ کے دربار میں یہ گواہی ہم کیسے دے سکیں گے؟ جس کا اس آیت مبارکہ میں مطالبہ ہے اور جس گواہی کے لیے بہر حال پیش ہونا ہے۔

آخری خطبہ میں آپ ﷺ نے مجمعِ عام سے گواہی بھی لی کہ تم سب اس بات کے گواہ رہنا کہ مجھ پر تبلیغ دین کی جو ذمہ داری تھی، میں نے اسے ادا کر دیا ہے۔ اسی طرح آج دنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت کو پہنچانے کی یہ ذمہ داری ہم مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ امت مسلمہ کا مقصد وجود ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾[1]

(اب دنیا میں) وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں (کی ہدایت و اصلاح) کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس خیر امت کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے جملہ انسانوں کی ہدایت و رہ نمائی کے لیے برپا کیا ہے۔ اس کا دائرہ عمل پوری دنیا ہے اور اس کی مخاطب پوری انسانیت یعنی دنیا میں بسنے والے سارے انسان ہیں۔ اس دنیا کی سب سے بڑی سچائی اسلام ہے اور یہی نجات کا واحد راستہ ہے۔ اس کی طرف لوگوں کو بلانا، سب سے بڑی نیکی ہے۔ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت اللہ کا وجود ہے۔ توحید کا پیغام عام کرنے اور انسانیت کو بندگی رب کی دعوت دینا ہی سب سے بہتر کام ہے۔ ظاہر ہے جو لوگ اسلام کی دعوت دیں گے ان کی پہلی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس پر عمل کریں۔ نیک بنیں اور اپنے اعمال و کردار سے اس سچائی کو ثابت کریں۔ قرآن مجید میں ایک جگہ اسی بات کو بڑے خوب صورت انداز میں کہا گیا ہے:

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾[2]

(اور اس شخص کی بات سے اچھی بات کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا میں مسلمان ہوں)۔

دعوت میں مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے منہج دعوت کی بڑی اہمیت ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ لوگ

---

1 آل عمران ۳: ۱۱۰

2 سورۃ حم السجدۃ ۴۱: ۳۳

دعوت سے قبل دعوت دینے والے کو دیکھتے ہیں، اگر داعی باکردار ہو تو پھر اس کی دعوت پر بھی غور ہوتا ہے۔ داعی کی اہمیت کا راز یہ ہے کہ وہ مدعوین کے لیے نمونہ ہے۔ اکثر لوگ بات کی بجائے عمل سے متاثر ہوتے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر سننے کی بجائے دیکھتے ہیں۔ لوگ داعی کی شخصیت، اسلوب، اخلاق اور لین دین سے اس کے علم و تبلیغ کی نسبت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ یہی تاثر لوگوں کو داعی کی بات ماننے پر مجبور کرتا ہے۔ داعی جس قدر اچھی خوبیوں اور صفات سے متصف ہو گا اسی قدر اس کی دعوت زیادہ موثر اور پر تاثیر ہو گی اور لوگوں میں اس کی قبولیت زیادہ ہو گی۔ داعی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی کچھ خاص صفات اور خوبیاں ہوں، وہ مخصوص عادات کا پابند ہو اور قابل قدر امتیازات کا حامل ہو۔ تاکہ وہ مدعوین کو متاثر کرے اور اس کی دعوت بار آور ثابت ہو۔ وگرنہ اس کے بغیر دعوت کامیاب نہیں ہو گی۔

اس کورس کا بنیادی و مرکزی موضوع دعوت ہے۔ دعوت و تبلیغ کی اہمیت، فرضیت اور داعی کے اوصاف پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ منہج واصول دعوت کے قرآنی اصولوں کو بیان کیا گیا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے دعوتی اسالیب کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی دعوتی حکمت عملی، مناہج واسلوب اور مکی و مدنی دور کی دعوتی تاریخ کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ عصر حاضر میں مکالمہ ایک دعوتی مشن ہے۔ اس کے دعوتی اثرات اور اس کے بنیادی اصولوں کو بیان کیا گیا ہے۔ آج کی دنیا معلومات کی دنیا ہے۔ جدید ابلاغی وسائل وذرائع سے چند سیکنڈ میں ایک بات دنیا بھر میں پھیل جاتی ہے۔ ان جدید مواصلاتی ذرائع کو دعوت دین میں موثر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے بھی بات کی گئی ہے۔

علوم اسلامیہ کے طلبہ کے لیے بالخصوص اور دعاۃ و مبلغین کے بالعموم یہ کورس بہت مفید ہو گا۔ ہمیں امید ہے طلبہ اس کورس کے مطالعہ سے بھرپور مستفید ہوں گے۔ اس کورس کی تیاری میں محترم ڈین کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی صاحب کی سرپرستی وراہنمائی حاصل رہی۔ برادر محترم ڈاکٹر احمد رضا صاحب اور ڈاکٹر طاہر اسلام عسکری صاحب نے کورس کی تیاری و نظر ثانی میں بھرپور معاونت فرمائی، راقم صمیم قلب سے ان حضرات کا شکر گزار ہے۔ اس کے علاوہ راقم اپنے اساتذہ کرام اور احباب کا بھی شکر گزار ہے جن کے عملی و علمی تعاون سے یہ مکمل ہو سکا۔ اللہ تعالی سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر محمد سجاد

چیئر مین شعبہ مطالعات بین المذاہب

کورس کے مقاصد

امید ہے کہ اس کورس کے مطالعہ کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ دعوت کا مفہوم، اہمیت اور فضیلت جان سکیں۔

2۔ قرآن و سنت کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کا مطالعہ کر سکیں۔

3۔ دعوت دین میں اصول دعوت کی اہمیت سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

4۔ قرآنی اصول دعوت کا مطالعہ کر سکیں۔

5۔ داعی کے اخلاقی و داعیانہ اوصاف سے آگاہی حاصل کر سکیں۔

6۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے دعوتی منہج و اسلوب کا مطالعہ کر سکیں

7۔ رسول اکرم ﷺ کی دعوت و تبلیغ کے اسوہ حسنہ کا مطالعہ کر سکیں۔

8۔ آپ ﷺ کی دعوتی حکمت عملی اور منہج و اسلوب کو جان سکیں

9۔ مکالمہ کی دعوتی اہمیت اور اصولوں کو جان سکیں۔

10۔ عصر حاضر میں دعوتی وسائل و مسائل کا مطالعہ کر سکیں۔

دعوت وارشاد پر اہم کتب

کورس کی تیاری میں بنیادی مصادر کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ہر یونٹ کے فُٹ نوٹ میں حواشی و حوالہ جات کا اہتمام کیا گیا ہے۔ دعوت و تبلیغ کے موضوع پر لکھی گئی کتب اور مقالات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ جہاں سے بھی مواد اخذ کیا گیا ہے اس کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ طلبہ کو چاہیے کہ کو اپنے مطالعہ میں درج ذیل کتب کو بھی شامل کریں۔

1۔ عدنان عرعور، منهج الدعوة في ضوء الواقع المعاصر، سعودی عرب، مترجم، عبد الرحمن بن یوسف، ڈاکٹر، دعوت دین کا طریقہ کار، مکتبہ ابن تیمیہ، لاہور۔

2۔ صفی الرحمٰن، مبارک پوری مولانا، الرحیق المختوم، ن المکتبۃ السلفیہ، لاہور، پاکستان، ط، ۱۹۹۵۔

3۔ ابراہیم عبداللہ، التدرج في الدعوة

4۔ سعید بن علی بن وهف القحطانی کی "الحكمة في الدعوة الى الله"

5۔ محمد ابراہیم الجیجوشی من وسائل الدعوة في عهد نبوی ﷺ

6۔ محمد صالح عثیمین، الاعتدال في الدعوة

7۔ صالح بن عبد العزیز کی البصیرہ فی الدعوۃ الی اللہ

8۔ سید سلیمان ندوی کی رسول اکرم کا اسلوب تبلیغ، دعوہ اکیڈیمی، اسلام آباد

9۔ امین احسن اصلاحی، دعوت دین اور اس کا طریق کار،

10۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، حکمت تبلیغ، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور

11۔ وحید الدین خان، مطالعہ سیرت، دار التذکیر، لاہور

12۔ ابوالحسن علی ندوی، رسول اللہ کی تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب، مجلس نشریات اسلام، کراچی

13۔ شوکت علی شوکانی، منہج دعوت نبوی، دار الاندلس، لاہور

14۔ محمد شاہد، دور حاضر میں دعوت دین، دعوۃ اکیڈیمی، اسلام آباد

15۔ محمد یوسف، دعوت اسلامی، تعارف و مقاصد، لاہور

16۔ فریدہ یوسف، دعوت و تبلیغ، ملتان

یونٹ نمبر1

دعوت و تبلیغ کا مفہوم اور ضرورت واہمیت

تالیف:

ڈاکٹر محمد سجاد

فہرست

	صفحہ نمبر
یونٹ کا تعارف	3
یونٹ کے مقاصد	4
1۔ دعوۃ کا مفہوم	5
1.1۔ دعوت کا اصطلاحی مفہوم	6
1.2۔ تبلیغ کا مفہوم	7
2۔ قرآن حکیم کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کی ضرورت واہمیت	9
2.1۔ دعوت: بعثت انبیاء کرام علیہم السلام کا مقصد	9
2.2۔ دعوت: رسول اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد	11
2.3۔ دعوت: امت مسلمہ کا بنیادی مقصد	14
3۔ تعلیمات نبوی ﷺ میں دعوت دین کی اہمیت	17
3.1۔ دعوت دین کا تاکیدی حکم	17
3.2۔ ہر سطح پر برائی سے روکنے کا حکم	17
3.3۔ داعئ اعظم ﷺ اور امت کی مثال	18
4۔ دعوت و تبلیغ کی اہمیت علماء اسلام کی نظر میں	19
5۔ تبلیغ دین کے عقلی دلائل	23
6۔ دعوت و تبلیغ کے اغراض و مقاصد	26
6.1۔ بنیادی انسانی ضروریات کی تکمیل	26
6.2۔ رضائے الٰہی	27
6.3۔ نصرت دین	27
6.4۔ اتمام حجت	28
6.5۔ غلبہ اسلام	29
6.6 ۔مقصد تخلیق کی تکمیل	29
خود آزمائی	30
ماخذ و مصادر	30

یونٹ کا تعارف

اسلام دین دعوت ہے۔ یہ پوری انسانیت کے لیے پیغام ہدایت ہے۔ دین اسلام کے آفاقی اور ہمہ جہت پیغام کو دنیا کے ہر فرد تک پہنچانے کے لیے دعوت دین کی ضرورت واہمیت مسلمہ ہے۔ انسانیت کی رشد وہدایت اور فلاح دارین کے لیے اللہ تعالی نے انبیائے کرام علیہم السلام مبعوث فرمایا۔انہیں دعوت و تبلیغ جیسااہم ترین فریضہ سونپا۔ بعثت انبیاء کا بنیادی مقصد انسانیت کی ہدایت واصلاح ہے۔ دنیا خیر وشر کے مجموعے سے عبارت ہے۔ لٰہذاانسانیت کو ضلالت وگمراہی سے بچانے اور نورہدایت سے نوازنے کے لیے یکے بعد دیگرے انبیائے کرام علیہم السلام تشریف لاتے رہے اور اپنافرض منصبی ادافرماتے رہے۔

قرآن حکیم میں نبی اکرم ﷺ کے لیے دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ کے کلمات ارشاد فرما کر آپ ﷺ کو داعی اعظم کا عظیم منصب عطافرمایا گیا۔ آنحضرت ﷺ سے پہلے جو رسول آئے وہ اپنی اپنی قوموں کے لئے داعی بن کر آئے۔ آنحضرت ﷺ چونکہ خاتم الانبیاء اور خاتم الرسل ہیں اسی وجہ سے آپ ﷺ کی بعثت تمام خلق کی طرف ہوئی ہے ۔آپ ﷺ نے حکم الہی کے مطابق دعوت دین کا آغاز فرمایا۔آپ کی یہ دعوت کئی مراحل پر مشتمل تھی۔ سب سے پہلے دعوت ذوالعشیرہ ' پھر پس پردہ دعوت کے تین سال 'اس کے بعد دعوت عام اور پھر حکم الہی ہوا کہ ام القری اور اس کے ارد گرد قبائل تک اللہ تعالی کے پیغام ہدایت کی تبلیغ کریں۔ صلح حدیبیہ کے بعد عالمی دعوت کا آغاز ہوا۔آپ ﷺ نے مختلف قبائل اور اس وقت کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو دعوت حق دی۔

داعیٔ اعظم ' معلم کائنات حضرت محمد مصطفی ﷺ پر جب نبوت ورسالت کا سلسلہ ختم ہواتو دعوت و تبلیغ کی ' یہ عظیم ذمہ داری امت محمدیہ ﷺ کو سونپ دی گئی۔ امت محمدیہ ﷺ کی تخلیق کا بنیادی مقصد بھی دعوت وارشاد ہے۔ اسی کام کی وجہ سے اس کو بہترین امت قرار دیا گیا ہے۔اس امت کا ہر فرد نیکی ' بھلائی ' خیر ' ہدایت واصلاح اور معروف کی طرف دعوت دینے والا ہے اور منکر ' بدی اور برائی سے روکنے والا ہے۔ چنانچہ اس امت میں مستقل ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خیر و بھلائی کی دعوت دیتی رہے اور بدی و برائی سے روکتی رہے۔ امت مسلمہ نے اس عظیم منصب کی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے ہر دور میں دعوت دین کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلایا ہے اور دعوت دین کا یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔اس یونٹ میں دعوت و تبلیغ کا مفہوم 'اس کی ضرورت اہمیت اور دعوت دین کے عقلی دلائل کے ساتھ ساتھ دعوت و تبلیغ کے اغراض ومقاصد پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

۱۔ دعوت و تبلیغ کا لغوی و اصطلاحی معنی و مفہوم جان سکیں۔

۲۔ دعوت و تبلیغ کی ضرورت و اہمیت اور افادیت جان سکیں۔

۳۔ انبیا کرام علیہم السلام کی بعثت کے مقاصد سے آگاہ ہو سکیں۔

۴۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے مقاصد جان سکیں۔

۵۔ امت مسلمہ کی بنیادی ذمہ داری کے بارے میں جان سکیں۔

۶۔ قرآن حکیم اور تعلیمات نبوی کی روشنی میں دعوت دین کی اہمیت سے روشناس ہو سکیں۔

۷۔ علماء امت کی نظر میں تبلیغ کی اہمیت سے واقف ہو سکیں۔

۸۔ دعوت و تبلیغ کے اغراض و مقاصد سے آگہی حاصل کر سکیں۔

1۔ دعوت کا لغوی مفہوم

قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں دین کی طرف بلانے کے لیے جو کلمات و اصطلاحات آئی ہیں ان میں سے ایک لفظ ”دعوت“ ہے۔ یہ کلمہ (د ع و ت) قرآن مجید میں دو سو آٹھ مرتبہ مختلف صیغوں اور صورتوں میں آیا ہے۔ جس میں چوالیس مرتبہ اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کی طرف بلانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔[1]

دعوت کے لفظی معنی کسی اہم، قابل قدر اور بڑے کام کی طرف بلانا ہے یعنی ”دعا، یدعو کا مصدر اگر ”دعوة“ (بفتح دال) ہو گا تو اس کے معنی ہوں گے ”مہمانی کے لیے دعوت دینا“ اگر دعوة (بضم دال) ہو گا تو معنی ہوں گے جنگ کے لیے پکارنا اور چیلنج کرنا، اور اگر ”دعوة“ (بکسر دال) ہو گا تو معنی ہوں گے ”نسب کا دعویٰ کرنا“ انسانی زندگی میں یہ تینوں اہم اور بڑے مواقع ہیں۔ جن کی طرف بلانے کے لیے ”دعوت“ کا کلمہ استعمال ہوتا ہے۔ علامہ زمخشریؒ دعوت کے مفہوم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”دعاه الى الوليمة و دعاه الى القتال ... والنبى داعى الله وهم دعاة الحق“[2]

علامہ راغب اصفہانیؒ کے بقول:

”الدعاء الى الشيء: الحث على قصده“[3]

”دعا سے مراد کسی چیز کو حاصل کرنے کی ترغیب دینا یا اس پر ابھارنا۔“

قرآن مجید میں دعا اور دعوت سے متعلق چند آیات میں درج ذیل معانی بیان ہوئے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَادْعُوا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ﴾[4]

(اور پکارو تم اپنے مددگاروں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔)

﴿ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴾[5]

(میں پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں جب بھی کوئی مجھے پکارتا ہے)

---

[1] محمد فواد، عبد الباقی، المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، (بذیل مادہ) طبع انتشارات اسلامی، تہران (س ن)

[2] زمخشریؒ، ابی القاسم محمود بن عمر، اساس البلاغہ، (۴۶۷-۵۳۸ھ) دار المعرفۃ بیروت، ۱۹۷۹، ص ۱۳۱

[3] اصفہانی، راغب، امام، مفردات القرآن، دار المعرفۃ بیروت، (س ن)، ص ۷۰

[4] سورۃ البقرہ ۲: ۲۳

[5] سورۃ البقرہ ۲: ۱۸۶

﴿الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ ﴾[1]

(جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمھارے جیسے بندے ہیں۔)

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾[2]

(اور تمھارے رب نے کہا تم مجھے پکارو میں تمہاری پکار سنتا ہوں۔)

﴿وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴾[3]

(اور حضرت محمد ﷺ) اللہ کی طرف بلانے والے اس کے حکم کے ساتھ روشن چراغ ہیں۔)

اسی طرح ہدایت، نصیحت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، ذکر، شہادت علی الناس، اظہار دین جیسی قرآنی ااصطلاحات بھی ذکر ہوئی ہیں جن میں دعوت واصلاح اور تبلیغ کا معنی و مفہوم پایا جاتا ہے، قرآن مجید میں مبشر و نذیر کے الفاظ بھی دعوت کے معنی میں ہی آئے ہیں۔ دعوت کے مفہوم میں تقریباً چالیس کے قریب آیات آئی ہیں جن میں دین کی طرف بلانے کا مفہوم موجود ہے۔ دعوۃ کے معنی مفہوم، اس کی وسعت اور قرآن حدیث کی تعلیمات کو مجموعی طور پر سامنے رکھتے ہوئے دعوت کا مفہوم اس طرح متعین کیا جا سکتا ہے کہ

> ”دین کی باتوں کو لوگوں کے سامنے اہتمام، وقار اور حکمت سے اس طرح پیش کرنا کہ وہ اسے اپنے لیے اعزاز و سعادت سمجھتے ہوئے اس کو قبول کر لیں“۔

1.1۔ دعوت کا اصطلاحی مفہوم

علماء نے دعوت کے مفہوم کے بارے جو آراء دی ہیں ان میں سے نمائندہ آراء ذیل میں پیش ہیں:

ا۔ شیخ علیؒ محفوظ لکھتے ہیں:

”الدعوة من الدعاء الى الشيء بمعنى الحث على قصده وفى العرف حث الناس على الخيروالهدى، والامربالمعروف والنهى عن المنكر ليفوزوا بسعادة العاجل والأجل“[4]

> ”دعوت لفظ ”الدعاء“ سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کی طرف بلانا یا کسی چیز کے حاصل کرنے پر ابھارنا تاکہ وہ دنیا و آخرت کی سعادت سے مستفیض ہو سکیں۔“

---

[1] سورۃ الاعراف ۷: ۱۹۴

[2] سورۃ المومن ۴۰: ۶۰

[3] سورۃ الاحزاب ۳۳: ۴۶

[4] علی محفوظ، شیخ، ھدایۃ المرشدین، دار الاعتصام، مصر، ۱۴

۲۔ ڈاکٹر احمد غلوش رقمطراز ہیں :

''والدعوة الى الاسلام تعنى المحاولة العملية اوالقولية لامالته الناس اليه''[1]

''اسلام کی طرف دعوت دینے سے مراد عملی و قولی کوشش کرنا ہے تاکہ لوگوں کو اس کی طرف مائل کیا جاسکے۔''

۳۔ آدم عبداللہ الالوری لکھتے ہیں :

''صرف انظار الناس وعقولهم الى فكر اوعقيدة، وحثهم عليها''[2]

''لوگوں کے نظریات اور ان کی عقول کو کسی فکر یا عقیدہ کی طرف پھیرنا اور انہیں اس کی طرف راغب کرنا۔''

۴۔ محمد ابوالفتح البیانونی 'الدعوة کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''الدعوة الى الاسلام طلب الناس وسوقهم اليه وحثهم على الاخذ به''[3]

''اسلام کی دعوت سے مراد لوگوں کو اس کی طرف بلانا اور اس کی طرف ان کی راہنمائی کرنا ہے اور اس کے اختیار پر ابھارنا ہے۔''

مندرجہ بالا تعریفات سے واضح ہوتا ہے کہ دعوت سے مراد لوگوں کو بلانا، آگاہ کرنا، اور ابھارنا ہے، مزید یہ کہ یہ لفظ دین حق کی طرف بلانے اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے ایسے انداز اور طریقہ کار اختیار کرنے کے لیے مستعمل ہے جس سے مدعو و مخاطب اس کی طرف راغب ہو اور بیان کردہ پیغام کی حقانیت کا قائل ہو جائے اور تسلیم کرے کہ اسی پیغام میں اس کی دنیا و آخرت کی فلاح و نجات ہے۔

1.2۔ تبلیغ کا مفہوم

تبلیغ کے کلمہ کی اصل (ب ل غ) ہے۔ بلغ کے معنی ہیں پہنچنا، پکنا اور بالغ ہونا، جب باب افعال اور تفعیل سے یہ مادہ آئے گا، جیسے ابلغ اور بلغ تو معنی ہوں گے ' پہنچانا ' پیغام رسانی کرنا۔ علامہ زمحشریؒ اس مادہ کے ذیل میں لکھتے ہیں :

---

[1] احمد غلوش، ڈاکٹر، الدعوة الاسلامیہ اصولها و وسائلها، ص ۱۰

[2] الالوری، آدم عبداللہ، تاریخ الدعوة الاسلامیہ، قاہرہ (س ن) ص ۱۷۔

[3] البیانونی، محمد ابوالفتح، المدخل الی علم الدعوة، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۱، ص ۱۶۔

”بلغ الفارس: مديده بعنان فرسه ليزيد فی عدوه......“
یعنی گھوڑے کے تیز دوڑنے کے لیے لگام کو بڑھانا......
بتبلغۃ سے مراد وہ چھوٹی رسی جو بڑی رسیوں کو جوڑنے کا کام دے جیسے
”ووصل رشاءة بتبلغة وهوحبيل يوصل به حتى يبلغ الماء وهوالدرك“[1]
”یعنی اپنی رسی کو چھوٹی رسی سے جوڑا کہ پانی تک ڈول پہنچ جائے جو زیریں حصہ ہے“

اس لغوی معنی سے ہی اصطلاحی معنی واضح ہو جاتے ہیں یعنی مبلغ اور مخاطب کے درمیان ایسا رابطہ قائم کرنا کہ مبلغ کی بات مخاطب کے دل و دماغ تک پہنچ جائے۔ قرآن مجید میں 78 مرتبہ کلمہ تبلیغ وارد ہوا ہے جس میں سے 27 مرتبہ دین کی تبلیغ کے معنی و مفہوم میں وارد ہوا ہے۔[2] کلام کو شیریں و فصیح بنانے کے لیے علم بلاغت میں بھی یہی مادہ ہے اور ذرائع ابلاغ کے لیے بھی یہی مادہ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ دین کی بنیادی تعلیمات و احکام کو لوگوں تک محنت و حکمت، محبت والفت اور فصاحت و بلاغت سے شیرین ومزین بنا کر اس طرح پہنچانا کہ ان کے دل و دماغ میں اتر جائیں۔ یہی دین کی تبلیغ اور طریقہ تبلیغ کا مفہوم ہے۔ اسی تبلیغ کے سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ)[3]

(اے رسول جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔)

رسول اللہ ﷺ نے بھی دعوت و تبلیغ کے لیے تلقین فرمائی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

”نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَ، فَرُبَّ مُبَلِّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ“[4]

”اللہ تعالیٰ خوش وخرم رکھے اس شخص کو جس نے ہم سے کوئی بات سنی اور اسے جیسا سنا تھا ویسا ہی دوسروں تک پہنچایا کیونکہ بہت سے وہ لوگ جنہیں بات پہنچائی جاتی ہے سننے والوں سے زیادہ محافظ ہوتے ہیں۔“

---

[1] زمخشریؒ، علامہ، اساس البلاغہ، ص ۲۹۔
[2] معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم۔ (بذیل مادہ)
[3] سورۃ المائدہ ۵: ۶۷
[4] الترمذی، أَبْوَابُ الْعِلْمِ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَابُ مَا جَاءَ فِي الْحَثِّ عَلَى تَبْلِيغِ السَّمَاعِ

2۔ قرآن حکیم کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کی ضرورت واہمیت

اللہ تعالیٰ نے جن وانس کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ اس یکتا ولاشریک ذات کی عبادت کریں۔ اس کے اوامر و نواہی کی تعظیم کریں چونکہ عبادات کی تفصیلات محض عقل کی بنیاد پر ہی متعین نہیں کی جاسکتی تھیں اور نہ ہی یہ ممکن تھا کہ محض عقل کی بنیاد پر احکام الٰہیہ کی معرفت حاصل کی جا سکے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و راہنمائی کے لیے اپنے رسولوں کو بھیجا اور آسمانی کتابیں نازل فرمائیں تاکہ ان حقائق کو بیان کیا جا سکے جن کی خاطر کائنات کی تخلیق ہوئی اور بنی نوع انسان کو اپنی خلقت کا مقصد معلوم ہو سکے۔ تاکہ قیامت کے دن لوگ یہ عذر نہ کر سکیں کہ ان کو نیکی اور سچائی کا راستہ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ قرآن حکیم نے اس کی یوں وضاحت کی ہے :

(رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا)[1]

(اللہ نے رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر بھیجا تاکہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی حجت باقی نہ رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔)

اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے ہادی اور رسول بھیجے۔ اللہ کے رسولوں نے انہی کی زبان میں حق کی دعوت دی تاکہ حق اچھی طرح واضح ہو جائے اور جن باتوں کی دوسروں کو دعوت دی ان کو خود کر کے بھی دکھایا۔

2.1۔ دعوت : انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں نیکی کو اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کی خواہش ودیعت کر دی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

(فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا)[2]

(پس اس کو اس کی اچھائی اور برائی الہام کر دی۔ پس اس نے فلاح پائی جس نے اس میں اچھائی کو نشو ونما دی اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو معصیت سے آلودہ کئے رکھا)

لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہدایت وضلالت کا معاملہ تنہا انسان کی فطرت پر نہیں رکھا۔ تاکہ انسان یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ اس کو سچائی کا راستہ معلوم نہیں تھا۔ لہٰذا ہر نبی نے اپنے دور میں فریضہ تبلیغ ادا کیا۔ اللہ

---

[1] سورۃ النساء ۴: ۱۶۵

[2] سورۃ الشمس ۹۱: ۸۔۱۰

تعالی نے انبیاء کرام علیہم السلام کو اس مقصد کے لئے چن لیا

(اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ)[1]

(اللہ فرشتوں اور انسانوں میں سے اپنے رسول چن لیتا ہے)

یہ بات دعوت کے فریضہ کی اہمیت کو واضح کرتی ہے کہ اس کی ادائیگی کرنے والے اللہ تعالی کی مخلوق میں سے بہترین لوگ ہیں جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا:

(وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ)[2]

(اور ہم نے ہر امت میں سے ایک رسول اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو)

شیخ محمد رشید رضا نے لکھا ہے:

"خیر کی دعوت دینا، نیکی کا حکم دینا، اور برائی سے روکنا اگرچہ مصائب و خدشات سے بھرا ہوا راستہ ہے لیکن یہی انبیاءؑ، رسولوںؑ اور سلف صالحین کا ثابت شدہ طریقہ ہے۔ ان میں سے کتنے ہی نبیؑ اور صدیق اس راہ میں قتل کئے گئے اور تمام شہداء میں سے افضل قرار پائے۔"[3]

بقول مولانا سید ابو الاعلی مودودی انبیاء نے جو بنیادی اصلاح کی وہ در اصل انسان کو جھوٹے خداؤں کی بندگی سے نجات دلانے کا مشن ہے۔ لکھتے ہیں۔

"ان کا مقصد در اصل یہ تھا کہ جو انسان انسانیت کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں ان کو دھکیل کر پھر اسی حد میں واپس پہنچائیں اور جو اس حد سے نیچے گرا دیے گئے ہیں انہیں ابھار کر واپس اس حد میں لائیں اور سب کو ایسے عادلانہ نظام کا پابند بنائیں جس میں نہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا عبد ہو نہ معبود بلکہ سب ایک اللہ کے بندے بن جائیں۔ ابتداء سے جتنے انبیاء دنیا میں آئے ان سب کا ایک ہی پیغام تھا اور وہ یہی تھا۔"[4]

قرآن مجید میں مختلف انبیاء کرام کی زبان سے کہلوایا ہے۔

---

[1] سورۃ الحج ۲۲: ۷۵

[2] سورۃ النحل ۱۶: ۳۶

[3] رشید رضا، علامہ، تفسیر المنار، ج ۴، ص ۳۲

[4] مودودی، سید ابو الاعلی۔ حکمتِ دعوت، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور ص ۳۳

(لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ)[1]

(اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا؛ اس نے کہا اے میری قوم تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی بندگی کرو)

اسی طرح حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے بھی اپنی قوم کو یہی تاکید کی

(وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ)[2]

(اور (قومِ) ثمود کی طرف ان کے (قومی) بھائی صالح (علیہ السلام) کو (بھیجا)، انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کیا کرو)

اور یہی بات حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو بتائی۔

(وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ)[3]

(اور (قومِ) ثمود کی طرف ان کے (قومی) بھائی صالح (علیہ السلام) کو (بھیجا)، انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کیا کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں)

یہی پیغام حضرت شعیب علیہ السلام کا بھی تھا۔

(وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ)[4]

یعنی گذشتہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنے اپنے زمانے میں فریضہ دعوت ادا کیا۔

2.2۔ دعوت: نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

قرآن مجید کی متعدد آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کا مقصدِ بعثت دعوت الی اللہ ہے۔ آپ ﷺ کو دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دینے کا حکم دیا گیا اور آپ ﷺ نے اس عظیم ذمہ داری کو پورا کیا۔

ارشاد الٰہی ہے:

(يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا)[1]

---

[1] سورۃ الاعراف ۷: ۵۹

[2] سورۃ الاعراف ۷: ۶۵

[3] سورۃ الاعراف ۷: ۷۳

[4] سورۃ الاعراف ۷: ۷۳

(اے نبی (مکرم!) ہم نے بھیجا ہے آپ کو (سب سچائیوں کا) گواہ بنا کر اور خوشخبری سنانے والا اور بروقت ڈرانے والا اور دعوت دینے والا اللہ کی طرف اس کے اذن سے اور آفتاب روشن کر دینے والا۔)

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالی نے حضور نبی اکرم ﷺ کی درج ذیل صفات کا ذکر کیا ہے۔

(۱) نبوت (۲) رسالت (۳) شاہد (۴) مبشر (۵) نذیر (۶) داعی الی اللہ (۷) سراج منیر

داعیا الی اللہ باذنہ کے کلمات ارشاد فرما کر آپ ﷺ کو داعی اعظم کا عظیم منصب عطا فرمایا۔ دیگر صفات میں غور و فکر کیا جائے تو وہ بھی دعوت الی اللہ سے متعلق ہیں۔ کیونکہ نبی اور رسول کا مقصد بعثت ہی دعوت ہے اور شاہد پہلے خود توحید کی شہادت و گواہی دیتا ہے اور پھر شہادتِ توحید کی دعوت دیتا ہے اور مبشر، دعوت قبول کرنے والوں کو یقینی بشارت سے نوازتا ہے اور نذیر، دعوت حق کا انکار کرنے والوں کو بروقت متنبہ کرتا ہے اور داعی کی شخصیت و سیرت سراج منیر کی طرح درخشاں اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں رسول اکرم ﷺ کی داعیانہ حیثیت کو نمایاں طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

(وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا) [2]

(اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام انسانوں کے لئے خوشخبری دینے والا اور آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے)

اس آیت کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"کافۃ للناس" کے الفاظ بھی قابل غور ہیں۔ آنحضرت ﷺ سے پہلے جو رسول آئے وہ اپنی اپنی قوموں کے لئے نذیر بن کر آئے لیکن آنحضرت ﷺ چونکہ خاتم الانبیاء اور خاتم الرسل ہیں اسی وجہ سے آپ ﷺ کی بعثت تمام خلق کی طرف ہوئی ہے۔۔۔ یہاں اس بات کی یاد دہانی سے مقصود اہل کتاب کو متنبہ کرنا ہے کہ دعوت کے اس دور میں انہوں نے بھی درپردہ قریش کی پشت پناہی کرنا شروع کر دی تھی۔ ان کو اس صفت کے حوالہ سے آگاہ کیا کہ جس رسول کی وہ مخالفت کر رہے ہیں وہ صرف قریش کے لئے ہی نذیر نہیں بلکہ اس رسول ﷺ کے ذریعے سے ان کی اپنی قسمت کا فیصلہ بھی ہونا ہے" [3]

---

[1] سورۃ الاحزاب ۳۳: ۴۵، ۴۶

[2] سورۃ سبا ۳۴: ۲۸

[3] اصلاحی، مولانا امین احسن، تدبرِ قرآن، مکتبہ فاران، لاہور، ج، ص ۳۲

آنحضور ﷺ کو اللہ تعالی نے براہ راست خطاب کر کے فرمایا:

(فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ)[1]

(پس آپ ﷺ لوگوں کو اسی کی طرف بلاتے رہیں اور جیسا کہ آپ ﷺ کو حکم دیا گیا مضبوطی سے جم جائیے اور ان کی خواہشوں پر نہ چلیں)

آنحضور ﷺ نے فریضہ دعوت کو کما حقہ انجام دیا اس کی شہادت خود اللہ تعالی نے قرآن مجید میں دی ہے۔ ارشاد الہی ہے۔

(وَإِنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ)[2]

(بے شک آپ ﷺ ان کو سیدھے راستے کی طرف دعوت دیتے ہیں)

آنحضور ﷺ نے فریضہ دعوت کی ہر قسم کے حالات میں، مختلف اوقات اور مقامات پر انجام دیا اور ہر طبقہ اور ہر قسم کے ذہن اور مزاج رکھنے والے لوگوں تک دین حق کو پہنچانے کے لئے حتی الامکان کوشش کی۔ آپ ﷺ نے اس کے لئے مختلف ذرائع اور وسائل بھی استعمال کئے۔ دعوت کے مشن کے لئے آپ ﷺ میں اتنی تڑپ تھی کہ اس تڑپ پر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا:

(لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ)[3]

(کیا آپ ﷺ اپنے آپ کو ہلاک کر لیں گے اگر یہ ایمان نہ لائیں)

اس تبصرے میں جہاں ایک طرف اللہ تعالی کی طرف سے تسلّی کا اظہار ہوتا ہے وہاں دوسری طرف نبی ﷺ کی فکر مندی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> "آخری نبی ہونے کے باوصف اللہ نے آپ ﷺ کو دو بعثتوں سے مبعوث فرمایا؛ ایک بعثت خاص، دوسری عام۔ خاص بعثت عرب کی طرف تھی اس خاص نسبت کی وجہ سے آپ ﷺ کو نبی امی یا عربی نبی کہا گیا۔ وحی کی زبان بھی عربی ہوئی اور اس بعثت کی ذمہ داریاں یعنی تبلیغ اتمام حجت آپ ﷺ نے براہ راست کیں۔ دوسری عام بعثت اور اس کے لئے آپ ﷺ کو

---

1 سورۃ الشوریٰ ۴۲: ۱۵

2 سورۃ المومنون ۲۳: ۷۳

3 سورۃ الشعراء ۲۶: ۳

ایک امت عطا ہوئی اور دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری اس امت پر ڈالی گئی۔"[1]

2.3۔دعوت: امت مسلمہ کا مقصد تخلیق

آنحضور ﷺ کے بعد دعوت دین کا فریضہ امت کے سپرد ہے اور قرآن مجید کے ذریعے حضور اکرم ﷺ اعلان کرتے ہیں:

(قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي)[2]

(آپ ﷺ فرما دیجئے یہ میرا راستہ ہے اور میں اور میرے پیروکار پوری بصیرت کے ساتھ اسی کی طرف دعوت دیتے ہیں)

اللہ تعالی نے اس امت کو اس شرف سے فیض یاب کیا کہ یہ امت کار دعوت میں نبی کی معاون ہو۔ فرمایا:

(كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ)[3]

(تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لئے نکالی گئی ہو۔ تم لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)

امت مسلمہ کو اللہ تعالی نے امت وسط بنایا یعنی یہ امت پیغمبر کی طرف سے تمام قوموں کی طرف بالواسطہ طور پر دعوت پہنچانے پر مامور ہے۔

(وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا)[4]

(اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو)

مولانا وحید الدین لکھتے ہیں:

"دوسری قوموں کے مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اللہ کے دین کو اپناتی ہیں یا نہیں جبکہ امت مسلمہ کا مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اللہ کے دین کی دعوت کو لے کر اٹھتی ہے یا نہیں"[5]

---

[1] اصلاحی، مولانا امین احسن، دعوت دین اور اس کا طریق کار، ص ۳۴

[2] سورۃ یوسف ۱۲: ۱۰۸

[3] سورۃ آل عمران ۳: ۱۱۰

[4] سورۃ البقرہ ۲: ۱۴۳

[5] وحید الدین خاں، مولانا، دعوت اسلام، دار التذکیر، لاہور

امت محمدیہ کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ خود دین پر قائم رہے اور اس کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ امت وسط کا کردار ادا کرتے ہوئے دوسروں کو بھی دین کی دعوت دے۔ اسلام پیغام الٰہی ہے اور امت مسلمہ اس پیغام کی حامل۔

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :

" مسلمان وہ جماعت ہے جو اللہ کی طرف سے ایک خاص پیغام لے کر دنیا میں آئی اس پیغام کو قائم رکھنا اور اس کو پھیلانا اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینا اس کی زندگی کا تنہافریضہ ہے۔ اس پیغام کے ماننے والوں کی ایک برادری ہے جس کے حقوق ہیں؛ یہی ان کی قومیت ہے۔ اس حقیقت کے ظاہر ہونے کے بعد مسلمان قوم کا سب سے بڑا فرض اس پیغام الٰہی کی معرفت اس کی بجا آوری ،اس کی تعلیم ،اس کی دعوت ،اشاعت اور اس کے حلقہ بگوشوں کی پوری برادری کا قیام اور اس کے حقوق کو بجالانا ہے۔"[1]

دعوت و تبلیغ کی وجہ سے اس امت کو خیر امت کہا گیا ہے۔ اس جماعتی فرض کو ادا کرنے کی باضابطہ صورت اللہ تعالیٰ کی خود بتائی ہوئی یہ ہے :

(وَلۡتَكُن مِّنكُمۡ أُمَّةٞ يَدۡعُونَ إِلَى ٱلۡخَيۡرِ وَيَأۡمُرُونَ بِٱلۡمَعۡرُوفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ ٱلۡمُنكَرِۚ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُفۡلِحُونَ)[2]

(اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے ،معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں)۔

قولِ احسن

دعوت وارشاد کے کلمہ اور بات کو اللہ تعالیٰ نے بہترین قول قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے :

(وَمَنۡ أَحۡسَنُ قَوۡلٗا مِّمَّن دَعَآ إِلَى ٱللَّهِ وَعَمِلَ صَٰلِحٗا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ ٱلۡمُسۡلِمِينَ)[3]

(اور اس شخص سے بہتر کس کا کلام ہے جس نے دعوت دی اللہ تعالیٰ کی طرف اور نیک عمل کیے اور کہا کہ میں تو (اپنے رب کے) فرمانبردار بندوں سے ہوں۔)

---

[1] سید سلیمان ندوی، مولانا محمد الیاس اور انکی دینی دعوت: مقدمہ، ص۹،۱۰

[2] سورۃ آل عمران ۳: ۱۰۴

[3] سورۃ حم السجدہ ۴۱: ۳۳

یہاں دعوت الی اللہ کو قول احسن کہا گیا ہے اور داعی کے لیے عمل صالح کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ نیز پوری ذمہ داری سے اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کرنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ محض زبان سے کلمہ پڑھ لینا چنداں مشکل نہیں لیکن احساس ذمہ داری کے ساتھ ایمان واسلام کا اظہار بڑے دل گردے کا کام ہے۔ خصوصاً اس ماحول میں جہاں اسلام کا اظہار مشکل ترین ہو۔

مومن اور منافق میں حد امتیاز

اہل ایمان کی یہ پہچان ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے۔

(وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ) [1]

(نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں حکم کرتے ہیں نیکی کا اور روکتے ہیں برائی سے۔)

اہل ایمان کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے معاون ومددگار ہوتے ہیں اور باہمی تعاون کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ اسلامی معاشرہ میں دعوت دین کی ذمہ داری میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ شامل ہیں۔ لہٰذا ان دونوں طبقوں میں سلسلۂ دعوت ایمان کی پہچان ہے۔

جبکہ منافقین کے بارے میں ارشاد فرمایا:

(اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ) [2]

(منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک جیسے ہیں حکم دیتے ہیں برائی کا اور روکتے ہیں نیکی سے۔)

منافقین کی عادت اور خاصہ یہ ہے کہ نیکی سے منع کرتے ہیں اور برائی کی ترویج کرتے ہیں۔ ان آیات کریمہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دعوت الی اللہ' مسلمانوں اور منافقوں کے درمیان حد امتیاز ہے۔ مومن امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا پیکر ہوتا ہے جبکہ منافق امر بالمنکر اور نہی عن المعروف کا پابند۔

---

[1] سورۃ التوبہ ۹:۷۱

[2] سورۃ التوبہ ۹:۶۷

3۔ تعلیماتِ نبوی ﷺ میں دعوت دین کی اہمیت

اب احادیث مبارکہ کی روشنی میں دعوتِ دین کی ضرورت واہمیت کو بیان کیا جاتا ہے۔

3.1۔ دعوت دین کا تاکیدی حکم

عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ الْيَمَانِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَ لَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ أَوْلَيُوشِكَنَّ اللهُ أَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِّنْهُ ثُمَّ تَدْعُوْنَهُ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ ۔[1]

"حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ تم ضرور نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے منع کرتے رہو ورنہ اس بات کا امکان ہے کہ گناہ گاروں کے ساتھ اللہ تم پر بھی اپنا عذاب نازل کردے پھر تم خدا سے دعا مانگو گے لیکن قبول نہ ہوگی۔"

دعوت دین ایک اہم ترین اور مسلسل ذمہ داری ہے۔ یہ وقت اور جگہ کی پابند نہیں بلکہ حسب موقع جہاں بھی ممکن ہو دعوت کا عمل جاری رہنا چاہیے اور امت کا ایک گروہ ہمیشہ کار دعوت کی ذمہ داری نبھاتا رہے۔ اگر خدا نخواستہ تمام لوگ دعوت و تبلیغ سے کنارہ کش ہو جائیں تو مذکورہ حدیث مبارکہ کے مصداق پوری امت مسلمہ عذاب کی حقدار ہو جائے اور پھر نوبت یہاں تک پہنچ جائے کہ ہم بارگاہِ ربوبیت میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں تو انہیں رد کر دیا جائے۔

3.2۔ ہر سطح پر برائی سے روکنے کا حکم

عن طارق بن شهاب وهذا حدث ابی بکر قال ... فقال ابو سعید ... سمعت رسول الله ﷺ مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَ ذَالِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ۔[2]

---

[1] الترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، الجامع، کتاب الفتن، باب ما جاء فی الامر بالمعروف والنہی عن المنکر، رقم الحدیث: ۲۱۶۹

2 مسلم، ابو الحسین مسلم بن حجاج قشیری، الجامع الصحیح، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان

"تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو ہاتھ (قوت) کے ساتھ روکنے کی کوشش کرے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے منع کردے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو دل سے ضرور برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔"

خیر کی دعوت دینا اور برائی سے روکنا' دین مبین کے بنیادی احکامات میں سے ہے اور امت کے ہر طبقہ کے لوگ اپنے اپنے دائرہ کار اور منصب واختیار کے مطابق اس عمل خیر کے پابند ہیں۔ اہل اقتدار کے لیے حکم ہے کہ وہ طاقت سے برائی کو روکیں' اہل علم کو زبان سے برائی کو روکنے کی ہدایت کی گئی ہے اور عوام برائی کو کم از کم اپنے دل سے برا جانیں اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ اس کے بعد ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

3.3۔ داعیٔ اعظم ﷺ اور امت کی مثال

حدثنا ابو الیمان اخبرنا شعیب حدثنا ابو الزناد عن عبدالرحمن انه حدثه انه سمع ابا هریرة انه سمع رسول الله ﷺ یقول اِنَّمَا مَثَلِیْ وَ مَثَلُ النَّاسِ کَمَثَلِ رَجُلٍ اِسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا اَضَاءَتْ مَا حَوْلَه، جَعَلَ الْفَرَاشُ وَ هٰذِهِ الدَّوَابُّ الَّتِیْ تَقَعُ فِی النَّارِ یَقَعْنَ فِیْهَا فَجَعَلَ یَنْزِعُهُنَّ وَ یَغْلِبْنَه، فَیَقْتَحِمْنَ فِیْهَا فَاَنَا اٰخُذُ بِحُجَزِکُمْ عَنِ النَّارِ وَهُمْ یَقْتَحِمُوْنَ فِیْهَا [1]

"بے شک میری اور لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے (تاریک شب میں) آگ روشن کی' جب روشنی چاروں طرف پھیل گئی تو کیڑے پتنگے اس میں گرنے لگے' وہ انہیں ہٹاتا ہے (کہ نہ گریں) لیکن وہ مانتے ہی نہیں' گرے جارہے ہیں۔ میں بھی تمہیں اسی طرح کمر سے پکڑ پکڑ کر آگ سے دور ہٹاتا ہوں (جو مان گئے تو وہ بچ گئے مگر کافر ہیں کہ) وہ سنتے ہی نہیں' جہنم میں گرتے جارہے ہیں۔"

حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے داعی الی اللہ ہونے اور امت کو گمراہی اور نار جہنم سے بچانے کی مثال بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ داعی کو پوری تندہی سے کار دعوت سرانجام دینا چاہیے اور حتی الامکان لوگوں کو صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے کی سعی کرنی چاہیے اور دعوت حق کے فروغ کے لیے کامل استقامت اختیار کرنی چاہیے۔ اگرچہ ہدایت دینا اللہ رب العزت کا کام ہے لیکن انسانیت تک ہدایت کا پیغام پہنچانا بھی اسی کا حکم ہے لہٰذا داعی کو اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ نتیجہ اور انجام اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے جسے چاہے نور ہدایت عطا فرمادے۔

---

1 البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصی، رقم الحدیث:٦٤٨٣.

دعوت دین سے متعلق قرآن و حدیث کی تعلیمات سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ دین اسلام کے آفاقی اور ہمہ جہت پیغام کو دنیا کے ہر فرد تک پہنچانے کے لیے دعوت دین کی ضرورت واہمیت مسلمہ ہے۔
حضور ﷺ نے تو ہر امتی کو داعی بننے کی ترغیب دی۔ خطبہ حجۃ الوداع کے آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا:
حدثنا مسدد قال حدثنا بشر قال حدث ابن عون عن ابی سیرین عن عبدالرحمن بن ابی بکرۃ عن ابیہ ذکر النبی ﷺ ...لِيُبَلِّغُ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ، فَإِنَّ الشَّاهِدَ عَسَى أَنْ يُّبَلِّغَ مَنْ هُوَ أَوْعَى لَهُ مِنْهُ۔[1]

"جو یہاں موجود ہیں وہ ان لوگوں تک میری باتیں پہنچادیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ موجود شخص ان باتوں کو کسی ایسے شخص تک پہنچادے جو اس سے زیادہ ان کی حفاظت کر سکے۔"
آپ ﷺ نے یہ تعلیم اس لیے دی تاکہ دعوت کا عمل تسلسل سے جاری رہے۔ کئی احادیث میں بھی دعوت دین کی ضرورت واہمیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اسلوب، موقع محل کی مناسبت، داعی کے اوصاف اور دعوت کے دیگر لوازم کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے اس پیغمبرانہ مشن کی عظمت واضح ہوتی ہے۔

4۔ دعوت و تبلیغ کی اہمیت علماء کی نظر میں

قرآن مجید اور سنت نبوی ﷺ سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ دعوت و تبلیغ کو اُمت مسلمہ کی نظر میں ہمیشہ ایک اہم فریضے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ دور حاضر کے علمائے کرام نے بھی اسے امت مسلمہ کا سب سے بڑا فریضہ قرار دیا ہے۔ بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی:
مسلمان قوم کا سب سے بڑا فرض اس پیغام الٰہی کی معرفت، اس کی بجاآوری، اس کی تعلیم، اس کی دعوت، اس کی اشاعت اور اس کے حلقہ بگوشوں کی ایک پوری برادری کا قیام اور اس کے حقوق کو بجالانا ہے۔[2]
مولانا امین احسن اصلاحی کی نظر میں تو اس امت کے خیر امت ہونے کی وجہ یہی ہے:
"یہی فریضہ رسالت ہے جس کی وجہ سے اس امت کو خیر امت کہا گیا۔ اگر مسلمان اس فرض منصبی کو بھلا دیں تو یہ دنیا کی دوسری قوموں میں سے بس ایک قوم ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کو اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ وہ دنیا میں

---

[1] البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب رب مبلغ اوعی من سامع، رقم الحدیث: ۶۷
[2] مودودی، سید ابوالاعلیٰ، اسلام کا نظامِ دعوت و تبلیغ، ص ۵

عزت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں یا ذلت کے ساتھ بلکہ اس فرض کو فراموش کر دینے کے بعد وہ اسی طرح ایک معتوب قوم بن جائیں گے جس طرح دنیا کی دوسری قومیں معتوب ہو گئیں۔[1]

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان امام نووی کے حوالے سے لکھتے ہیں :

اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ اس کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے تو اس کے ایسا سمجھنے سے اس سے یہ فرض ساقط نہیں ہوتا بلکہ اس کے باوجود اس پر یہ فرض عائد رہے گا۔۔۔ کیونکہ داعی پر صرف امر و نہی کی ذمہ داری ہے 'اسے قبول کرانے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہے۔[2]

تاریخ اسلام کے ہر دور میں مسلمانوں نے دعوت کے اسفر یضہکو انفرادی اور اجتماعی طور پر ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ہر مسلمان کی فطرت میں دعوت کا عنصر شامل ہے اور کوئی بھی شعوری مسلمان جس کے ارد گرد غیر مسلم موجود ہوں اسے لازماً ان تک دعوت پہنچانے کا خیال اور فکر رہتی ہے۔ ہاں ادوار 'افراد اور گروہوں کے اعتبار سے انداز کار اور ترجیحات مختلف ہو سکتی ہیں۔ بلکہ درست تو یہ ہے کہ جن جن حالات اور زمانوں میں جس قسم کے کام کی ضرورت رہی اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے افراد کار بھی پیدا کیے اور انہیں اس زمانہ کی ضروریات کے مطابق صلاحیتیں بھی عطا فرمائیں۔

مولانا محمد الیاس کاندھلوی بانی تبلیغی جماعت ' دعوت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

''چار اعمال کی دین میں بہت فضیلت ہے۔ نماز میں نور 'قرآن میں نور 'زکوۃ میں اثر۔ ان اعمال سے انسان کی ذات خود مستفید ہوتی ہے 'خود متاثر ہوتی ہے۔ لیکن دعوت سب سے اونچا عمل ہے۔ ام الحسنات ہے۔ دین کی دعوت دینے سے جو نور انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اس کی شعاعیں دوسروں پر پڑتی ہیں۔ اس سے کئی دل منور ہوتے ہیں۔ جیسے کہ روشنی سے سارا جہاں منور ہوتا ہے۔[3]

ایک اور موقع پر مولانا محمد الیاس نے فرمایا :

''اس امت نے دعوت کو چھوڑ کر دعا کی قوت کو کھو دیا۔ دعوت کے ساتھ داعی کی دعائیں اللہ پاک ایسے قبول کرتے ہیں جیسے بنی اسرائیل کے انبیاء کی دعائیں قبول ہوئیں۔[4]

---

[1] اصلاحی، امین احسن، مولانا، دعورت دین اور اس کا طریقہ کار، ص ۳۲، ۳۱

[2] زیدان، عبدالکریم، ڈاکٹر، اصول دعوت دین، ص ۱۹۸۔۱۹۹

[3] محمد زکریا، مولانا، دعوت کے فضائل، ص ۴۔۵

[4] ۔ایضاً، ص ۵

داعیان دین کو دعوت کے راستے میں استقامت کے ساتھ کام کرنے کی ترغیب دلاتے ہوئے محمد سرور بن نائف زین العابدین لکھتے ہیں :

''حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سخت موقف پر تو کوئی تعجب نہیں، تعجب تو حضرت ہاجرہ کی اس بات سے ہے کہ ''وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا'' ایک عورت ذات ہے، بے آب و گیاہ چٹیل میدان ہے، رہنے سہنے کے لیے کوئی گھر نہیں، میل جول کے لیے لوگ نہیں، پانی کا کوئی چشمہ نہیں کہ خود پی سکے اور اپنے بچے کو پلا سکے اور رزق کا کوئی ذریعہ نہیں مگر جب اس خاتون کو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دیا ہے تو انہیں اطمینان ہو گیا اور جنگل کے درندوں اور خونخوار جانوروں کا خوف دل سے نکل گیا، کیونکہ ان کا ایمان تھا کہ جس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ اٹھالیں اسے کوئی موذی جانور تکلیف نہیں دے سکتا۔ آہ کس قدر شدید ضرورت ہے اس بات کی کہ ہمارے دعاۃ و علماء کا ایمان بھی حضرت ہاجرہ کے ایمان کی طرح مضبوط ہو اور وہ حضرت ہاجرہ کی طرح سراپا انقیاد و اطاعت بن جائیں۔''[1]

دعوت کا عمل ایک ایسا عمل ہے جو نیکیوں میں حد درجہ اضافہ کرتا ہے۔ خرم مراد لکھتے ہیں :

ایک آدمی بھی تمہاری وجہ سے نیکی کرنے لگے، اس سے بڑا صدقۂ جاریہ اور کوئی نہیں ہو سکتا اور اگر وہ خود ہی نہ کرے، بلکہ اس کا داعی بھی بن جائے، دوسروں کو بھی اس کام میں لگائے تو پھر اس ثواب جاریہ میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔ یہ نیک کام اگر دعوت کا کام ہو، اقامت دین کی جدوجہد کا کام ہو، اعلائے کلمۃ اللہ کا کام ہو، اجرائے حدود الٰہی اور احیائے سنن نبوی ﷺ کا کام ہو، تو پھر اضعافاً مضاعفۃً والا حال ہو گا اور اس کے علاوہ لدینا مزید کی بشارت بھی پوری ہو گی۔[2]

دعوت کے کام کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے معروف داعی خرم مراد مرحوم نے اپنے وصیت نامہ کے آغاز میں اس امید کا اظہار کیا ہے کہ اللہ کی راہ میں کام کرتے ہوئے موت آجانے پر بھی کسی درجہ کی شہادت کا اجر مل سکتا ہے اور مغفرت ہو سکتی ہے۔

میری تو اب دعا یہی ہے کہ اگر شہادت نصیب میں نہ ہو تو کم سے کم موت اس کا (اللہ تعالیٰ کا) کام کرتے ہوئے آئے۔ شاید یہ آن ڈیوٹی (On Duty) موت بھی کسی درجہ میں شہادت میں شمار ہو جائے۔ قتل کے ساتھ الگ سے موت کے ذکر کے کچھ معنی تو ہیں : وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا

---

[1] محمد سرور زین العابدین، منہج الانبیاء فی الدعوۃ الی اللہ، ص ۲۳۷

[2] خرم مراد، آخری وصیت، ص ۴۲

یَجْمَعُونَ[1] (اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمہارے حصے میں آئے گی وہ ان ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے۔ جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔)[2]
اللہ تعالیٰ نے دعوت دین کی اس اہم ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے رسول اللہ ﷺ کو اس لیے مبعوث فرمایا اور اس امت محمدیہ کو اس لیے کھڑا کیا ہے کہ اللہ تعالی کے مقرر کردہ قانون جزا و سزا کا تقاضا ہے کہ پہلے حجت تمام کر دی جائے اور پھر باز پرس کی جائے۔ بقول سید ابو لاعلی مودودی
''اس کی حکمت و رحمت اور اس کے انصاف سے یہ بعید ہے کہ لوگوں کو اس کی مرضی نہ معلوم ہو اور وہ انہیں اس بات پر پکڑے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف چلے۔۔۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آفرینش کی ابتداء ہی ایک پیغمبر سے کی۔[3]
باز پرس کا سارا نظام، حق کی گواہی پر ہے اور حق کی گواہی کے لیے ہی اس امت کو برپا کیا گیا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر محمود احمد غازی دعوت و تبلیغ کو مسلمان قوم کے اجتماعی فرائض میں سر فہرست قرار دیتے ہیں :
''قرآن پاک نے امت مسلمہ کے انفرادی اور اجتماعی فرائض میں جس فریضہ کو بہت زیادہ اہمیت اور تاکید کے ساتھ بار بار بیان کیا ہے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دوگونہ فریضہ ہے۔۔۔ یہ فریضہ امت مسلمہ کے اجتماعی فرائض میں سر فہرست ہے۔[4]
کار دعوت امت کا ایک ایسا فریضہ ہے جس سے غفلت مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا سبب ہے۔ فضائل اعمال میں مولانا محمد زکریا لکھتے ہیں :
اس وقت مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے ہر طرف گیت گائے جا رہے ہیں۔۔۔ نئے نئے طریقے ان کی اصلاح کے واسطے تجویز کیے جا رہے ہیں مگر کسی روشن خیال (تعلیم جدید کے شیدائی) کی تو کیا کسی تاریک خیال (مولوی صاحب) کی بھی نظر اس طرف نہیں جاتی کہ حقیقی طبیب اور شفیق مربی نے کیا مرض تشخیص فرمایا اور کیا علاج بتلایا ہے اور اس دعوت و تبلیغ کے کام پر کس درجہ عمل کیا جا رہا ہے۔[5]

---

[1] سورۃ آل عمران ۳: ۱۵۷
[2] ۔ایضاً، ص ۱۵
[3] مودودی، سید ابو الاعلی، شہادت حق، ص ۸
[4] غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، فریضہ دعوت و تبلیغ، دعوہ اکیڈیمی، اسلام آباد ص ۲
[5] محمد زکریا، مولانا، فضائل اعمال ص ۲۰۸

دعوت دین کا کام خود مسلمانوں کی اصلاح کے لیے بھی ضروری ہے اور غیر مسلموں کو اسلام کی طرف بلانا بھی اسی پر منحصر ہے : بقول مولانا سید سلیمان ندوی :

حکیمانہ دعوت و تبلیغ ،امر بالمعروف ،نہی عن المنکر اسلام کے جسم کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔اس پر اسلام کی بنیاد ،اسلام کی قوت ،اسلام کی وسعت اور اسلام کی کامیابی منحصر ہے اور آج سب زمانوں سے بڑھ کر اس کام کی ضرورت ہے اور غیر مسلموں کو مسلمان بنانے سے زیادہ اہم کام مسلمانوں کو مسلمان ،نام کے مسلمانوں کو کام کا مسلمان اور قومی مسلمانوں کو دینی مسلمان بنانا ہے۔[1]

یہ مسلمانوں کی دعوت و تبلیغ ہی کی کاوشیں ہیں جن کی بدولت آج اسلام دنیا کے کونے کونے میں نظر آتا ہے اور آئندہ بھی اس کے استحکام اور شوکت کا ذریعہ دعوت و تبلیغ کا کام ہی بن سکتا ہے۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی کے بقول :

آج اسلام کی وہ فتوحات جنہیں شمشیری فتوحات کہا جا سکتا ہے دنیا سے مٹ چکی ہیں۔اسپین فنا ہو چکا ہے ،صقلیہ مٹ گیا ،یونان تباہ ہو گیا۔مگر وسط افریقہ ،جاوا ،سماٹرا اور جزائر ملایا ،جنہیں اس نے تبلیغ کے ہتھیار سے فتح کیا ہے بدستور موجود ہیں اور اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ اسلام کی زندگی تبلیغ اور صرف تبلیغ پر منحصر ہے۔[2]

5۔ تبلیغ دین کے عقلی دلائل

قرآن و سنت اور علماء امت کی آراء کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کی اہمیت واضح ہو چکی ہے تاہم کار دعوت کی عظمت یہ ہے کچھ ایسے پہلو اور بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کا کام کرنا نہایت ضروری ہے۔

۱۔ اسلام ایک تبلیغی دین ہے اور تبلیغی مذہب وہ ہے جس میں سچائی کا پھیلانا اور غیر مذاہب والوں کو اپنے مذہب میں لانا ایک مقدس مذہبی فریضہ قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ دعوت و تبلیغ کی اہمیت ،ہر دور ،ہر معاشرہ اور ہر سطح پر اس لیے بھی بہت ضروری ہے کہ :

اُمت مسلمہ کی بنیاد۔۔۔ایک نظریہ اور ایک پیغام پر ہے۔۔۔جن اُمتوں کی اساس کسی نظریہ پر ہوتی ہے ان کو اپنی بقاء اور تحفظ کے لیے بڑی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔۔۔یہی وجہ ہے کہ اُمت مسلمہ کی بقاء اور تسلسل کو یقینی بنانے کے

---

[1] ندوی، سید سلیمان ،اسلام کا نظامِ دعوت و تبلیغ، ص ۲۰

[2] جلوۂ نور، ص ۱۳۔اداریوں کا مجموعہ طبع سہ روزہ الجمیعۃ (مقالہ مسلمانوں کا ذوق تبلیغ، سید مودودی) ۱۸ جولائی تا ۱۸ اگست، ۱۹۲۵

لیے اسلام نے دعوت وارشاد کو ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا ہے۔[1]

۳۔ ہر مسلمان انسانی برادری کا حصہ ہے اور پوری برادری کی بھلائی چاہتا ہے اور چونکہ اللہ کی رضااور اس کی جنت تک لے جانے والا راستہ صرف اسلام ہے لہٰذا خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ اہل اسلام تمام لوگوں تک اللہ کا دین پہنچائیں:

Allah who has shown this path is not the lord of any single group،country or nation alone. He is in fact the lord of mankind. Hence Muslims have no right to claim any monopoly over the religion and the message sent by Him for the benefit of humanity.[2]

۴۔ اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔اللہ تعالیٰ تمام عالمین کے رب ہیں۔اور کوئی اسے مانتا ہو یا اب تک کسی وجہ سے نہ مان سکا ہو'سب کا پالنہار'سب کا بادشاہ اور سب کا حقیقی معبود وہی اللہ ہے۔قرآن کریم تمام انسانوں کے لیے بھیجی جانے والی کتاب ہے۔اور اس میں پوری انسانیت کی ہدایت کا سامان ہے'اور نبی آخر الزمان ﷺ پوری انسانیت کے لے مبعوث فرمائے گئے۔اس حقیقت سے ان لوگوں کو روشناس کرانا جو اس سے آگاہ نہیں ہیں'ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو اللہ کی مہربانی اور توفیق سے اس سچائی کو پاگئے ہیں۔

(هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ)[3]

(اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔)

اس آیت مبارکہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک فرد یا گروہ کے مسلمان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ رسول کے ذمہ گواہی کا جو کام تھا اس فرد یا گروہ کی حد تک پورا ہو گیا اور کسی نہ کسی ذریعہ ہی سے پورا ہوا لہٰذا اب یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ جن لوگوں تک دین کا پیغام ابھی نہیں پہنچا'وہ ان لوگوں تک پیغام پہنچانے کا ذریعہ بنیں۔

۵۔ ختم نبوت پر ایمان کا تقاضا ہے کہ دین کی دعوت کا فریضہ سرانجام دیا جائے۔یہ معلوم ہے کہ ختم

---

[1] ۔دعوت الی اللہ ہر مسلمان کی ذمہ داری، ص ۳

[2] Towards Performing Da'wah، ص ۳۱۔۳۲

[3] ۔سورۃ الرعد ۱۳:۷

نبوت ٗانبیاء پر ایمان کا اور انبیاء پر ایمان ٗ مسلمان ہونے کی بنیادی شرائط کا حصہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کا جو انتظام فرمایا اس کے لیے وقفہ وقفہ سے انبیائے کرام کی بعثت کا سلسلہ جاری رہا اور ہر قوم کے لیے ھادی آیا۔ جب مجموعی انسانی شعور ارتقاء کی ایک خاص سطح پر پہنچ گیا تو اعلان الٰہی ہوا :

(مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ) [1]

(محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔)

قرآن و سنت میں اس کا اظہار متعدد مواقع پر کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد قیامت تک انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ اُمت مسلمہ کے سپرد ہے۔اسی لیے دور نبوی کے آخری مرحلہ میں حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے مسلمانوں کے عام اجتماع سے فرمایا کہ تم اس دعوت اور پیغام کو دوسروں تک پہنچاؤ۔

٦۔ موجودہ دور جسے اطلاعات و معلومات کا دور کہا جاتا ہے ٗ بد قسمتی سے اس دور میں اسلام ہی وہ دین ہے جس کو Most misunderstood religion کہا جاتا ہے اس لیے کہ مخالفین اسلام اپنے مذہبی تعصّبات ٗ معاشی مفادات اور سیاسی ترجیحات کی بناء پر اسلام اور مسلمانوں کی غلط تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔آج اسلام کو تشدد ٗ فرقہ پرستی ٗ انتہا پسندی ٗ تخریب کاری ٗ آمریت ٗ پسماندگی ٗ توہم پرستی اور رجعت پسندی کا مترادف بنا کر پیش کیا جاتا اور سمجھا جاتا ہے۔اسلام کو مسخ کر کے پیش کرنے میں جہاں اس کے مخالفین کی متعصّبانہ سوچ کا دخل ہے وہیں خود مسلمانوں کا دین کو اس کی اصل صورت میں پیش کرنے میں کوتاہی ٗ دعوت کے کام سے غفلت بلکہ خود اپنے عمل سے اسلام کے تاثر کو مجروح کرنا بھی شامل ہے۔اسلام کے ساتھ اس ظلم کی وجہ شاید مخالفین سے زیادہ خود ہمارا کردار و عمل ہے۔اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہم دین کی اصل شکل کو خود اختیار کریں اور صحیح دین کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔

٧۔ آج اس کائنات ارضی کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ امن ٗ سکون ٗ انصاف ٗ مساوات ٗ محبت ٗ رواداری ٗ اخلاقی بلندی اور معاشی استحکام کی تلاش میں سر گرداں اور پریشان ہے۔ان تمام مسائل کا حل اسلام پیش کرتا ہے۔جدید دنیا غربت ٗ جہالت ٗ بداخلاقی ٗ منشیات ٗ شراب کا استعمال ٗ زناکاری ٗ قتل و غارت ٗ ماحولیاتی آلودگی اور ایڈز کی بیماری جیسی لعنتوں کا شکار ہے اور ان سب مصائب و شدائد کا حل مسلمانوں کے پاس موجود ہے لیکن ہم نے اس پیغام دعوت یعنی قرآن حکیم جو کہ نسخہ کیمیا ہے کو یا تو بھلایا ہوا ہے یا محض تعویذ بنا کر اپنے پاس رکھ چھوڑا ہے۔اللہ رب العالمین

---

[1] ۔ سورۃ الاحزاب ۳۳ : ۴۰

کی بے شمار مخلوق اس نسخہ کیمیا سے محروم ہے اور ایسے ہی کسی نسخہ کی تلاش میں تڑپ رہی ہے لیکن ہم اس نسخہ پر نہ خود عمل کریں اور نہ اسے دوسروں تک پہنچائیں تو یہ خالق حقیقی کی مخلوق کے ساتھ صریح ظلم ہوگا۔

6۔ دعوت و تبلیغ کے اغراض و مقاصد

دین اسلام کے ہر حکم اور تعلیمات کے مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ دعوت و تبلیغ اس امت کی بنیادی ذمہ داری ہے اس لیے قرآن سنت کے مطالعہ کے بعد دعوت دین کے جو اغراض و مقاصد متعین ہوئے درج ذیل ہیں۔

6.1 بنیادی انسانی ضروریات کی تکمیل

انسان بنیادی طور پر دو ضروریات کا محتاج ہے۔ ایک مادی احتیاجات کی تکمیل اور دوسری ہدایت و رہنمائی جس کی روشنی میں اخلاقی ' اجتماعی اور تمدنی زندگی کی صحت مند بنیادوں پر تشکیل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کے باوصف ان دونوں ضروریات کی تکمیل کی۔ پہلی ضرورت کی تکمیل کے لئے انواع و اقسام کی نعمتیں عطا کیں اور وسائل معیشت فراہم کئے جب کہ دوسری ضرورت کی تکمیل کے لئے انبیاء مبعوث فرمائے اور بعثت انبیاء کا اصل مقصد یہ بتایا کہ وہ توحید ' رسالت اور آخرت کی بنیادوں پر اللہ اور بندے کا تعلق استوار کریں۔ الہامی ہدایت کی روشنی میں دین کی دعوت دیں۔ نیز اپنی بے لوث جدوجہد کے ذریعے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کریں۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے

(لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ)[1]

(اور بے شک ہم نے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان کو کتاب اور میزان عطا فرمائی تا کہ وہ لوگوں کے درمیان عدل قائم کریں)

کیونکہ اسلام محض پوجا پاٹ کا نظام نہیں ہے بلکہ زندہ اور متحرک تحریک فکر و عمل ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ہدایت الٰہی کا پابند بناتی ہے۔ اسلام ایک دعوت ہے۔ جو انسانوں کو خدا کے دین کی طرف بلاتی ہے اور ان کی زندگیوں کو نور الٰہی سے منور کرتی ہے۔ اسلام ایک مکمل دین اور مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کی تمام وسعتوں پر حاکمیت الٰہی قائم کرنے کا دعویدار ہے۔ انبیاء وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جو دعوت کے داعی اور اس تحریک کے قائد ہیں اور جن کی رہنمائی میں یہ دعوت اور اصلاحی جدوجہد برپا ہوئی ہے۔ آنحضورﷺ اس سلسلہ کی آخری کڑی ہیں۔ آپﷺ کی حیاۃ طیبہ اعلیٰ مقاصد کی طرف دعوت کی عملی صورت ہے۔ آپﷺ کے بعد یہ

[1] سورۃ الحدید ۵۷: ۲۵

اہم کام امت کے سپرد ہے۔ ہر داعی کا مقصد دعوت اس بنیادی انسانی تقاضے کی تکمیل ہے۔

6.2 رضائے الٰہی

قرآن مجید میں انسان کا مقصدِ تخلیق ہی عبادت بتایا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے

(قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ)[1]

(کہہ دیجئے میری نماز میری قربانی میری زندگی میری موت اللہ رب العالمین کے لئے ہے)

یعنی ایک داعی کی زندگی ابتداء سے انتہا تک خدا کی رضا کے تابع ہو جائے اور عبد کا کام یہ ہے اللہ تعالی کے پیغام کا خود بھی علمبردار ہو اور پوری انسانیت تک اس پیغام کو پہنچائے۔

6.3 نصرت دین

داعی کے لئے اعزاز کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی دعوت دینے والوں کو اپنا مددگار کہتا ہے۔ یہ روحانی ارتقاء کا بلند مقام ہے۔ اس اعزاز کا حصول داعی کا مقصد ہونا چاہیے۔ اسی مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو مخاطب فرمایا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

(قَالَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ)[2]

(حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ کے راستے میں کون میرا مددگار ہے۔ حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں اور آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلمان ہیں)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں کہ :

"اللہ کی مدد سے مراد ہے اللہ کے رسول کی مدد اور اس کے دین کی تائید و حمایت ہے جس کی دعوت لے کر رسول اٹھتا ہے اور اللہ نے ہر قسم کی مدد سے بے نیاز ہونے کے باوجود اس کو اپنی امداد سے تعبیر فرمایا کہ یہ کام اللہ کو پسند ہے اور اس سے بندوں کی فلاح و بہبود مقصود ہے۔"[3]

قرآن مجید داعی کی کیفیت کی تصویر کشی اس طرح کرتا ہے۔

(رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ)[1]

---

[1] سورۃ الانعام : ۱۶۲

[2] سورۃ آل عمران : ۵۲

[3] اصلاحی، امین احسن، مولانا، تدبر قرآن، ج ۲، ص ۱۰۱

(اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے)
یعنی یہ لوگ نصرت دین اور تائید حق کے بعد اس مقام پر آگئے ہیں کہ عبد نے اپنی رضا کو معبود کی رضا کے تابع کر دیا ہے۔ اسی طرح فرمایا:
(يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ)[2]
(اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ (کافروں کے مقابلے میں) تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا)
یعنی اہل ایمان اللہ کے دین کی مدد کے ذریعے در حقیقت دنیا میں اپنی فتح کا سامان کرتے ہیں۔
"اللہ نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ وہ اقامت دین، اس کی طرف دعوت اور اس کے دشمنوں کے خلاف جہاد کر کے اللہ کی مدد کریں اور اس ساری کاوش کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ ان کی مدد فرمائے گا اور صبر و استقامت اور استقلال کے ساتھ ان کے دلوں کو تقویت بخشے گا اور ان کے جسموں کو صبر سے نوازے گا اور نصرت و تائید اور ثابت قدمی کے اسباب ان کے لئے آسان کر دے گا۔"[3]

6.4 اتمام حجت

دعوت و تبلیغ کا ایک مقصد اللہ تعالی کی طرف سے بندوں پر حجت پوری کرنا ہے۔ کہ اللہ تعالی نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت حق کی جو ذمہ داری امت مسلمہ کے سپرد کی ہے اس کی تکمیل دعوت و تبلیغ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ قرآن مجید کو خود قرآن میں ہی فرقان، نور اور رحمت کہا گیا ہے۔ لیکن اس نور اور رحمت کا فائدہ انسانیت کو اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب داعی اس کو دوسروں تک پہنچا کر فریضہ تبلیغ سے سبکدوش ہو سکتا ہو۔ ارشاد الٰہی ہے:
(رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا)[4]
(اللہ نے رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا تاکہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لئے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور اللہ غالب اور حکیم ہے)
یعنی اگرچہ اللہ تعالی نے انسان کی فطرت میں نیکی و بدی کی پہچان اور تمیز رکھی ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا

---

[1] سورۃ المائدہ: ۱۱۹
[2] سورۃ محمد: ۷
[3] تفسیر السعدی، ص ۳۶۲، بحوالہ فضائل دعوت، ص ۸۳، ۸۲
[4] سورۃ النساء ۴: ۱۶۵

(فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۔ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا)[1]

(پس ہم نے اس کو اس کی نیکی اور برائی الہام کر دی پس اس نے فلاح پائی جس نے اس میں اچھائی کو نشو و نما دی اور وہ نامراد ہوا جس نے اس کو معصیت سے آلودہ کیے رکھا)

مگر اس فطری الہام و ہدایت کے باوجود پیغمبر بھیجنے کا مقصد اتمامِ حجت تھا تاکہ آخرت میں کوئی انسان یا قوم یہ نہ کہہ سکے کہ اس تک پیغام نہ پہنچا تھا۔ پیغمبر کے بعد پھر داعی پر اتمام حجت کی ذمہ داری آتی ہے اور اس سے بری الذمہ ہونے کا ذریعہ صرف تبلیغ ہے۔ بصورت دیگر یہ کتمانِ حق کا جرم ہوگا جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے

(وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً)[2]

(اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس نے شہادت کو چھپایا)

6.5۔ غلبہ اسلام

اللہ تعالیٰ نے بعثت نبوی کا ایک مقصد اظہار دین بیان فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

(هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ)[3]

(وہی ہے جس نے اپنے رسول کہ ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ ان مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے)

اظہار دین یعنی غلبہ دین کا پہلا مرحلہ افرادِ کار کی تیاری ہے۔ افرادِ کار دعوت کے ذریعے مہیا ہوتے ہیں۔ دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرنے کی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے امت مسلمہ کو منظّم کوششوں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا دعوت کے ذریعے افراد کو منظّم گروہ کی شکل میں ترتیب کیا جائے۔ انبیاء علیھم السلام نے اسی طریقے سے عوام کی تربیت کر کے انقلاب برپا کئے۔ اسی تبلیغ کے ذریعے عوام کی تربیت کر کے ہمہ گیر اسلامی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ جس کے ذریعے سے اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا۔

6.6۔ مقصد تخلیق کی تکمیل

دعوت کی غرض یہ بھی ہے کہ انسان جس مقصد کے لئے تخلیق کیا گیا ہے اس کو پورا کرے۔

---

[1] سورۃ الشّمس ۹۱: ۸-۱۰

[2] سورۃ البقرۃ ۲: ۱۴۰

[3] سورۃ التوبہ ۹: ۳۳

ارشاد ربانی ہے:

(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ)[1]

(اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری بندگی کریں)

انسان کا مقصدِ تخلیق اللہ تعالی کی بندگی ہے۔ اللہ تعالی کو انسانوں اور جنوں کی کوئی ضرورت نہیں البتہ انسان اس کے محتاج ہیں کہ وہ اس کی بندگی کا حق ادا کر کے سعادت و کمال کے مدارج طے کریں۔ انفرادی طور پر ہر انسان کا مقصد تخلیق اطاعت الٰہی ہے اور چونکہ دنیا دارالامتحان ہے اور اسی پر آخرت کے نقطہ نظر سے امتحان میں کامیابی کا انحصار ہے۔ مگر چونکہ شیطان کا دعویٰ موجود ہے کہ

(قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ)[2]

(اس نے کہا پس تیری عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا)

لہٰذا ایک جماعت فریضۂ تبلیغ ادا کر کے عوام کی درست راہنمائی کرے گی۔ اسی طرح بالواسطہ طور پر فریضۂ تبلیغ ادا کر کے اس مقصد کی تکمیل کر سکتی ہے۔

خود آزمائی

1۔ دعوت و تبلیغ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم بیان کریں۔
2۔ قرآن حکیم کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کی اہمیت بیان کریں۔
3۔ تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کی اہمیت اجاگر کریں۔
4۔ علماء امت کی نظر میں دعوت کی کیا اہمیت ہے؟ بیان کریں۔
5۔ دعوت و تبلیغ کی ضرورت و اہمیت پر عقلی دلائل دیں۔
6۔ دعوت و تبلیغ کے اغراض و مقاصد بیان کریں۔

مآخذ و مصادر

دور حاضر میں دعوت دین کی حکمت عملی	محمد شاہد
منہج دعوت نبوی	شوکت علی شوکانی

---

[1] سورۃ الذاریات ۵۱: ۵۶

[2] سورۃ صٓ ۳۸: ۸۲

یونٹ نمبر 2

داعی کے اوصاف

تالیف:

ڈاکٹر محمد سجاد

فہرست عنوانات

	صفحہ نمبر
یونٹ کا تعارف	34
یونٹ کے مقاصد	35
1۔ داعی کے ایمانی واخلاقی اوصاف	38
1.1۔ ایمان	39
1.2۔ اللہ سے مضبوط تعلق	40
1.3۔ اخلاص و تقویٰ	41
1.4۔ داعی کا حسن اخلاق اور اسوۃ حسنہ نمونہ تقلید	45
1.5۔ مسلمانوں کے بارے میں اچھا گمان	47
1.6۔ گناہگاروں کی پردہ پوشی	48
1.7۔ صبر وبردباری	49
1.8۔ عفوودرگزر	51
2۔ داعی کے داعیانہ اوصاف اور مدعو کا لحاظ	53
2.1۔ دعوت کے بارے میں علم اور گہرا فہم	53
2.2۔ قول وفعل میں مطابقت	54
2.3۔ استقامت	55
2.4۔ دعوت میں ترتیب کا لحاظ	55
2.5۔ مراتب کا احترام	59
2.6۔ تعاون اور خیر خواہی	60
2.7۔ تواضع، عاجزی اور معاشرت	61
2.8۔ داعی کے کلام کی خصوصیات	63
1۔ دعوت کی زبان	63

2۔کلام مبین 63
3۔ مختلف اسالیب کا استعمال 63
4۔جذبات و دلائل سے بھرپور کلام 64
5۔یک رنگی اور وحدت 64
6۔ ضد اور مخالفت سے پاک کلام 64
7۔ازالہ شبہات 64
2.9۔ مخاطب کی نفسیات کا لحاظ 66
1۔آسان سے مشکل کی طرف لانا 66
2۔ مخاطب میں حمیت ابھارنے والے انداز وافعال سے گریز 67
3۔مقام و منصب 68
4۔دعوت مدعو کی استعداد کے مطابق 68
5۔مخاطب کا میلان طبع 69
6۔مخاطب کی دلچسپی کا اظہار 69
7۔ تکرار اور طوالت سے گریز 70
8۔موقع و محل کا مناسب استعمال 71
9۔مخاطبین کی درجہ بندی 72
10۔دلائل بر حق ہونے کے باوجود اصرار سے پرہیز 73
خود آزمائی 73
ماخذ و مصادر 74

یونٹ کا تعارف

دین کی تبلیغ واشاعت اور اُس کی تعلیم و تعلم کے لیے داعی و معلم کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ داعی و معلم کے لیے سیرت و کردار کی درستی، بلند اخلاق بہت ضروری ہے. داعی عمدہ اسلوب اور طریق کار کے ساتھ دعوت دیں۔ داعیینِ اسلام اپنے اندر ایسے اوصاف و صفات پیدا کریں کہ جن کے ذریعے ان کی دعوت زیادہ سے زیادہ مؤثر ہو سکے۔ ایک مسلمان داعی کی دعوت صرف اور صرف ایک اللہ ہی کی طرف ہونی چاہیے۔ شرک و بدعات سے خود بھی بچے اور دوسروں کو بھی بچنے کی دعوت دے۔ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے خلوصِ دل سے دعوۃ کا کام سر انجام دے۔ داعی کو موقع و محل کی مناسبت سے اور مدعو کی نفسیات اور اس کے وقت کا خیال رکھتے ہوئے نہایت مناسب ترین الفاظ اور نہایت عمدہ لب ولہجہ میں بات کرنی چاہئے۔ بلاوجہ فتویٰ بازی سے اجتناب کرنا چاہیے۔ متعصّابہ اور تشدد آمیز رویہ نہیں اپنانا چاہئے۔ اگر کوئی بحث و مناظرے پر اتر آئے تو نرم اور میٹھے انداز میں بحث کی جانی چاہیے۔ اس بات کا یقین کر لینا چاہئے کہ وہ خود واقعی حق پر ہے۔ علما اور بزرگ مدعو کے مقام کا خیال رکھتے ہوئے ادب سے پیش آنا چاہئے۔ اپنی دعوت کے متعلق دلائل کا پوری طرح علم ہونا چاہئے۔ تاکہ مدعو کے تمام سوالات کا جواب دے سکے، قائل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ داعی کا عمل اس کی دعوت کے عین مطابق ہو۔ داعی کو استقامت اور صبر کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ اپنی دعوت کو دوسروں پر مسلط نہ کرے۔ آسانی اور خوشخبری کا انداز اپنائے۔ نئے مسلمان ہونے والوں کی مالی امداد بھی کرے۔ اپنے مدعو سے رابطہ میں رہے۔ تکبر سے اجتناب کرے۔ مدعو کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے۔ علمِ دین کو پہلے خود سیکھے پھر دعوت کا آغاز کرے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف خوبیوں، مختلف مزاج اور الگ الگ عقلوں سے نوازا ہے۔ کچھ انتہائی حساس اور لطیف مزاج ہیں، جو بات کو سنتے ہیں اور تسلیم کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ گہری سوچ کے مالک ہیں وہ منطقی استدلال اور ریاضی کے اُصولوں کو سامنے رکھتے ہیں۔ کچھ ترغیب کو پسند کرتے، کچھ خوف دلانے سے متأثر ہوتے ہیں، کچھ بھلا مانس اور خوش طبع ہیں، کچھ جدال پسند اور ضدّی ہیں، کچھ اپنے آپ کو عالم ظاہر کرتے ہیں، کچھ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں، کچھ طاقت ور اور کچھ کمزور ہیں۔ کچھ لوگوں کے وقتی حالات ہوتے ہیں جو انہیں بات کی تہہ تک پہنچنے سے مانع اور تسلیم کرنے سے رکاوٹ ہوتے ہیں، مثلاً وہ کسی ناگہانی مصیبت میں مبتلا یا کسی تباہ کن

خسارے سے دوچار ہوتے ہیں یا کسی خاص نفسیاتی کیفیت میں ہوتے ہیں۔ حکمت ودانائی کا تقاضا اور بات کہنے کا فائدہ تب ہے جب ان سب قسم کے مزاجوں کو ملحوظ رکھا جائے اور ہر قسم کے لوگوں سے ان کے حسبِ حال، دینِ حنیف کے دائرہ میں رہ کر گفتگو ہو۔

اس یونٹ میں داعی کے ایمانی واخلاقی اوصاف کے ساتھ ساتھ داعیانہ اوصاف اور مہارتوں پر بحث کی گئی ہے جس سے استفادہ حاصل کر کے وہ دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریاں احسن طریقے سے ادا کر سکتا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ دعوت و تبلیغ میں داعی کے کردار کی اہمیت جان سکیں۔

2۔ داعی کی ایمانی واخلاقی اوصاف سے روشناس ہو سکیں۔

3۔ داعی کی داعیانہ اوصاف اور مہارتوں سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

4۔ داعی کے کلام کی نمایاں خصوصیات جان سکیں۔

5۔ دعوت دین میں مخاطب کی نفسیات کا لحاظ کے اصول جان سکیں۔

دعوت کا کام دراصل انبیاء علیہم السلام کا کام ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسی علیہ السلام تک تمام انبیاء نے یہ فریضہ سرانجام دیا۔ سب سے آخر میں ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ تشریف لائے۔آپ ﷺ نے بھی دین اسلام کی دعوت کو لوگوں تک پہنچایا، اور دیگر انبیاء کی طرح اس فریضہ کو بہترین طریقہ سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ آپ ﷺ کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:

﴿مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا﴾ [1]

(لوگو محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ ﷺ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبین ہیں اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔)

آپ ﷺ نے فرمایا أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي [2] میں آخری نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

چونکہ آپ ﷺ اللہ تعالی کے آخری نبی ہیں۔آپ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا اس لئے اب دعوت کا فریضہ آپ ﷺ امت ہی کو ادا کرنا ہے۔ اگرچہ امت کا ہر فرد اپنی حیثیت کے مطابق اسلام کی دعوت کو آگے بڑھانے کا ذمہ دار ہے لیکن امت میں سے جو افراد اس فریضہ کی انجام دہی اپنے ذمہ لے لیں انہیں داعی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالی نے آخری نبی ﷺ کو داعی کے نام سے بھی نوازا ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا﴾ [3]

(اے نبی ہم نے تمہیں گواہی دینے والا، خوشخبری سنانے والا، خبردار کرنے والا، اللہ کے اذن سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ رسول اکرم ﷺ دین کی دعوت کے لئے سب سے پہلے داعی ہیں اور آپ ﷺ کی امت کے جو لوگ یہ کام کریں گے وہ آپ ﷺ کی سنت پر ہی عمل پیرا ہونے والے لوگ ہوں گے۔ یعنی اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو اپنے حکم سے اپنی طرف لوگوں کو بلانے کے لئے مامور کیا ہے۔ تاکہ لوگ اپنے رب کی بندگی

---

[1] سورۃ الاحزاب ۳۳: ۴۰

[2] البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین

[3] سورۃ الاحزاب ۳۳: ۴۵

کریں اور قرآن مجید نے اسی بات کو کئی مقامات پر بیان فرمایا ہے۔

﴿وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ﴾[1]

(اور اپنے رب کی طرف بلائیں بے شک آپ سیدھے راستے پر ہیں)

یعنی آنحضرت ﷺ کی حیثیت ہی اللہ کی طرف بلانے والے کی ہے سو وہ بلاتے رہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ سیدھے راستے پر ہیں۔ کیونکہ اللہ کی طرف بلانا ہی سیدھے راستے کی طرف بلانا ہے۔ اس لئے داعی ہی وہ ہے جو سیدھے راستے کی طرف بلائے۔ اسی طرح سورۃ الرعد میں ہے

﴿قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ مَآبِ﴾[2]

(آپ فرما دیجئے کہ مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ کہ میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے)

درج بالا آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر جو کہ داعی ہے وہ اپنی دعوت کا اعلان کر رہا ہے کہ اس کو کس چیز کا حکم ہے اور کس چیز کی اس نے دعوت دینی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس سے داعی کی پہچان بھی سامنے آتی ہے کہ داعی اسی چیز کی دعوت دیتا ہے جس پر وہ خود عامل ہوتا ہے۔

اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو تمام انسانوں کے لئے نمونہ بنا کر بھیجا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾[3]

(بے شک تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے۔)

ایک داعی کے لئے بھی آپ ﷺ کی داعیانہ صفات بہترین زادراہ ہیں۔ آپ ﷺ ہی کے بتائے گئے اخلاق و آداب کو اختیار کر کے آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسلام کی دعوت کو دنیا بھر پھیلایا۔ آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک داعی کے لئے درج ذیل اخلاق و آداب اور داعیانہ اوصاف بہت ہی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

---

① سورۃ الحج ۲۲: ٦٧

② سورۃ الرعد ۱۳: ۳٦

3- سورۃ الاحزاب ۳۳: ۲۱

1۔ داعی کے ایمانی واخلاقی اوصاف

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے داعی کے حوالے سے لکھا ہے:

"الداعی هو المکلف شرعا بالدعوت إلی الله "[1]

"داعی وہ شخص ہے جو شرعی طور پر اللہ کی طرف دعوت دینے کا مکلّف ہو"

داعی یا مبلغ کو دین اسلام میں عظیم مقام حاصل ہے۔ دعوت الی اللہ میں اس کی بات کو سب باتوں سے بہترین بات قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ﴾[2]

یعنی داعی کا مرتبہ یہ ہے کہ اس کی بات کو سب سے اچھی بات قرار دیا گیا ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے کہ اس آیت سے وہ شخص مراد ہے جس کا نفس ہدایت پر ہو اور محارم سے اجتناب کرتا ہو۔ داعی کے لئے اجر عظیم کا وعدہ ہے۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

فَوَاللَّهِ لَأَنْ يَهْدِيَ اللَّهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَكَ مِنْ أَنْ يَكُونَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ "[3]

(پس اللہ کی قسم ، اللہ تعالی تیرے کوششوں کی ایک فرد کو ہدایت عطا فرمادیں تو یہ تمھارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

اور ایک حدیث مبارکہ میں ارشاد نبوی ہے:

مَنْ دَلَّ عَلَى خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ."[4]

نیکی کی دعوت دینے والے کے لیے ویسا ہی اجر ہے جیسا نیکی کرنے والے کا۔ نیز یہ کہ داعی کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔

داعی کو فریضہ دعوت کی ادائیگی کے لئے چند بنیادی امور کا خیال کرنا ضروری ہے۔

---

① عبدالکریم زیدان، اصول الدعوۃ: ، ص ۳۰۶

② سورۃ فصلت ۳۳:۴۱

③ احمد بن حنبل۔، المسند رقم حدیث ۲۲۸۲۱

④ مسلم، الجامع الصحیح، ابواب الامارۃ، رقم ۳۵۰۹

بقول ڈاکٹر عبدالکریم زیدان
فریضہ دعوت کی ادائیگی سے قبل داعی میں چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

1.1۔ایمان

فریضہ دعوت کی ادائیگی اسی صورت میں ممکن ہے جب داعی کا خود دعوت پر پختہ ایمان ہو۔انبیاء کرامؑ جس حق کی طرف دعوت دیتے تھے سب سے پہلے وہ خود اس پر ایمان لاتے تھے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے

﴿آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ﴾[1]

(رسول اس پر ایمان لایا جو اس پر اس کے رب کی طرف سے نازل ہوا اور مومن بھی۔)

داعی کا اس بات پر پختہ ایمان ہو کہ ہدایت کا راستہ بس یہ ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔

﴿قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَى﴾[2]

(فرمادیجئے کہ ہدایت تو بس اللہ کی ہدایت ہے)۔

دعوت پر ایمان لانے کے مطلب ہے کہ داعی اس کے بعد ہر اس چیز سے کنارہ کش ہو جائے جو اس دعوت کے مخالف جاتی ہو خواہ اس میں داعی کا شخصی و قومی مفاد ہو۔انبیاء خود اس بات کا اعلان کرتے ہیں۔

﴿أَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ﴾[3]

(میں سب سے پہلا مومن ہوں)۔

انبیاء کے اپنے ایمان کے اس اعلان واظہار کا مقصد یہ ہے کہ داعی کے ایمان کا مشاہدہ کر کے لوگوں کو دعوت میں دلچسپی پیدا ہو گی۔ محض زبانی تقاریر سے دعوت کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔داعی کے ایمان کی پختگی اور مضبوطی کا یہ عالم ہو کہ ترغیب و ترھیب کی کوئی صورت اس کو متزلزل نہ کر سکے۔اور نہ لوگوں کا حق کا ساتھ چھوڑ جانا اس کے لئے کمزوری کا باعث ہو۔اس کے ایمان کے لوازم یہ ہیں کہ عبد و معبود میں محبت کا رشتہ مضبوطی سے قائم ہو۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے ایمان کی کیفیت یہ بتائی۔

---

① سورۃ البقرۃ ۲: ۲۸۵

② سورۃ البقرۃ ۲: ۱۲۰

③ سورۃ الاعراف ۷: ۱۴۳

﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾[1]

وہ (اللہ) ان سے محبت کرتا ہے اور وہ (اہلِ ایمان) اس (اللہ) سے محبت کرتے ہیں۔

اور اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ بندے کی مرضی خدا کی مرضی کے تابع ہو جائے۔ خوف صرف خدا کی نافرمانی کے برے انجام کا ہو اس کے سوا ہر قسم کا خوف ختم ہو جائے اور امید بھی صرف اللہ سے ہو۔

1.2۔ اللہ تعالیٰ سے مضبوط تعلق

ایمان کے بعد عمل کا درجہ ہے۔ داعی ہر معاملے میں خدا پر مکمل توکل کرے۔

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾[2]

(اور جو کوئی اللہ پر توکل کرے تو وہ اس کو کافی ہے)

اور داعی کا یہ تعلق باللہ اتنا مضبوط ہو کہ مصائب و تکلیف اور رکاوٹوں کی وجہ سے کم ہونے کی بجائے مزید بڑھے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

﴿الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾[3]

(ان سے لوگوں نے کہا کہ ان لوگوں نے تمہارے خلاف جمعیت اکٹھی کر رکھی ہے ان سے تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ اور وہ بولے کہ ہمیں اللہ کافی ہے۔ اور وہ کیا ہی اچھا کارساز ہے)

کٹھن حالات بھی داعی کو اپنے مشن اور مقصد سے ہٹانے کا باعث نہ بنیں۔ داعی اللہ کے بھروسے اور اس کے وعدوں پر یقین کی دولت سے مالا مال ہو۔ راہِ حق کی مشکلات کو وہ اپنے لئے اللہ تعالی کی طرف سے آزمائش سمجھے اور اس آزمائش میں سرخرو ہونے کو اپنی نجات قرار دے۔ سرخروئی کی صورت میں اللہ تعالی کی عطاء اور نصرت کا یقین اس کے دل میں پختگی سے قائم ہو۔

---

① سورۃ المائدہ ۵: ۵۴

② سورۃ الطلاق ۶۵: ۳

③ سورۃ آل عمران ۳: ۱۷۳

1.3۔ اخلاص و تقویٰ

دین کی دعوت کوئی عام دعوت نہیں ہے کہ انسان اس پر یقین رکھنے، اس کے ساتھ مخلص ہونے اور صدقِ دل سے اس پر عمل پیرا ہوئے بغیر اس پر گفتگو کرتا چلا جائے۔ اہل دعوت کے لیے تقویٰ اور اخلاص نیت اور صداقت پہلی اور لازمی شرط ہے۔ تاکہ داعی ان صفات کی بدولت اپنے مشن میں کامیاب بھی ہو اور اس کو اجر و ثواب بھی مل سکے۔ کیونکہ نیت کا خلوص عمل میں اس کی قبولیت کے لیے لازمی ہے اور دعوت ان عملوں میں سر فہرست ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ﴾[1]

(خبردار! اللہ کو صرف خالص دین چاہیے۔)

نیز فرمایا:

﴿قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ﴾[2]

(کہہ دو کہ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں مخلص ہو کر اللہ کی عبادت کروں۔)

داعی کے لیے تقویٰ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کے فصل کے لیے پانی اور جسم کے لیے روح۔ تقویٰ یہ ہے کہ انسان ظاہر و باطن سے اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل پیرا ہو۔ بالخصوص اپنی دعوت کے مطابق اپنی زندگی گزارے۔ اگر کوئی شخص اپنی دعوت کے مطابق عمل نہیں کرتا تو وہ اللہ کی توفیق سے محروم اور عمل کی قبولیت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾[3]

(اللہ تعالیٰ تو صرف اپنے متقی بندوں کے (عمل) قبول کرتا ہے۔)

اسی کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے بطور خاص اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو بھی تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

اور فرمایا:

---

[1] سورۃ الزمر ۳۹ : ۳

[2] سورۃ الزمر ۳۹ : ۱۱

[3] سورۃ المائدہ ۵ : ۲۷

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾[1]

(اے نبی! اللہ سے ڈرو کافروں اور منافقوں کی بات ہر گز نہ مانو، بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔)

گو یہ خطاب ساری امت کو ہے لیکن بطورِ خاص نام لے کر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا ہے۔

تقویٰ کے ذریعے ہی گفتار و کردار کی اصلاح کی ترقی ہوتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾[2]

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور بات درست کیا کرو، اس سے اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کی اصلاح کر دے گا اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ بہت بڑی کامیابی حاصل کرلے گا۔)

تقویٰ کے ذریعے اللہ تعالیٰ ''داعی'' کو حق و باطل میں امتیاز کا ملکہ عطاء فرماتے ہیں اس کے ذریعے دعوتی مشکلات آسان ہوتی ہیں اور گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾[3]

(اے ایمان والو! اگر تم تقویٰ اختیار کر لو، تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانیاں پیدا کر دے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں۔)

داعی کی دیگر صفات کے ساتھ ساتھ تقویٰ کا مدعوین پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ لوگوں کی فطرت ہے کہ وہ سچے آدمی کی بات مانتے ہیں اور جھوٹے سے نفرت کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے ہاں سچ اور جھوٹ کا معیار داعی کے عمل کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ داعی کی دعوت پر عمل کرنے سے لوگوں کو دعوت کے صحیح ہونے اور داعی کے سچا ہونے کا سبق ملتا ہے اور وہ لوگوں کے ہاں مقبول ہو جاتا ہے۔

---

[1] سورۃ الاحزاب ۳۳ : ۱

[2] الاحزاب ۳۳ : ۷۰، ۷۱

[3] سورۃ الانفال ۸ : ۲۹

جبکہ داعی کے بے عمل ہونے سے لوگوں کے دلوں میں دعوت کے غلط ہونے اور داعی کے جھوٹا ہونے کا خیال نظر آتا ہے۔اور یہ چیز ان کے دلوں میں نفرت اور حقارت پیدا کرتی ہے۔انبیاء علیہ السلام اس چیز کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ تمام انبیاء کا کردار قبل از اعلان نبوت مثالی ہوتا تھا۔ ہمارے نبی ﷺ کو کردار کی بنیاد پر ہی لوگ صادق الامین کے لقب سے پکارتے تھے۔اور اپنی امانتیں بھی آپ ﷺ کے پاس رکھتے تھے۔آپ نے اس ذمہ داری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے ہجرت کی مشکل رات کو بھی اپنے بستر پر حضرت علی علیہ السلام کو سلایا اور کہا کہ صبح لوگوں کی امانتیں واپس کر کے ہمارے پیچھے آجانا۔

داعی کے شخصی کردار کی تاثیر دعوت میں ایسے ہی اثرات رکھتی ہے جیسے جسم میں روح۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ ٱللَّهِ أَن تَقُولُوا۟ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾[1]

(اے ایمان والو! تم وہ بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں ہو۔اللہ کے لیے یہ بات زیادہ ناراضگی والی ہے کہ تم ایسی بات کہو اور خود نہ کرو۔)

داعی کی نیت اگر صحیح اور خالص ہو،اور اس کا مقصود رضائے الٰہی کا حصول ہو تو وہ عند اللہ نہ صرف اجر و ثواب کا مستحق ہوگا بلکہ اس کی بات میں اثر بھی زیادہ ہوگا۔لوگ نہ صرف اس کی بات کو زیادہ توجہ سے سنیں گے بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہوں گے۔

امام ترمذی نے ایک تابعی کا واقعہ بیان کیا ہے کہ وہ حضرت ابوہریرہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، میں آپؓ کو حق کا واسطہ دے کر عرض کرتا ہوں کہ آپ مجھے ایسی کوئی حدیث سنائیں جو آپؓ نے رسول اللہ ﷺ سے براہ راست سنی اور سمجھی ہو اور آپؓ کو اچھی طرح یاد ہو۔ ابوہریرہؓ نے فرمایا ہاں میں سناؤں گا، میں ایسی ہی حدیث سناؤں گا جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے سنائی اور میں نے اسے سمجھا اور یاد کیا، پھر اچانک ان کی حالت غیر ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد حواس بحال ہوئے تو فرمایا: میں آپ کو ضرور وہ حدیث سناؤں گا جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس گھر میں سنائی تھی، اس وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس میرے سوا کوئی نہ تھا۔اتنا کہتے ہی پھر حالت غیر ہوگئی، جب افاقہ ہوا تو چہرے سے پسینہ پونچھنے لگے۔ پھر فرمایا: ہاں، میں آپ کو ضرور وہ حدیث سناؤں گا، جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے سنائی تھی، جب کہ میں اس گھر میں

---

[1] سورۃ الصف ۶۱: ۲، ۳

رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھا، میرے سوا آپ کے ساتھ اور کوئی نہ تھا۔اس کے بعد پھر ابو ھریرہؓ کی حالت خراب ہو گئی اور آپؓ چہرے کے بل جھک گئے، میں نے بہت دیر تک آپؓ کو سہارا دیئے رکھا۔آپ کی حالت سنبھلی تو پھر آپؓ نے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جب قیامت کا دن ہو گا اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے زمین پر تشریف فرما ہوں گے۔ہر جماعت گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی ہو گی۔سب سے پہلے اللہ تعالیٰ جن اشخاص کو بلائیں گے ان میں سے ایک وہ آدمی ہو گا جس نے قرآن مجید یاد کیا ہو گا، اور ایک وہ آدمی ہو گا جو اللہ کی راہ میں جنگ کرتا رہا ہو گا اور ایک بہت مال دار آدمی ہو گا اللہ تعالیٰ قرآن کے عالم سے فرمائے گا کیا میں نے تجھے وہ کتاب نہیں سکھائی تھی جو میں نے اپنے رسول پر نازل کی تھی؟ وہ کہے گا! جی ہاں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا پھر تو نے اپنے علم پر کیسے عمل کیا؟ وہ کہے گا میں رات دن اس میں مشغول رہتا تھا۔اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جھوٹ کہا اور فرشتے اسے کہیں گے: تو نے جھوٹ کہا۔اللہ تعالیٰ فرمائے گا تیری نیت تو یہی تھی کہ کہا جائے فلاں آدمی بڑا قاری اور عالم ہے، وہ دنیا میں کہا جا چکا۔اسی طرح صاحبِ ثروت شخص کو حاضر کیا جائے گا اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کیا میں نے تجھے مالی آسودگی نہیں بخشی تھی، حتیٰ کہ میں نے تجھے کسی کا محتاج نہ رہنے دیا؟ وہ کہے گا! جی ہاں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا پھر تو نے میرے دیئے مال کا کیا کیا؟ وہ کہے گا میں رشتہ داروں پر احسان کرتا تھا اور سب ضرورت مندوں پر صدقہ کرتا تھا۔اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے فرشتے بھی کہیں گے تو جھوٹا ہے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو یہ چاہتا تھا کہ لوگ کہیں کہ فلاں بہت سخی ہے وہ دنیا میں کہا جا چکا۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہونے والے کو حاضر کیا جائے گا۔اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا تجھے کس لیے قتل کیا گیا؟ وہ کہے گا مجھے تیری راہ میں جہاد کا حکم ملا، تو میں جنگ کرتا رہا حتیٰ کہ مجھے قتل کر دیا گیا۔اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے۔فرشتے بھی کہیں گے تو جھوٹا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا بلکہ تیری خواہش صرف یہ تھی کہ کہا جائے فلاں بہت بہادر ہے وہ دنیا میں کہا جا چکا۔" اس کے بعد رسول اللہ نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مار کر فرمایا:
ابوہریرہؓ یہ تین شخص ہیں جو قیامت کے دن تمام مخلوقات میں سب سے پہلے جہنم میں جھونکے جائیں گے"۔[1]

اگر مخاطب کو یقین ہو کہ داعی سچا ہے اور اس کی دعوت حق ہے اور دعوت کے پیش کرنے میں اس کے پیشِ نظر کوئی دنیوی مفاد بھی نہیں ہے تو اس کی دعوت کا اثر بڑھ جاتا ہے۔صحابہ کرامؓ کی دعوت کی کامیابی کی بڑی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ

---

[1] جامع الترمذی، کتاب الزھد، ماجاء فی الریاء والسمعۃ،

پورے خلوص کے ساتھ اپنی دعوت کو مخاطب کے سامنے پیش کرتے تھے اور یہ خلوص ان کے قول و فعل اور عمل سے پوری طرح ظاہر ہو رہا ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے مخاطبین دعوت ان کی دعوت کے سحر میں پوری طرح مبتلا ہو جاتے تھے، چونکہ صحابہ کرامؓ کے پیشِ نظر کوئی دنیوی مفاد نہ تھا بلکہ ان کی دعوت انبیاء کرام علیہم السلام کے اس قول

﴿وَمَآ أَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ أَجۡرٍۖ إِنۡ أَجۡرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ﴾[1]

(اور میں تم سے اس (تبلیغِ حق) پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا اجر تو فقط تمام جہانوں کے رب کے ذمہ ہے)

کا منظر پیش کر رہی ہوتی تھی اس وجہ سے لوگ ان کی طرف کھچے چلے آتے تھے۔

1.4۔ داعی کا حسن اخلاق اور اسوۂ حسنہ نمونہ تقلید

منہج دعوت میں کوئی بھی ایسی خوبی نہیں جو حسن اخلاق سے بڑھ کر ہو اور حسن معاشرت سے بہتر کوئی طریقہ نہیں جس سے لوگوں کو گرویدہ کیا جائے۔ اچھے اخلاق کو پسند کرنا انسانی فطرت ہے۔ خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح بد اخلاقی کو ناپسند کرنا اور بد اخلاق سے دور رہنا بھی انسانی مزاج میں شامل ہے۔ خواہ وہ کتنا بڑا شخص ہی کیوں نہ ہو۔

ارشادِ گرامی ہے:

﴿وَلَوۡ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ ٱلۡقَلۡبِ لَٱنفَضُّواْ مِنۡ حَوۡلِكَ﴾[2]

(اگر تم تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ سے بھاگ جاتے۔)

حسنِ اخلاق انسان کا تاج اور معنوی حسن ہے۔ خوش اخلاق داعی لوگوں کو اپنی خوش مزاجی سے اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو خوش اخلاقی سے کفر اور باطل کی دعوت بھی مقبول بنا لیتے ہیں اور بعض اوقات صحیح دعوت کو صرف داعی کی بد اخلاقی کی بنیاد پر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ حسن اخلاق کے بغیر کوئی بھی قوم اور نہ ہی کوئی معاشرہ ترقی کر سکتا ہے۔ اگر عقیدہ اور ارکانِ اسلام معاشرے کی تعمیر اینٹوں کی حیثیت رکھتے ہیں تو اخلاق اس کا سیمنٹ ہے۔

آپ ﷺ فرماتے ہیں:

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ

''مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔''

---

[1] سورۃ الشعراء ۲۶: ۱۲۷

[2] سورۃ آل عمران ۳: ۱۵۹

حُسن اخلاق کا انسانی زندگی پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے، انسانی زندگی کا کوئی موڑ ایسا نہیں جہاں حسن اخلاق کی ضرورت نہ ہو، لیکن بالخصوص دعوت میں اس کی ضرورت اہمیت کا انکار ہر گز نہیں کیا جا سکتا۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں حسن اخلاق کی بدولت ہی آج تک روشنی بکھیر رہی ہیں، تاریخ ان کے حسن اخلاق کے سنہرے واقعات سے بھری پڑی ہے جنھیں پڑھ کر دلوں کو سرور ملتا ہے یہ قیامت تک کے لیے ہر داعی کے لیے اسوۂ اور نمونہ ہیں، قرآن مجید میں اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾[1]

(بے شک آپ ایک اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔)

اس کی آیت کی دو طرح سے تفسیر ہو سکتی ہے ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی عظیم اخلاق سے موصوف ہے۔ دوسری تفسیر یہ کہ آنحضرت جس شریعت، منہج، معاملات روّیے پر گامزن تھے وہ خلق عظیم تھا۔ حضرت ابن عباسؓ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کو ایک عظمت والا دین ملا۔ مجاہد، ربیع، ابو مالک، ضحاک اور ابن زید، ان تمام حضرات نے بھی اس کی یہی تفسیر کی ہے۔[2] نیز ارشاد فرمایا:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾[3]

(معاف کر دیا کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو اور جاہلوں سے بچتے رہو۔)

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بہترین اخلاق کے مالک تھے:

''آپ کا اخلاق قرآن مجید کا آئینہ دار تھا۔''[4]

حضرت ابو درداء فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلُ فِي مِيزَانِ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ وَإِنَّ اللهَ لَيُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيءَ)[1]

---

[1] سورۃ القلم ۶۸: ۴

[2] ابن کثیر، اسماعیل بن عمرو بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، دار المعرفہ، بیروت، ط ثانی، ج ۴، ص ۴۲۹

[3] سورۃ الاعراف ۷: ۱۹۹

[4] ابن حنبل، المسند، ج ۶، ص: ۹۱

"قیامت کے دن آدمی ترازو میں حسن اخلاق سے بڑھ کر وزنی اور کوئی عمل نہیں ہوگا، اور بے شک اللہ تعالیٰ فحش گو اور بد زبان آدمی کو ناپسند کرتا ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا)[2]

"مومنوں میں سے اکمل ایمان والا وہ آدمی ہے جس کا اخلاق اچھا ہو۔"

داعی کو عمدہ اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے تاکہ یہ عوام الناس میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے ورنہ بے دین لوگ داعی پر مختلف قسم کے الزام عائد کر کے دعوت کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں حسد کی وجہ سے پراپیگنڈہ کرتے ہیں اور ان کے اس مرض کا علاج حسن اخلاق ہے اور جہلاء سے اجتناب ہے۔ نیز فرمایا:

﴿وَاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾[3]

(جب جہلاء سے واسطہ پڑ جائے تو سلام کر کے جان چھڑا لیا کرو۔" ان سے زیادہ بحث و مباحثہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

1.5۔ مسلمانوں کے بارے میں اچھا گمان

کسی بھی داعی کے لئے عام مسلمانوں کے بارے میں اچھا گمان رکھنا بہت ضروری ہے۔ اگر داعی میں یہ صفت مفقود ہو تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پوری جماعت انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ سیرت طیبہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو اپنے ساتھیوں پر مکمل اعتماد تھا اور آپ ﷺ ان سب کے بارے میں اچھا گمان رکھتے تھے اور ان کی ظاہری حالت ہی کو دیکھ کر ان کے بارے میں کوئی حکم لگاتے تھے اور ان کی خفیہ معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد فرمادیتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات میں بھی اسی کی تلقین فرمائی۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ[4]

---

1 الترمذی، سنن ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی حسن الخلق، رقم الحدیث: ۲۰۰۲

2 الترمذی، ابواب الرضاع باب ماجاء فی حق المرأۃ علی زوجھا۔۔۔ رقم الحدیث: ۱۱۶۲

3 سورۃ الفرقان ۲۵: ۶۳

4 سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الظن

بدگمانی سے بچو بے شک بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔

حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَةِ[1]

اچھا گمان رکھنا اچھی عبادت میں سے ہے۔

مسلمانوں کے اکثر دعاۃ آج پس میں بدگمانی کا شکار ہیں۔ اور اسی بدگمانی کی وجہ سے وہ آپس میں ایک دوسرے سے باہم دست و گریباں ہیں۔ عالمی سطح پر ان کی ہیبت اور رعب ختم ہو چکا ہے۔ اگر سیرت طیبہ کے اس پہلو سے استفاذہ کر کے آپس کے حسن ظن کو بحال کر دیا جائے تو شاید اللہ تعالی پھر سے ہماری عظمت رفتہ کو بحال کر دے اور ہم پھر سے ایک ہو کر دشمن کی چالوں کو سمجھنے اور اس کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن پر آسکیں۔

1.6۔ گناہگاروں کی پردہ پوشی

انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اس دنیا میں کوئی بھی معصوم نہیں ہے۔ ہر کسی سے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کوتاہی یا غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ ان کوتاہیوں اور غلطیوں پر پردہ ڈال کر نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت کو نہایت مضبوط بنالیا تھا اور آپ ﷺ نے تعلیمات کے ذریعے امت مسلمہ کی یوں رہنمائی فرمائی

مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا ، سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ[2]

جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی تو اللہ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

کسی کی کوتاہی یا غلطی کو دوسروں کے سامنے بیان کرنے سے نہ صرف اسے شرمندگی ہوتی ہے بلکہ یہ چیز جماعت کے افراد کی کمزوریوں کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ جس قدر ممکن ہو داعی کو ساتھیوں کی پردہ پوشی کر کے دعوت کے کام کو آگے بڑھانا چاہئے اور اگر کسی کو کوتاہی یا غلطی پر متنبہ کرنا چاہئے نہ کہ سب کے سامنے۔ آپ ﷺ نے کبھی بھی اپنے کسی ساتھی کو دوسرے کے سامنے اس کی کوتاہی یا غلطی پر شرمندہ نہیں کیا بلکہ آپ ﷺ مجمع عام سے اس انداز میں خطاب فرماتے تھے کہ اس سے جس سے کوتاہی یا غلطی ہوئی ہوتی تھی، وہ بھی سمجھ جاتا تھا اور دوسرے بھی اس سے اپنی اصلاح کر لیتے تھے اس طرح کے کئی واقعات سیرت نبوی میں موجود ہیں جن سے داعی استفادہ کر سکتا ہے۔

---

1 سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی حسن الظن

2 سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب المواخاۃ

1.7۔ صبر و بردباری

جس طرح داعی کے لیے علم ضروری شرط ہے اسی طرح داعی میں صبر و تحمل بھی ضروری ہے۔ اگر بصیرت داعی کے لیے ضروری ہے جو اس کی دعوت کا نور ہے تو حلم و بردباری اس کی زادراہ ہے۔ زادراہ کے بغیر جس طرح سفر ممکن نہیں اسی طرح بردباری کے بغیر دعوت کا کام ممکن نہیں۔ اسی لیے اللہ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کو حکم ہوا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ......... وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ﴾[1]

(اے چادر لپیٹنے والے، اُٹھ اور لوگوں کو ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔۔۔۔ اور اپنے رب کے لیے صبر کر۔)

نبی ﷺ نے فرمایا:

وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ [2]

"کسی شخص کو صبر سے بہتر کوئی انعام نہیں ملا۔"

میدانِ دعوت میں صبر سے مراد یہ ہے کہ حالات جیسے بھی ہوں دعوت پر ثابت قدم رہا جائے اور اپنے مدعوین سے کسی بھی طرح برا سلوک نہ کیا جائے۔ صبر کا یہ بھی مطلب ہے کہ لوگوں سے انتقام نہ لیا جائے، تنگ آ کر اسے چھوڑا نہ جائے ناکامی دیکھ کر ناامید نہ ہو۔ ہر حال میں استقامت اختیار کرے۔ دعوت کی قبولیت میں اس کا بڑا عمل دخل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾[3]

(اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو تو یہ بہت بڑا کام ہے۔)

صبر کے بغیر جلد بازی سے دعوت کو نقصان پہنچتا ہے اور دعوت پسپا ہو جاتی ہے۔ اگر داعی ذاتی انتقام پر اتر آئے تو یہ دعوت کے لیے خطرناک ہے۔ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو ان الفاظ میں نصیحت فرمائی:

﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾[1]

---

[1] سورۃ المدثر ۷۴: ۱، ۲، ۳، ۷

[2] البخاری، کتاب الزکاۃ، باب الاستعفاف عن المسئلۃ، رقم: ۱۴۶۹

[3] سورۃ آل عمران ۳: ۱۸۶

"نیکی کا حکم کر اور برائی سے منع کر اور جو بھی تکلیف آئے اس پر صبر کر بے شک یہ ایک بہت بڑا کام ہے۔)

دعوت میں تمام انبیاء کی یہی سنت رہی ہے کسی نبی نے اپنی قوم سے انتقام نہیں لیا اور نہ ہی مادی طاقت کا استعمال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾[2]

(تم بھی اسی طرح صبر کرو جس طرح صاحب عزم نبیوں نے صبر کیا۔)

حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال اپنی قوم کی ایذارسانی پر صبر کیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ، حضرت ابراہیم، حضرت عیسیٰ، زکریا اور یحییٰ علیہ السلام نے صبر کیا۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تاریخ میں اس کی مثال ملنا محال ہے۔ صبر کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی دیر بعد سارا مکہ مسلمان ہو گیا۔

داعی مستقل مزاج ہونا چاہیے کہ وہ ہر حالت میں ثابت قدم رہے، اپنے مشن کی طرف گامزن رہے اور کسی لمحہ بھی سستی اور کاہلی کا شکار نہ ہو۔ ایک داعی اور قاضی میں فرق ہے۔ داعی کا کام یہ ہے کہ وہ اذیت پر صبر کرے اور قاضی کا کام یہ ہے کہ وہ فیصلہ سنائے۔ یہ دونوں مختلف کام ہیں نہ داعی کو قاضی بننا چاہیے اور نہ قاضی کو داعی ہونا چاہیے۔ صبر و بردباری داعی کے لیے بے پناہ فوائد مہیا کرتی ہے اور مدد کے دروازے کھولتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾[3]

(بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَأَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ))[4]

"کہ بے شک مدد صبر کے ساتھ ہے۔"

جو صبر کریں گے کامیاب ہوں گے، جو غصہ کریں گے ناکام ہوں گے شرمندہ ہوں گے اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند

---

[1] سورۃ لقمان ۳۱ : ۱۷

[2] سورۃ الاحقاف ۴۶ : ۳۵

[3] الانفال ۸ : ۴۶

[4] ابن حنبل، الامام احمد بن حنبل الشیبانی، المسند، ج ۱، ص ۳۰۷

کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ﴾

(اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔)

نیز فرمایا:

﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾[1]

(بے شک صبر کرنے والوں کو بغیر حساب کے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔)

نبی اکرم ﷺ کا فرمان اقدس ہے:

(وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ)[2]

''صبر روشنی ہے۔''

صبر و تحمل کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ داعی سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں اور لوگ جس سے محبت کرنے لگ جائیں اس کی دعوت پھیلتی ہے۔

1.8۔ عفو و درگزر

صبر، عفو و درگزر کا لازمی حصہ ہے اور حلم و بردباری چشم پوشی کا بنیادی تقاضا ہے لیکن ان دونوں خوبیوں کا الگ الگ اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ ان دونوں کا دعوت کے مقبول ہونے یا نہ ہونے میں بڑا عمل دخل ہے۔ میدانِ دعوت میں اذیت رسانی شروع سے ہی چلی آ رہی ہے۔ اذیت دینے والے سے دور رہنا یا اس سے انتقام لینا انسانی فطرت کا تقاضا ہے، اسی طرح انتقام پسند داعی کی دعوت کو مسترد کرنا اور اس سے نفرت کرنا بھی انسانی مزاج ہے۔ جب یہ صورتحال ہوتی ہے تو داعی کو نقصان ہوتا ہے مدعوین دور ہو جاتے ہیں اور دعوت کو نقصان ہوتا ہے اور دعوت رُک جاتی ہے۔ اور لوگوں کو راہ ہدایت نہیں ملتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے داعی کو مدعوین سے چشم پوشی اور عفو و درگزر کرنے کو کہا ہے تاکہ لوگوں کے دل و دماغ ہر قسم کی قدورت سے پاک ہوں اور دعوت کی طرف پوری طرح متوجہ ہوں اور اسے قبول کریں، اس کا

---

[1] سورۃ الزمر ۳۹: ۱۰

[2] مسلم۔ الجامع الصحیح، کتاب الایمان باب الطھور شطر الایمان

مقابلہ یا اس سے نفرت نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾[1]

(اور جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو بے شک یہ عزیمت کے اوصاف میں سے ہے۔)

اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کو عموماً اور اہل دعوت کو خصوصاً مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ﴾[2]

(در گزر کرو اور نظر انداز کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔)

داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ عفو و در گزر اور چشم پوشی سے مزین ہو۔ داعی کے دل میں اذیت دینے والے کے خلاف کوئی کینہ یا انتقام کا نظریہ نہ ہو۔ داعی معاف کرنے والا اور چشم پوشی کرنے والا ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾[3]

(اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت کرتا ہے جو غصہ کو پی جانے والے ہیں اور لوگوں سے در گزر کرنے والے ہیں۔)

نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

(وَمَا زَادَ اللَّهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا)[4]

"اللہ تعالیٰ معاف کرنے سے آدمی کی عزت میں اضافہ کرتا ہے۔"

آپ ﷺ سے پوچھا گیا ایمان کا اعلیٰ درجہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب دیا: "صبر کرنا اور معاف کرنا، چشم پوشی سے کام لینا۔" یہ دونوں خوبیاں مسلمان کی عظیم خوبیوں میں شمار ہوتی ہیں۔ عفو و در گزر سے داعی کو اطمینانِ قلب ملتا ہے۔ عفو و در گزر کرنے سے لوگ داعی سے محبت کرتے ہیں اور اس کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ جبکہ انتقام سے دور بھاگتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمارے اندر بھی ایسی ہی تاثیر پیدا کرے کہ جو انسانوں کی رشد و ہدایت کا ذریعہ بنے اور ہمارے لیے نجات کا سبب ہو۔

---

[1] سورۃ الشوریٰ ۴۲: ۴۳

[2] سورۃ البقرہ ۲: ۱۰۹

[3] ورۃ آل عمران ۳: ۱۳۴

[4] المسلم، کتاب البر والصلۃ، باب استحباب العفو والتواضع، رقم الحدیث: ۲۵۸۸

2۔ داعی کے داعیانہ اوصاف اور مدعو کا لحاظ

2.1۔ دعوت کے بارے میں علم اور گہرا فہم

کسی بھی داعی کو اپنی دعوت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ علم ہونا چاہئے۔ کیونکہ اہل علم ہی دعوت کے فریضے کو صحیح طور پر انجام دے سکتے ہیں۔ وہی اللہ کے رسول کے اصلی وارث ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾[1]

(اے نبی آپ کہہ دیجئے کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔)

داعی کے لیے یہ بات از حد ضروری ہے کہ وہ جس چیز کی دعوت دے رہا ہے اس کو پہلے خود اچھی طرح سمجھتا ہو۔ داعی کے لیے اس بات کو بطورِ اصول بیان کیا گیا ہے اور اس کی تعمیل کا حکم خود نبی اکرم ﷺ کو بھی دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾[2]

(کہہ دو کہ یہ میرا راستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں بصیرت کے ساتھ اور میرے ماننے والے بھی۔ اور اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔)

بصیرت ایک مخصوص ملکہ اور وصف ہے جو عام معلومات سے ہٹ کر اس میں دلیل، گہرا ادراک، فہم و فراست کے اضافی معنی شامل ہیں۔[3] امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: علم، نرمی اور صبر یہ تین چیزیں داعی کے لیے از حد ضروری ہیں۔ دعوت سے پہلے علم، دعوت دیتے وقت نرمی، اور اس کے بعد صبر۔[4]

علم کے بغیر دعوت دینے سے داعی میں انحراف آجاتا ہے اور بصیرت کے بغیر لغزش کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہزاروں لوگ آپ کے مشاہدے میں آئیں، جنہوں نے بغیر علم کے دعوت کا کام کیا اور آج وہ مختلف جرائم میں مبتلا ہیں۔ نماز روزے کی بھی ان کو فرصت نہیں ہے۔ بصیرت کے بغیر دعوت دینا گناہ ہے کیونکہ اس میں اللہ کے حکم کی مخالفت ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

---

[1] سورۃ الزمر ۳۹:۹۔

[2] سورۃ یوسف ۱۲: ۱۰۸

[3] ابن منظور، محمد بن مکرم بن منظور الافریقی، لسان العرب، حرف راء مادہ، بصر، ن

[4] ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیہ، المجموع فتاویٰ، ج ۱۱، ص ۳۹۷

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ﴾[1]

(ایسے لوگ جو بغیر علم کے اللہ کی ذات کے بارے میں بحث کرتے ہیں وہ تو شیطان سرکش کی پیروی کرتے ہیں۔)

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگ اپنی سطحی سوچ اور کم علمی کی وجہ سے حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں اور کتنا بڑا نقصان کر دیتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾[2]

(بہت سے ایسے لوگ ہیں جو بغیر علم کے انسانوں کو گمراہ کرتے ہیں صرف اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے۔)

اہل علم علماء کے فرائض میں یہ بات شامل ہونی چاہیے کہ وہ اپنے دروس میں "عالم" اور خود نما عالم میں فرق بیان کریں تاکہ گمراہ فرقوں اور گمراہ لوگوں سے لوگ بچ سکیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: "کچھ لوگ علم ابجد حفظ کرتے ہیں ان میں قرآن مجید بھی شامل ہے لیکن انھیں فہم وادراک نہیں ہوتا۔"[3]

داعی کے لیے تمام علوم سے بہرہ ور ہونا ضروری نہیں ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس کو اپنی دعوت کے بارے میں بصیرت ہو۔ بہت سے ایسے مبلغ جو اپنی دعوت کے بارے میں بصیرت رکھتے ہیں اپنے سے بڑے عالم سے بہتر ہوتے ہیں جو بصیرت سے محروم ہو۔ داعی کے علم سے مراد شریعت کا علم اور سماجی صورتحال سے واقفیت مراد ہے۔ اس کو توحید کی اقسام، ارکان ایمان، ارکان اسلام، کی مبادیات، سنت اور بدعت میں فرق، عبادات ان کی اقسام، فرض، نفل، سنت کا علم، معروف اور منکر حلال، حرام، مکروہ، جائز اور ناجائز کا ہونا ضروری ہے۔ داعی کا عالم مطلق ہونا شرط نہیں۔ عمومی حالات میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام ہر مسلمان پر حسب استطاعت ضروری ہے۔

2.2۔ قول و فعل میں مطابقت

کسی بھی داعی کی دعوت میں کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ اس کے قول و فعل میں تضاد کو دیکھ کر لوگ اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور اس کی دعوت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالی

---

1 سورۃ الحج ۲۲: ۳

2 سورۃ الانعام ٦: ۱۱۹

3 ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیہ، المجموع فتاویٰ، ج ۲۸، ص ۱۳۷

نے مسلمانوں کو اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ. كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ [1]

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ بات بڑی ناپسندیدہ ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں ہو۔)

آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے قول و فعل میں ہمیشہ مطابقت ہی پائی گئی۔ آپ ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ کے شدید ترین مخالفوں نے بھی نہ صرف آپ ﷺ کے قول و فعل میں مطابقت کی گواہی دی بلکہ اسے سراہا بھی اور آج آپ ﷺ کی بعثت پر چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی آپ ﷺ کے دشمنوں کو آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں قول و فعل میں تضاد نہ مل سکا۔

2.3۔ استقامت

ایک داعی کے لئے استقامت اتنی ہی ضروری ہے جتنی اس کی دعوت، اگر داعی اپنی دعوت پر استقامت کا ثبوت پیش نہیں کرے گا تو دوسرے اس سے سبق کیسے حاصل کریں گے۔ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ آپ ﷺ کی استقامت کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کو اپنی دعوت سے روکنے کے لئے کیسے کیسے حربے استعمال نہیں کئے مگر آپ ﷺ کی استقامت ہمیشہ ان کے آڑے آئی یہاں تک کہ آپ ﷺ کے صحابہ میں سے بھی وہ کسی کو اس کی استقامت کی وجہ سے دین حق سے ورغلانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت اسلام روز بروز پھیلتی چلی گئی ۔اس استقامت کے لئے آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات میں یہ ارشاد فرمایا:

قُلْ آمَنْتُ بِاللَّهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ [2]

کہو میں ایمان لایا، اللہ پر اور پھر اس پر استقامت دکھاؤ۔

2.4۔ دعوت میں ترتیب کا لحاظ

دعوت کا کام کثیر الجہات اور ہمہ گیر نوعیت کا ہے، لہٰذا کارِ دعوت کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ

---

[1] سورۃ الصّف ۶۱: ۳۔

[2] مسلم، کتاب الایمان، باب جامع خصائل الاِسلام

اس کو فطری رفتار سے آگے بڑھایا جائے۔ دعوت و تبلیغ کے لیے جہاں حکمت وتدبر کی ضرورت ہے وہاں ترتیبِ دعوت کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ ورنہ اصلاح کی بجائے بگاڑ اور انتشار کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید نے دعوت کی جو فطری ترتیب بیان کی ہے اس میں دعوت کا سب سے پہلا مخاطب تو خود انسان کی اپنی ذات ہے۔[1] اس کے بعد اس بھلائی اور خیر کے سب سے زیادہ حقدار اس کے بیوی بچے ہیں[2] اور اس کے بعد عزیز و اقارب اور بالآخر پوری دنیا دعوت کی مخاطب ہے۔[3] رسول اللہ ﷺ نے دعوتِ دین میں اس ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا اور صحابہ کرامؓ نے بھی اس اسلوبِ دعوت کی پیروی کی۔ صحابہ کرامؓ نے اپنی اصلاح کے بعد سب سے پہلے اپنے اہل خانہ اور عزیز و اقارب کے سامنے دعوت پیش کی اور اس کے بعد دوسرے لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا صحابہ کرامؓ کی زندگی سے اس اسلوبِ دعوت کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو قبیلہ غفار کی طرف مبلغ اور داعی بنا کر بھیجا تو آپؓ نے سب سے پہلے اپنے بھائی اُنَیس کو دعوتِ اسلام دی، انھوں نے اسلام قبول کیا تو دونوں بھائی والدہ کے پاس آئے ان کو مائل بہ اسلام کیا، وہ بھی مسلمان ہو گئیں تو اس کے بعد پورے قبیلے کو اسلام کی دعوت دی۔[4]

حضرت عبد اللہؓ بن سلام یہود کے سردار، تورات کے بہت بڑے عالم اور یہود کے ممتاز سرداروں میں سے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو انھوں نے فوراً خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ ابن ہشام نے انھیں کی زبانی ان کے قبول اسلام کا واقعہ پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دولتِ ایمان سے سرفراز ہونے کے بعد آپؓ نے سب سے پہلے اپنے گھر والوں کو اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے ان کی دعوت پر اسلام قبول کر لیا، آپؓ کی پھوپھی خالدہؓ بنت الحارث نے بھی ان ہی کی دعوت سے اسلام قبول کیا۔[5]

حضرت ابوہریرہؓ قبولِ اسلام کے بعد مسلسل اپنی والدہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ ایک روز ان کو اسلام کی ترغیب

---

[1] الصف، ۲:۶۱

[2] التحریم، ۶:۶۶

[3] الشعراء، ۲۱۴:۲۶

[4] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب من فضائل ابی ذرؓ،

[5] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ج ا ص ۵۷۵

دی توانھوں نے رسول اللہ ﷺ کو برا بھلا کہا۔ ابوہریرہؓ کو اس چیز کا بہت زیادہ دکھ ہوا چنانچہ روتے ہوئے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ ابوہریرہؓ کی ماں کو ہدایت عطا فرمائے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسی وقت دعا فرمائی: اے اللہ! ابوہریرہؓ کی ماں کو ہدایت عطا فرما۔ ابوہریرہؓ گھر پلٹے تو دیکھا کہ دروازہ بند ہے اور پانی گرنے کی آواز آرہی ہے۔ ان کی ماں نے پاؤں کی آہٹ محسوس کی تو کہا: "ابوہریرہؓ آگے نہ بڑھو!" نہا دھو کر فوراً کپڑے پہن کر دروازہ کھولا اور کلمہ توحید پڑھا۔ حضرت ابوہریرہؓ کو اس قدر مسرت ہوئی کہ خوشی کے مارے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ رب تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمالی ہے۔[1]

حضرت ابو سلمہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت طلیبؓ بن عمیر نے دارِ ارقم میں اسلام قبول کیا۔ قبولِ اسلام کے بعد اپنی والدہ محترمہ حضرت اروی ؓبنت عبدالمطلب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو قبولِ اسلام کی دعوت دی، چنانچہ ان کی دعوت پر ان کی والدہ نے بھی اسلام قبول کرلیا۔[2]

حضرت عمار بن یاسرؓ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے دارِ ارقم میں اسلام قبول کیا اور وہیں پر قرآن کی تعلیم بھی حاصل کی، شام کو جب گھر واپس آئے تو والدین نے پوچھا کہ تم کہاں تھے؟ انھوں نے اپنے اسلام لانے کی خبر دی اور دن بھر جو قرآن سیکھا اس کی ان کے سامنے تلاوت کی اور ان کو بھی اسلام لانے کی دعوت دی۔ آپؓ کے والدین کلامِ الٰہی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے فوراً اسلام قبول کرلیا۔[3]

حضرت طفیلؓ بن عمرو الدوسی قبول اسلام کے بعد رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے اپنی قوم کی طرف پلٹے تاکہ ان کو اسلام کی طرف بلائیں۔ حضرت طفیلؓ بن عمرو اپنی قوم میں واپس آئے تو سب سے پہلے اپنے والد محترم کو اسلام کی طرف بلایا، تو انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد اپنی زوجہ محترمہ کو اسلام کی دعوت دی تو وہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئیں، اس کے بعد انھوں نے پورے قبیلہ دوس کو اسلام کی طرف دعوت دی۔[4] نیز صحابہ کرامؓ تعلیم و تربیت میں بھی

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب من فضائل ابی ھریرہؓ

[2] الاصابہ، تذکرہ اروئؓ بنت عبدالمطلب، ۴/ ۲۲۷،

[3] الاصابہ، تذکرہ عمار بن یاسرؓ، ۲/ ۵۱۲۔

[4] ابن ہشام، قصۃ اسلام الطفیلؓ بن عمرو الدوسی، ۱/ ۴۲۰۔ ۴۲۳

اپنے گھر والوں کو مقدم رکھتے تھے۔

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں: حضرت عمرؓ رات کو نماز پڑھتے جتنی دیر اللہ چاہتا، یہاں تک کہ جب رات کا آخری حصہ آتا تو اپنے گھر والوں کو جگاتے اور ان سے کہتے: نماز، نماز، پھر یہ آیت تلاوت کرتے:

﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى﴾[1]

"اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور خود اس پر ثابت قدم رہ۔ ہم تم سے روزی نہیں مانگتے، ہم تجھے روزی دیں گے اور انجام کار بھلا پرہیزگاری کے لیے ہے)۔

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو تلقین فرمائی کہ سوتے وقت وہ یہ دعا پڑھا کریں:

"بسمِ اللهِ، أعوذ بكلمات الله التامة من غضبه وعقابه و شر عباده، ومن همزات الشياطين وأن يحضرون"[2]

حضرت عبداللہؓ بن عمرو کا طریقہ یہ تھا کہ ان کے بیٹوں میں سے جو بھی بلوغت کی عمر کو پہنچ جاتا اس کو اس دعا کی تعلیم دیتے اور اس کو تلقین کرتے کہ وہ سونے کے وقت اس دعا کو پڑھے۔

ایک مرتبہ حضرت براءؓ بن عازب نے اپنے تمام خاندان کو جمع کر کے فرمایا کہ میں نے جس طرح رسول اللہ ﷺ کو وضو کرتے اور نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے میں چاہتا ہوں کہ آج تمھیں دکھادوں، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میں کتنی مدت تک تمہارے درمیان زندہ رہوں گا؟ اس کے بعد آپؓ نے گھر والوں کے سامنے سنت طریقے کے مطابق وضو کیا اور ظہر کی نماز پڑھائی پھر آپؓ نے عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں باجماعت پڑھائیں اور پھر فرمایا:

"ما ألوت أن أريكم كيف رسول الله صلى الله عليه وسلم يتوضأ؟ و كيف كان يصلي؟"[3]

اس سے میرا ارادہ صرف یہ تھا کہ تم کو دکھاؤں کہ رسول اللہ ﷺ کیسے وضو کرتے تھے؟ اور کیسے نماز پڑھتے تھے؟

دعوت حق سراپا خیر اور بھلائی ہے اور اس بھلائی کے اولین حقدار داعی کی اپنی ذات اور اس کے اہل خانہ ہیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ جہاں داعی اس دعوت کا عملی نمونہ ہو وہاں اس کے اہل خانہ بھی اس کے دست و بازو ثابت ہوں۔ اس

---

[1] طٰہٰ، ۲۰: ۱۳۲

[2] المسند، حدیث براءؓ بن عازب، ح: ۱۸۰۶۵، ۵، ۳۶۶

[3] المسند، حدیث براءؓ بن عازب، ح: ۱۸۰۶۵، ۵، ۳۶۶

لیے داعی کو چاہیے کہ وہ اپنی اصلاح کے بعد اپنے اہل خانہ اور خاندان کے دیگر افراد کی اصلاح کرے اور پھر دوسرے لوگوں کو اسلام کی طرف بلائے تو اس کی دعوت زیادہ موئثر ہو گی۔ صحابہ کرامؓ نے دعوت میں ہمیشہ اس ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا۔

2.5۔ مراتب کا احترام

لوگوں کی طرف سے ایذا رسانی کے باوجود ان کے مراتب کا احترام داعی کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنی دعوت کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ اس کے پاس ہر طرح کے لوگ آئیں گے۔ جن میں مختلف قبیلوں اور گروہوں کی بڑی شخصیات بھی ہو سکتی ہیں۔ اہل علم بھی اور عام آدمی بھی اسے چاہئے کہ ان میں سے ہر ایک کے مرتبہ اور مقام کے مطابق ان سے سلوک کرے۔ ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

أمرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم أن ننزل الناس منازلهم [1]

رسول اللہ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم لوگوں کو ان کے مرتبے کے لحاظ سے مقام دیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرو بن شعیب نے بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَيَعْرِفْ شَرَفَ كَبِيرِنَا [2]

جو چھوٹے پر رحم نہیں کرتا اور بڑے کی عزت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں۔

سیرت طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے صرف تعلیم دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ آپ ﷺ بچوں سے پیار کرتے، انہیں بوسہ دیتے، گود میں بٹھاتے، نوجوانوں کی اچھے کاموں کے لئے نہ صرف رہنمائی کرتے بلکہ کام کرنے پر ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ بزرگوں کی عزت کرتے اور انہیں مجلس میں کشادہ جگہ عطا فرماتے۔ مختلف قبیلوں کے سربراہوں کا ان کے وفود کے ساتھ والہانہ استقبال کرتے۔ ان کے سرداروں کے حق میں بھلائی کے کلمات ادا فرماتے جیسا کہ آپ ﷺ نے ایک وفد عبد القیس کے ساتھ کیا۔ ایک داعی کے لئے اس میں بہترین نمونہ ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی تنزیل الناس منازلھم، ۳۴۳/۴۔

[2] سنن ابی داؤد، باب فی الرحمۃ، ۱۷/۴ ۳۔

2.6۔تعاون اور خیر خواہی

داعی کبھی بھی تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا، بلکہ وہ تو ہمیشہ لوگوں کے درمیان گھرا رہتا ہے اس لئے اسے زندگی میں جگہ جگہ اپنوں اور غیروں دونوں سے تعاون لینے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔اس لئے قرآن مجید نے ہمیں رہنما اصول فراہم کر دیا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾[1]

(بھلائی اور نیکی کے کاموں میں تعاون کرو اور گناہ اور ظلم و زیادتی میں تعاون نہ کرو۔)

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رسول اللہ نے فرمایا:

الدِّينُ النَّصِيحَةُ قُلْنَا لِمَنْ؟ قال: لِلَّهِ وَلِكِتَابِهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ[2]

دین خیر خواہی ہے۔سوال کیا گیا کس کی؟ فرمایا: اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی، مسلمانوں کے امراء سربراہوں کی اور عام مسلمانوں کی۔

ان تعلیمات کے تناظر میں دیکھا جائے تو نبی اکرم ﷺ کی زندگی پوری انسانیت کے لئے خیر خواہی چاہنے کی زندگی ہے۔ آپ ﷺ نے بھلائی کے کاموں میں تعاون کرنے سے کبھی بھی پہلو تہی نہیں فرمائی بلکہ آگے بڑھ کر دوسروں کا ساتھ دیا۔

بعثت نبوی سے پہلے حلف الفضول کے معاہدے میں آپ ﷺ کی شرکت اس کی سب سے بڑی دلیل ہے۔آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے۔

مَا أُحِبُّ أَنَّ لِي بِهِ حُمْرَ النَّعَمِ، وَلَوْ أُدْعَى بِهِ فِي الإِسْلامِ لأَجَبْتُ[3]

مجھے اس معاہدے کے مقابلے میں سرخ اونٹ لینا بھی پسند نہیں ہے اور اگر اسلام میں مجھے ایسے معاہدے کے لئے بلایا جائے تو میں اس کا مثبت جواب دوں گا۔

---

[1] سورۃ المائدۃ ۵: ۲

[2] سنن ابی داؤد، باب فی النصیحہ، ۴/ ۷۲ ۳۔

[3] الدمشقی، اسماعیل بن کثیر، ابو الفداء، البدایۃ النہایۃ، ۲/ ۲۹۳، بیروت، طبع اولی ۱۹۶۶ء۔

داعی کو چاہئے کہ وہ سیرت طیبہ کے اس پہلو کی روشنی میں اپنوں اور غیروں سے تعاون کرتا ہوا اپنی دعوت کو آگے بڑھائے۔ آج دنیا ایک گاؤں کی حیثیت اختیار کر چکی ہے فاصلے سمٹ گئے اور لوگوں کا ایک دوسرے سے رابطہ بھی آسان ہو گیا ہے داعی کو چاہئے کہ اس ترقی سے فائدہ اٹھائے اور لوگوں سے تعاون لے بھی اور ان سے تعاون کرے بھی تاکہ اسلامی دعوت پوری دنیا میں آسانی سے اپنی منزلیں طے کرتی ہوئی آگے بڑھے۔

2.7۔ تواضع، عاجزی اور معاشرت

داعی لوگوں کے ہاں جتنا پسندیدہ ہو گا اسی قدر اس کی دعوت مقبول ہو گی۔ اس کے گرد لوگوں کا اجتماع زیادہ ہو گا، انکساری اور عاجزی کے سوا کوئی بھی چیز داعی کو لوگوں کا گرویدہ نہیں بناتی، اسی لیے اللہ نے اس کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور تکبر کو حرام قرار دیا ہے۔

انکساری لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے سے پیدا ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے، فرمایا:

﴿وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾[1]

(آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ وابستہ رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کی رضا جوئی چاہتے ہیں اور اس کو پکارتے ہیں اور آپ کی نگاہیں دنیا کی زینت کی خاطر ان سے ہٹنے نہ پائیں۔)

نیز فرمایا:

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾[2]

(اور لوگوں سے بے رُخی نہ کرو اور زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔)

رسول اللہ نے ارشاد فرمایا:

(لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ)[3]

”جس شخص کے دل میں رائی کے برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔“

---

1 سورۃ الکہف ۱۸: ۲۸

2 سورۃ لقمان ۳۱: ۱۸

3 ابن حنبل، الامام احمد بن حنبل الشیبانی، المسند، ج ا ص ۴۱۲

اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ) [1]

''جو شخص اللہ کے لیے عاجزی اختیار کرتا ہے اللہ اس کا مقام و مرتبہ بلند کر دیتا ہے۔''

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بازار میں جاتے کسی قسم کی خرید و فروخت نہ کرتے بلکہ صرف لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے۔ لوگ انھیں دیکھ کر خوش ہوتے اور ان کے گرد جمع ہو جاتے اور اپنے مسائل دریافت کرتے آپؓ انھیں جوابات دیتے۔ [2]

لوگوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے سے لوگوں کے مسائل کا پتہ چلتا ہے حالات سے آگاہی رہتی ہے۔ لوگوں کی ضروریات کا پتہ چلتا ہے اور یہ چیز دعوت کو جس قدر مضبوط کرتی ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو مسلمان لوگوں کے ساتھ مل جُل کر رہتا ہے اور ان کی طرف سے ملنے والی اذیت پر صبر کرتا ہے۔ وہ اس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا اور ان کی اذیت پر صبر نہیں کرتا۔'' [3]

انبیاء کرام کا یہی طریقہ رہا ہے لوگوں میں گھل مل کر رہتے۔ غیر شادی شدہ کی شادی کرواتے، مریض کی عیادت کرتے، فوت شدہ کا جنازہ پڑھتے، غریب کی مدد کرتے، مریض اگر غیر مسلم یا دشمن بھی ہوتا پھر بھی اس کی عیادت کرتے حتیٰ کہ آپ ﷺ نے ایک یہودی بچے کی عیادت کی اور وہ فوت ہونے سے قبل مسلمان ہو گیا۔ اور نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اے اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے اسے جہنم سے بچا لیا ہے۔'' [4]

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک لونڈی آپ کا دست مبارک پکڑ کر اپنے کام کے لیے آپ کو اپنے ساتھ لے جایا کرتی تھی۔ [5]

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

1 المسلم، کتاب البر والصلة، باب استحباب العفو والتواضع، رقم الحدیث: ۲۵۸۸

2 البخاری، ادب المفرد، باب من خرج یسلم ویسلم علیه، رقم: ۱۰۰۶

3 ابن حنبل، ج ۳، ص ۹۸

4 البخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم صبی فمات ہل یصلی علیه وہل یعرض علی الصبی السلام

5 ابن حنبل، ج ۳، ص ۹۸

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾[1]

(اپنی رحمت کے بازو مومنین کے لیے پھیلائے رکھو۔)

2.8۔داعی کے کلام کی خصوصیات

مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی کتاب میں داعیانِ حق کے کلام کی کچھ خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ جن کا دعوت میں بہت اثر ہے اور داعی ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ذیل میں ان کا ذکر کیا جائے گا۔[2]

ا۔دعوت کی زبان

ہر نبی کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ دعوت اسی قوم کی اپنی زبان میں دی گئی ہے۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾[3]

کسی پیغام کے لئے اپنی زبان ہی سب سے زیادہ موثر ذریعۂ اظہار ہے خواہ دیگر زبانیں اس سے کہیں زیادہ وسیع اور متمدن ہوں مگر اس قوم کے فہم کے قریب تر ان کی اپنی زبان ہی ہو گی۔ جیسا کہ حضرت مسیح کا بیان ہے "کہ میں بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی کے پاس نہیں آیا۔۔۔ یہ مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دیں۔"[4]

۲۔کلام مبین

داعی کا بیان واضح اور مناسب ہو۔ غیر ضروری طوالت، استعارات، تشبیہات اور ابہام، اجمال اور تلمیحات سے پاک ہو۔ کیونکہ مخاطب کو مرعوب کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کے دل کو متاثر کرنا ہے جو کہ سادگی اور صفائی سے زیادہ ممکن ہے۔

۳۔مختلف اسالیب کا استعمال

داعی کے کلام کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی پیغام کو مختلف طریقوں اور پیرائیوں میں بیان کرتا ہے تاکہ مخاطب عاجز نہ آئے، نیز یہ کہ مختلف لوگ مختلف طریقوں سے قائل ہوتے ہیں۔ لہٰذا جس کو جو اسلوب پسند

---

[1] سورۃ الحجر ۱۵: ۸۸

ا۔ دعوت دین اور اس کا طریقہ کار، ص ۵۴

۲۔ سورۃ ابراہیم ۱۴: ۴

۳۔ انجیل متی، باب ۱۵: ۲۶

آئے وہ اس کو تسلیم کرے۔

﴿وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾[1]

۴۔جذبات ودلائل سے بھرپور کلام

داعی کا کلام حجت واستدلال کے ساتھ ساتھ جذبہ اور جوش سے بھی لبریز ہوتا ہے۔کیونکہ داعی عقل کے ساتھ ساتھ انسان کے اعلیٰ جذبات سے بھی اپیل کرتے ہیں۔ محض فلسفیانہ نکتہ سنجی یادقیق علمی نکات بیان کرنے سے دعوت کا مقصد حاصل نہیں ہوتابلکہ یہ اعتمادِراسخ کا نتیجہ ہوتا ہے۔جو قوم کی ہمدردی کے لئے داعی کے دل میں ہوتا ہے۔لہٰذا داعی کا کلام مردہ اور بے روح نہیں ہونا چاہیئے۔

۵۔یک رنگی اور وحدت

داعی کے قول وفعل اور تاثر، ہر چیز سے ایک وحدت اور یک رنگی ظاہر ہونی چاہیئے اور وہ یہ کہ اس کا مقصد صرف مخاطبین کی ہدایت ہو۔خواہ کسی چیز سے اسے عزت وشہرت حاصل ہو یا قومی اور ملی فوائد، مگر داعی کے پیشِ نظر پہلے اصل مقصد ہونا چاہیئے۔اس کو اس کے کلام کی پہلی ترجیح نظر آنی چاہیئے۔

۶۔ضد اور مخالفت سے پاک کلام

داعی کا کلام ضد اور مخالفت سے بری ہو۔مخاطب سے گفتگو کے وقت نہ تو اپنی برتری کا اظہار کرے اور نہ بلا مقصد تنقید کرے کہ مخاطب ضد پر ہی اڑ جائے۔مناظرانہ انداز سے بچیں۔

﴿فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَى رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَى هُدًى مُسْتَقِيمٍ ۔ وَإِنْ جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ۔ اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ﴾[2]

۷۔ازالہ شبہات

اسلوبِ دعوت میں سے ایک اہم مقام شبہات کا ازالہ بھی ہے۔داعی کے صدق اور دعوت کی حقیقت وغیرہ کے متعلق مخاطبین کی طرف سے جو شبہات وارد کئے جاتے ہیں داعی ان کے ازالے کے ذریعے مخاطبین کو مطمئن کرنے کی کوشش

۴۔ سورۃ الانعام ۶: ۱۰۵

② سورۃ الحج ۲۲: ۶۷،۶۹

کرتا ہے۔ شبہات زیادہ تر مخاطبین میں سے صاحب حیثیت و اقتدار طبقہ کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں یہ گروہ عوام الناس کو داعی کے متعلق ورغلاتے ہیں۔ ان شبہات سے اس گروہ کا مقصد تلاشِ حقیقت یا اطمینان قلب نہیں ہوتا بلکہ یہ محض دعوت کی مخالفت کے مقصد سے داعیین کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں اور ان کی دعوت کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات وارد کرتے ہیں تاکہ لوگ دعوت کو قبول نہیں کریں۔ جیسا کہ مولانا مودودی نے تفہیم القرآن کے مقدمے میں لکھا ہے کہ

"قرآن کو آپ اس وقت سمجھ سکتے ہیں کہ جب آپ دعوت الی اللہ کا کام لے کر نکلیں۔ اور جیسے جیسے یہ کتاب ہدایت دیتی جائے ویسے ویسے قدم اٹھاتے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزولِ قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔ مکہ طائف اور حبش کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے، بدر و احد اور حنین و تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابو جہل اور ابو لہب سے بھی آپ کا واسطہ پیش آئے گا۔ منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے اور سابقین الاولین سے لے کر مؤلفات القلوب تک کے سارے نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔"[1]

یعنی یہ امر واضح ہے کہ جب بھی دعوت کا کام شروع کیا جائے گا، مخالفت سے واسطہ پڑے گا۔ الزامات اور شبہات وارد کئے جائیں گے۔ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خطاب کر کے فرمایا:

﴿مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِن قَبْلِكَ﴾[2]

(آپ ﷺ کو کوئی ایسی بات نہیں کی گئی جو آپ سے پہلے رسولوں کو نہ کہی گئی ہو"۔)

اسی طرح فرمایا:

﴿مَا أَتَى الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ﴾[3]

(ان سے پہلے ان کے پاس کوئی رسول نہیں آئے جن کو ساحر یا مجنون نہ کہا گیا ہو۔)

---

① تفہیم القرآن، ج:۱: مقدمہ، ص۱۶

② سورۃ فصلت ۴۱: ۴۳

③ سورۃ الذاریات ۵۱: ۵۲

یعنی حضور ﷺ سے پہلے بھی رسولوں کو اس طرح مطعون کیا گیا۔ جب داعی یہ بات سمجھ لیتا ہے تو پھر اس کو مخاطبین کی ان حرکتوں پر غصہ نہیں آتا بلکہ اس کو دعوت کے راستے کے ناگزیر مراحل سمجھ لیتا ہے۔ اور خدا سے کامیابی کے لئے نصرت طلب کرتا ہے۔

2.9۔ مخاطب کی نفسیات کا لحاظ

داعی کو چاہیے کہ فریضۂ دعوت کے دوران مدعو کی نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسا انداز اختیار کرے کہ مدعو کے لیے اس کو قبول کرنا آسان ہو۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی کتاب "دعوت دین اور اس کا طریق کار" میں لکھا ہے کہ "جس طرح ایک بیج کے نشو نما پانے کے لیے تنہا بیج کی صلاحیتوں ہی پر نظر نہیں رکھنی پڑتی، بلکہ زمین کی آمادگی و مستعدی اور فصل و موسم کی سازگاری و موافقت کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے، اسی طرح کلمۂ حق کی دعوت میں مجرد حق کی فطری صلاحیتوں پر ہی اعتماد نہیں کر لینا چاہیے بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جن لوگوں کے سامنے حق پیش کیا جارہا ہے، دعوت کے وقت نفسیاتی نقطہ نظر سے ان کی حالت کیا ہے۔"[1]

مولانا اصلاحی نے مخاطب کی نفسیات کی رعایت کے دس اصول بتائے ہیں جو انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے طریق دعوت سے استنباط کر کے مقرر کیے ہیں۔ ذیل میں یہ (۱۰) اصول ذکر کیے جارہے ہیں۔

ا۔ آسان سے مشکل کی طرف لانا

دعوت دیتے ہوئے بنیادی بات یہ ذہن میں رکھنے کی ہے کہ مخاطب کے سامنے پہلے کسی بھی چیز کی آسان ترین صورت رکھی جائے تاکہ اس سے قرب اور آسانی محسوس کرتے ہوئے مانوس ہو سکے اور جب اس کا ذہن دعوت کی نرم اور آسان باتوں کو قبول کرلے تو پھر دیگر مشکل احکامات سمجھائے جائیں لیکن اگر اس کے برعکس ایک دم مشکل باتوں کی دعوت دے دی جائے تو مخاطب وحشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوگا، روایتی مذہبی جماعتوں کی ناکامی کا ایک اہم سبب یہی ہے کہ وہ انسانی نفسیات اور بشری تقاضوں کو پیش نظر نہیں رکھتے حالانکہ آنحضرت ﷺ نے ان چیزوں کی رعایت کی ہے، فرمایا"**بشروا ولا تنفروا**"[2]

"خوشخبری دو، لوگوں کے درمیان نفرت نہ پھیلاؤ"۔

---

① دعوت دین اور اس کا طریق کار ص ۱۳۳

② البخاری، الجامع الصحیح۔ کتاب العلم باب ماکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتخولہم بالموعظۃ والعلم کی لاینفروا

داعیانِ حق کو ان کی حیثیت باور کراتے ہوئے فرمایا

"فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ"[1]

۲۔ مخاطب میں حمیت ابھارنے والے انداز وافعال سے گریز

داعی کو ایسے اقدامات سے نیز ایسا انداز اختیار کرنے سے گریز کرنا چاہیے جس سے مخاطب میں جاہلی حمیت جاگ جائے، کیونکہ ہر فرد و قوم اپنے عقیدوں اور رعایات کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں، اگر براہِ راست ان کو غلط کہہ دیا جائے گا تو وہ مقابلے پر آجائیں گے، جیسا کہ قرآن پاک نے واضح ہدایت کی ہے

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ﴾[2]

(اور اللہ کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں، ان کو گالی نہ دو کہ وہ تجاوز کر کے بے خبری میں اللہ کو گالیاں دینے لگیں، اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نگاہوں میں اس کا عمل خوش نما بنا رکھا ہے۔")

مراد یہی ہے کہ اگر داعی دونوں فریقوں کے عقائد یا لیڈروں کے موازنے یا ترجیح وتفضیل پر آجائے تو مخاطب کا راہ حق کی طرف آنا ناممکن سا ہو جاتا ہے، اس لیے داعی کو چاہیے کہ اگر موازنے کا ایسا کوئی موقع آبھی جائے تو اس کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کرے اور مخاطب کے لیڈروں اور مقتداؤں کی تحقیر کے بجائے ان کے جائز عزت واحترام کا اعتراف کرے، جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل میں اس طرح کی ہدایت ہے:

﴿وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُبِينًا ۔ رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ إِنْ يَشَأْ يَرْحَمْكُمْ أَوْ إِنْ يَشَأْ يُعَذِّبْكُمْ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ۔ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَى بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا﴾[3]

(اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہے۔۔۔اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی اور ہم نے

---

① البخاری، الجامع الصحیح۔ کتاب الوضو باب بَابُ صَبِّ المَاءِ عَلَى البَوْلِ فِي المَسْجِدِ

② سورۃ الانعام ۶: ۱۰۸

③ سورۃ بنی اسرائیل ۱۷: ۵۵-۵۳

داؤدؑ کو زبور عطا کی"۔)

اس ہدایت کا مقصد یہ ہے کہ داعی کی گفتگو اصل مقصد تک محدود ہو اور وہ عصبیت اور اختلاف کے موضوعات سے پرہیز کرے اور ان کے عقائد مزعومات کو براہِ راست غلط کہنے کی بجائے ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے جن کی وجہ سے یہ غلط عقائد پر قائم ہیں۔

۳۔ مقام و منصب

انسانی فطرت ہے کہ جو لوگ اعلیٰ مقام و منصب کے عادی چلے آرہے ہوں، اس سے اگر پہلے ہی مذاکرے میں ان کے مطلوبہ لحاظ کے بغیر بات کی جائے تو وہ اس کو اپنی جائز حق تلفی سمجھتے ہوئے مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں گے، لہٰذا ایک خاص حد تک داعی کو چاہیے کہ ایسے لوگوں کے مطلوبہ آداب کا خیال رکھے تاکہ قبول حق میں اپنے نفس کی مزاحمتوں کے سوا داعی کی طرف سے کوئی جدید مانع نہ پیدا ہو جائے، اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو ہدایت فرمائی:

﴿اذْهَبَا إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى . فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَيِّنًا لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى﴾ [1]

(تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ بے شک اس نے سرکشی کی، پاس اس کو نرمی کے ساتھ دعوت دو، شاید وہ یاد دہانی حاصل کرے یا ڈرے"۔)

لیکن یہ لحاظ اسی حد تک جائز ہے جب تک دعوت کے احترام اور وقار کے منافی نہ ہو۔

۴۔ دعوت مدعو کی استعداد کے مطابق

مولانا اصلاحی نے داعی کی مثال ایک طبیب سے دی ہے، جس طرح طبیب مریض کی عمر، مزاج اور مرض کی شدت و خفت کے لحاظ سے دوا تجویز کرتا ہے، اسی طرح داعی مخاطب کی ذہنی و قلبی استعداد، اس کے ظرف کے لحاظ سے دعوت دے گا، اس کا اندازہ کرنے کے لیے مخاطب کی نوعی استعداد و قابلیتوں کے علاوہ اس کی قومی و انفرادی خصوصیات کا لحاظ بھی ضروری ہے، اسی وجہ سے قرآن بھی مختلف اوقات میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا، قرآن میں ارشاد ہے:

﴿وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا﴾ [2]

---

① سورۃ طٰہٰ ۲۰: ۴۲، ۴۳

② سورۃ بنی اسرائیل ۱۷: ۱۰۶

(اور قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اس لیے اتارا کہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سناؤاور ہم نے اس کو نہایت اہتمام سے اتارا ہے"۔)

اس اصول کے شواہد قرآن سے بھی ملتے ہیں، مثلاً قرآنی دعوت میں بہت سی باتیں عربوں کے مزاج کے مطابق اختیار کی گئی ہیں، نیز سیرت سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آنحضور ﷺ کا بدؤں کو تبلیغ کرنے کا انداز قریشی سرداروں اور پڑھے لکھے لوگوں سے یکسر مختلف ہوتا تھا، جن لوگوں کا اختلاف معمولی اور جن کی الجھنیں سادہ تھیں، ان کے سامنے دین کی سیدھی سادی تعلیمات پیش کر دی جاتی تھیں تاکہ وہ ان پر عمل کریں، اس کے برعکس جو لوگ گہری الجھنیں رکھتے تھے ،ان کے ذہنوں کو صاف کرنے کے لیے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ لگاتار دعوت دی جاتی تھی۔

۵۔ مخاطب کا میلان طبع

داعی کو ایسے اوقات میں دعوت نہیں دینی چاہئے جب مخاطب اعتراض اور نکتہ چینی کی طرف مائل ہو۔ اگر عام حالت میں دعوت دینے کے بعد بھی مخاطب ضد بحث پر اتر آئے تو داعی کو چاہئے کہ وہ بحث بڑھانے کی بجائے ختم کر کے وہاں سے ہٹ جائے اور مناسب موقع کا انتظار کرے جب مخاطب خالی الذہن یا کم از کم اعتراض و نکتہ چینی کے رجحان سے خالی ہو۔

﴿وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾[1]

(جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں مین میکھ نکالتے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مصروف ہو جائیں اور اگر شیطان تمہیں بھلادے تو یاد آجانے کے بعد ان کے ساتھ نہ بیٹھو۔)

مولانا اصلاحی لکھتے ہیں کہ اسی صریح ممانعت ہوتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے علماء نے تبلیغ دین کے لئے مناظرہ کے طریقے کو کیسے جائز سمجھا جس میں دونوں فریق اکٹھے ہی اس قصد کے لئے ہوتے ہیں کہ اپنے حریف کی بات کی تردید و تکذیب کریں گے اگرچہ وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔

۶۔ مخاطب کی دلچسپی کا اظہار

داعی کو ایسے وقت میں بھی دعوت نہیں دینی چاہئے جب مخاطب اپنی کسی ایسی دلچسپی میں منہمک ہو جس کو چھوڑ کر دعوت

---

[1] سورۃ الانعام ۶: ۶۸

حق کی طرف متوجہ ہونا اس کو گراں گزرے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے۔

" عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ حَدِّثْ النَّاسَ كُلَّ جُمُعَةٍ مَرَّةً فَإِنْ أَبَيْتَ فَمَرَّتَيْنِ فَإِنْ أَكْثَرْتَ فَثَلَاثَ مِرَارٍ وَلَا تُمِلَّ النَّاسَ هَذَا الْقُرْآنَ وَلَا أُلْفِيَنَّكَ تَأْتِي الْقَوْمَ وَهُمْ فِي حَدِيثٍ مِنْ حَدِيثِهِمْ فَتَقُصُّ عَلَيْهِمْ فَتَقْطَعُ عَلَيْهِمْ حَدِيثَهُمْ فَتُمِلُّهُمْ وَلَكِنْ أَنْصِتْ فَإِذَا أَمَرُوكَ فَحَدِّثْهُمْ وَهُمْ يَشْتَهُونَهُ "[1]

ترجمہ:۔حضرت عکرمہؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے کہا لوگوں کو جمعہ کے جمعہ وعظ کیا کرو اگر اس سے زیادہ بھی کرنا چاہو تو ہفتہ میں دو بار اور اگر اس سے زیادہ بھی کرنا چاہو تو ہفتہ میں تین بار اور لوگوں کو اس قرآن سے بیزار نہ کرو۔ میں تمہیں اس حال میں نہ دیکھوں کہ تم کسی جماعت کی طرف جاؤ اور وہ اپنے کسی کام میں مشغول ہوں اور اس حال میں تم ان کو وعظ سنانا شروع کر دو۔ اور اس کا نتیجہ بیزاری ہو بلکہ تمہیں چاہئے کہ تم خاموش رہو اور جب لوگ فرمائش کریں تو ان کو سناؤ اور وہ خواہش سے سنیں۔

۷۔ تکرار اور طوالت سے گریز

داعی کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ دعوت کی خشکی اور یک رنگی نیز طوالت اور تکرار کی وجہ سے لوگ بے راہ نہ ہوں بعض اوقات داعی کو اپنے متعلق خوش گمانی ہو جاتی ہے اور وہ بات طویل کر دیتا ہے شہرت پسندی طوالت کا موجب بنتی ہے بعض اوقات موضوع کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے مگر وجہ کوئی بھی ہو طوالت داعی کے لئے نقصان دہ ہے۔

" عَنْ أَبِي وَائِلٍ، قَالَ: كَانَ عَبْدُ اللَّهِ يُذَكِّرُ النَّاسَ فِي كُلِّ خَمِيسٍ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ لَوَدِدْتُ أَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا كُلَّ يَوْمٍ؟ قَالَ: أَمَا إِنَّهُ يَمْنَعُنِي مِنْ ذَلِكَ أَنِّي أَكْرَهُ أَنْ أُمِلَّكُمْ، وَإِنِّي أَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ، كَمَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُنَا بِهَا، مَخَافَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا "[2]

ترجمہ: ابو وائل سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر جمعرات کو وعظ کیا کرتے تھے ایک شخص نے ان سے کہا اے ابو عبدالرحمٰن میری خواہش ہے کہ آپ روزانہ وعظ فرمایا کریں۔ انہوں نے جواب دیا میں ایسا اس خیال نہیں کرتا کہ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الدعوات باب ما یکرہ من السمیع فی الدعاء

[2] صحیح بخاری، کتاب العلم، باب من جعل لاھل العلم ایاما معلومہ

کہیں تم بیزار نہ ہو جاؤ میں بھی اسی طرح ناغہ کر کے تمہیں نصیحت کرتا ہوں جس طرح حضور ﷺ ناغہ کر کے نصیحت کرتے تھے تا کہ ہم بیزار نہ ہونے پائیں۔

روایات میں آتا ہے آپ ﷺ کی ہدایت تھی کہ نصیحت کرو تو مختصر نصیحت کرو۔ یعنی دعوت جامع اور بلیغ ہونی چاہئے کہ جادو کی طرح دل پر اثر کرے نہ کہ طبیعت کو قبول حق کے لئے کند کر دے۔

۸۔ موقع و محل کا مناسب استعمال

داعی کو گرد و پیش کا جائزہ پوری ہوشیاری اور مستعدی سے لینا چاہئے کہ جس بات کو پیش کرنے کے لئے جو مناسب حالات سامنے آئیں ان سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہئے اس کی بہترین مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ میں ملتی ہیں۔

﴿وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْرًا وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَانِي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْزًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ. قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ذَلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ. وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ذَلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ. يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ. مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ. يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا وَأَمَّا الْآخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَأْسِهِ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ﴾[1]

آیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جیل میں جب دو لوگ ان سے خواب کی تعبیر معلوم کرنے آئے گویا کہ اس وقت ان کو حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان پر مکمل اعتماد تھا تو آپ نے ان کو محض تعبیر بنا کر رخصت نہیں کر دیا بلکہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ان کو توحید کی دعوت پیش کی اور دعوت بھی محض بیانیہ انداز میں پیش نہیں کر دی۔

---

(۲) سورۃ یوسف ۱۲: ۳۶-۴۱

﴿يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ [1]

یعنی سوالیہ استفہامیہ انداز اختیار کرتے ہوئے ان کی عقلوں کو جھنجھوڑا کہ تم خود سوچو کہ کون سا راستہ بہتر ہے۔

۹۔ مخاطبین کی درجہ بندی

داعی کو مخاطبین کی ان کے ذہنی معیار کے مطابق درجہ بندی کرنی چاہئے اور پھر ہر گروپ سے اس کے ذہنی معیار کے مطابق استدلال کا انداز اختیار کرنا چاہئے۔ مثلاً اہل علم سے خطات کا جو معیار اور انداز ہو گا وہ عام لوگوں کو بالکل سمجھ نہ آسکے گا جبکہ عام لوگوں کے لئے جو طرز استدلال مناسب ہے اس میں اہل علم کے لئے متاثر کرنے کے لئے کچھ نہیں۔ داعی ہر ایک کو اس کے مناسب مرتبہ کے لحاظ سے مناسب جگہ رکھے قرآن نے ہدایت فرمائی۔

﴿وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلَٰهُنَا وَإِلَٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ [2]

(اور اہل کتاب سے بہتر طریقہ پر بحث کرو۔ بجز ان کے جو ان میں سے ظالم ہیں اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہم پر نازل ہوئی اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف اتاری گئی اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اس کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔)

اہل کتاب سے احسن طریقہ پر مباحثہ کی اجازت دی مگر اس کی صورت بھی بیان کر دی کہ مشترک امور کا اقرار کرو تا کہ موانست اور قرب پیدا ہو۔ اسکے بعد ان سے مطالبہ کرو کہ ان مسلمان سے جو باتیں لازم آتی ہیں وہ بھی ان کا اقرار کریں۔ اس طریق دعوت کا یہ اثر ہو گا کہ داعی یہ دیکھ کر مخاطب خود کو کوئی بڑی چیز نہیں سمجھ رہا اور نہ ہی دعوت کو کسی نئے انکشاف کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے اور مشترک امور کا بھی اقرار کر رہا ہے غور کرنے کی طرف مائل ہو گا لیکن اس کے برعکس اگر اہل کتاب کو بھی امیوں کی طرح خطاب کیا جاتا تو اپنے بندار کے مجروح ہونے کی وجہ سے ان کے قبول حق میں مزاحمت ہوتی۔

---

[1] سورۃ یوسف ۱۲: ۳۹

[2] سورۃ العنکبوت ۲۹: ۴۶

۱۰۔ دلائل برحق ہونے کے باوجود اصرار سے پرہیز

داعی مخاطب میں ضد اور عناد محسوس کرے تو اس کو مزید ابھرنے یا سخت ہونے کا موقع نہ دے خواہ اس کے دلائل بالکل کمزور ہوں اس کے طریقہ محض دھاندلی ہوں تب بھی داعی اس دلیل پر اصرار نہ کرے جس سے مخاطب اپنی ضد پر اڑ جائے۔ بلکہ کسی اور انداز سے دعوت پیش کرے اس کی بہترین مثال حضرت ابراہیمؑ کے اسوہ سے ملتی ہے

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾[1]

(کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا۔ اس وجہ سے کہ خدا نے اس کو اقتدار بخشا تھا۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے تو اس نے کہا میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا میرا رب اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال دے تو وہ کافر مبہوت رہ گیا۔ اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دلیل معترض کے معارضہ سے مجروح نہیں ہوئی تھی وہ چاہتے تو اس کی تفصیلات میں جا سکتے تھے مگر مخاطب کی نفسیات کا اندازہ لگا لینے کے بعد اگر وہ اس پر اصرار فرماتے تو بجائے فائدے کے مخاطب کے ضد پر آجانے کی وجہ سے نقصان ہوتا۔ لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک دوسری دلیل پیش کر کے لاجواب کر دیا۔ درج بالا اصول مخاطب یا مدعو کی نفسیات کے حوالے سے ترتیب دیے گئے ہیں تا کہ دعوت اس انداز سے پیش کی جائے کہ وہ مخاطب کو اپنے ذہن سے قریب تر معلوم ہو اور اس کو قبول کرنے میں آسانی ہو۔

خود آزمائی

1۔ دعوت دین میں داعی کے کردار کی اہمیت اجاگر کریں۔

2۔ داعی کن ایمانی اوصاف کا حامل ہو قرآن و احادیث کی روشنی میں بیان کریں۔

---

① سورۃ البقرہ ۲:۲۵۸

3۔ داعی کے اخلاقی اوصاف بیان کریں۔

4۔ داعی کن داعیانہ اوصاف کا حامل ہو؟ وضاحت کریں۔

5۔ داعی کے کلام کی نمایاں خصوصیات بیان کریں۔

6۔ داعی کو مدعو و مخاطب کی نفسیات کا کس قدر لحاظ کرنا چاہیے؟ بیان کریں۔

ماخذ مصادر

1۔ دعوت دین اور اس کا طریقہ کار — مولانا امین احسن اصلاحی

2۔ منہج دعوت نبوی ﷺ — شوکت علی شوکانی

3۔ دعوت و ارشاد — فریدہ یوسف

یونٹ نمبر 3

دعوت: منہج واصول

تالیف:

ڈاکٹر محمد سجاد

فہرست

	صفحہ نمبر
یونٹ کا تعارف	77
یونٹ کے مقاصد	78
1۔ اصولِ دعوت کی اہمیت	79
2۔ قرآنی اصول دعوت	80
2.1 حکمت	80
2.2 موعظۂ حسنہ	87
3۔ جدال احسن	88
3.1۔ مجادلہ کی ضرورت واہمیت	91
3.2۔ مجادلہ کی اقسام اور بنیادی اصول	95
4۔ دعوت میں تدریج	106
5۔ دعوت و تبلیغ میں رفق و نرمی	109
6۔ عدم اکراہ	110
7- آسانی اور سہولت کی تلقین	112
8- دعوت کی ناکامی کے اسباب	116
8.1۔ علمی اسباب	116
8.2۔ عملی اسباب	118
خود آزمائی	122
ماخذ و مصادر	122

یونٹ کا تعارف

دعوتِ دین واشاعت اسلام کی جس قدر اہمیت ہے اتنی ہی اہمیت اس بات کی بھی ہے کہ داعی کو یہ معلوم ہو کہ کہ طریق و اُصول دعوت اور طریقہ کیا ہیں ؟تا کہ دعوت دین کا یہ کام بہتر ،احسن اور موئثر انداز سے انجام پا سکے اور اس بات کو بھی سمجھا جائے اور اس کے لیے تربیت حاصل کی جائے کہ ایسا کون سا منہج اور اسلوب اختیار کیا جائے کہ داعی کی بات مدعو کے دل میں گھر کر جائے اور وہ بہ رضا ور غبت اس پیغام دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

انسان اپنی فطرت و جبلت کے اعتبار سے تین طرح کی کیفیات سے دوچار رہتا ہے۔ وہ یہ ہیں علمی ، فکری اور جذباتی کیفیات۔ ان میں سے جو کیفیت بھی دوسری کیفیات پر غالب رہتی ہے ،انسانی شخصیت کا وہی عنوان ٹھہرتی ہے۔ طبیعت کی پہلی کیفیت ''علمی'' ہے۔ علمی ذوق جب طبیعت پر غالب رہتا ہے تو انسان علمی موضوعات پر دلائل کی صحبت میں رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ دلائل کی نوعیت ،اقسام اور ماخذ کے معاملات میں گم رہنا اس کی عادت بن جاتی ہے۔ دلائل کی ترتیب وتدوین سے اسے ایک طرح کا اطمینان قلب ملتا ہے۔ دوسروں میں بھی صرف انہیں ملنا پسند کرتا ہے جنہیں دلائل دینا اور دلائل پر مبنی گفتگو کرنا آتی ہو۔ایسی طبیعتوں کے افراد کے لیے اسلام کی علمی و سائنسی پیشکش بہتر ہوتی ہے۔ جب تک علم کے میدان میں اسلام کے کارنامے حوالہ جات کے ساتھ ان کے سامنے پیش نہ کیے جائیں،اپنی طبیعت کے ہاتھوں مجبور یہ لوگ ان حقائق کو قبول کرنے میں دِقت محسوس کرتے ہیں۔ایسے لوگوں سے گفتگو کے لیے مبلغ کی لازماً تاریخ، قانون اور عقائد کے علمی پہلو پر مضبوط ترین گرفت ہونا ضروری ہے۔

طبیعت کی دوسری کیفیت ''فکری'' ہے۔ فکری ذوق انسان کو فلسفیانہ طرزِ فکر کی جانب راغب کرتا ہے۔ ایسے لوگ دلائل کی بجائے تصورات کی صحبت میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ لوگ دلائل کی بجائے ان تصورات کی جانچ پڑتال کرتے ہیں جہاں سے دلائل جنم لیتے ہیں۔ یہ تخیل پسند لوگ ہوتے ہیں اور شعوری سطح پر اپنے ارد گرد کے ماحول سے مشاہدے کی بنیاد پر بہت سے سوالات اکٹھے کر کے ان پر سوچ بچار کرنا پسند کرتے ہیں۔ فکری ذوق دلائل کی بجائے حکمت پر نظر رکھتا ہے۔ایسے لوگوں کے سامنے اسلام سے متعلقہ فکری موضوعات پیش کرنا بہت مفید ہے۔ اسلامی فکر جب تک تقابلی انداز سے پیش نہیں کی جائے گی،اس وقت تک اس کی عظمت نکھر کر سامنے نہیں آئے گی۔

طبیعت کی تیسری کیفیت ''جذباتی''نوعیت کی ہے۔ اس کیفیت کے لوگ اپنے جذبات کی تسکین چاہتے ہیں۔انہیں نہ تو

دلائل کی ترتیب وتدوین سے کوئی غرض ہوتی ہے اور نہ ہی یہ تصورات کی جستجو کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ یہ تو سب ایک ہی چیز کے عادی ہوتے ہیں کہ کسی طرح شرابِ عشق مل جائے تاکہ ساری زندگی مستی میں گزر جائے۔ایسے لوگوں کے سامنے اسلام کی تاریخِ عشّاق پیش کرنا مفید رہتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حضور صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلقاتِ عشق و محبت ان لوگوں کے نزدیک علم الکلام سے زیادہ قابل اعتبار ٹھہرتے ہیں۔ایسے لوگوں کے سامنے اسلام کی مؤثر دعوت کے لیے مبلّغ کو نہ صرف خود اس موضوع پر گہری تحقیق حاصل ہو بلکہ وہ خود بھی اس شرابِ عشق سے حالت مستی میں ہو۔ دعوت اسلام میں قابل ذکر نتائج حاصل نہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کی طبیعتوں کو پہچانے بغیر دعوت دین پیش کررہے ہیں۔

دعوت کے لیے اسلوب، منہج اور طریقۂ عمل کی سب سے پہلی رہ نمائی قرآن مجید کی اُس آیت میں ملتی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کو اپنے رب کی طرف حکمت و دانائی اور موعظۂ حسن اور مجادلہ احسن کے ساتھ بلایا جائے اور اپنی بات ان تک خوب صورت اور دل کش انداز میں پہنچائی جائے :

﴿اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ﴾ النحل: ۱۲۵

اس آیت میں نہایت واضح طور پر دعوت و تبلیغ کے بنیادی اصول بیان کئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ داعی کو چاہیے کہ وہ حکمت و تدبر، فہم و دانائی اور طریقِ حسن کا رویہ اختیار کرے۔اس یونٹ میں دعوت و تبلیغ کا طریق کار، منہج و اسلوب اور اصول دعوت پر بحث کی گئی ہے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ دعوت دین میں اصول و منہج دعوت کی اہمیت جان سکیں۔
2۔ قرآنی اصول دعوت کا مطالعہ کر سکیں۔
3۔ مجادلہ کی اقسام اور بنادی اصولوں سے آگاہی حاصل کر سکیں۔
4۔ دعوت دین میں تدریج کی اہمیت و تاثیر جان سکیں۔
5۔ دعوت و تبلیغ میں ناکامی کے اسباب جان سکیں۔

1۔اصولِ دعوت کی اہمیت

دعوت کے دو بنیادی کردار ہیں، ایک داعی اور دوسرا مدعو۔ تاہم دعوت کی کامیابی کا مکمل انحصار داعی کی ذات پر ہے کیونکہ دعوت کے مضامین خواہ کتنے ہی پر کشش کیوں نہ ہوں، اگر داعی کا طریقِ دعوت سلیقے پر مبنی نہیں ہے اور وہ مخالف کو حالات کے مطابق مختلف اسالیب اختیار کر کے بات سمجھانے کی قدرت نہیں رکھتا تو اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ جو بات ایک پہلو سے سمجھ نہیں آتی وہی بات جب دوسرے انداز میں سامنے آتی ہے تو دل میں اتر جاتی ہے۔ مبلغ کی کامیابی صرف اسی بات میں ہے کہ دوست دشمن سبھی پکار اٹھیں کہ تونے ابلاغ کا حق ادا کر دیا ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں تصریف آیات اسی چیز کا نام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾[1]

(اور اسی طرح ہم اپنی دلیلیں مختلف اسالیب سے پیش کرتے ہیں، تاکہ ان پر حجت قائم ہو جائے اور وہ بول اٹھیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا۔ تاکہ ہم جاننے والوں کے لیے اچھی طرح واضح کر دیں)۔

قرآن مجید کے اولین مخاطب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ ہیں۔ اس لیے قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے صحابہ کرامؓ کو دعوت کے طریقِ کار اور اسالیب کی تعلیم دی۔ یہ ایک ایسی انفرادیت ہے جو اسلام کے علاوہ کسی بھی الہامی و غیر الہامی مذہب کو حاصل نہیں کہ اس نے اپنے پیروکاروں کو باقاعدہ دعوت و تبلیغ کے اصول پوری شرح و بسط سے بتائے ہوں۔

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو سچائی کے قبول کرنے کی دعوت دینی چاہئے۔ دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ وہ مذہب بھی جو الہامی اور تبلیغی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لیے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے۔ لیکن صحیفۂ محمدی ﷺ نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا کہ پیغامِ الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبولِ حق کی دعوت کس طرح دی جائے"[2]

---

1 سورۃ الانعام، ۶:۱۰۵

2 ندوی، علامہ، سید سلیمان (م ۱۹۵۳ء)، سیرت النبی ﷺ، ۹۱/۴

2۔ قرآنی اصول دعوت

کار دعوت اس وقت تک موثر اور کار گر ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اس کے بنیادی اصول کا تعین نہ کر لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے دعوت کا حکم دینے کے ساتھ اس کی اہمیت کے پیش نظر بنیادی اصول دعوت کی تعیین بھی خود ہی فرمادی ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اصول دعوت کو بیان کیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید نے اپنے مخصوص معجزانہ اسلوب کے مطابق دعوت کے اصول ان الفاظ میں بیان فرمائے ہیں:

﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾[1]

(بلاؤ (لوگوں کو) اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت کے ساتھ اور عمدہ وعظ کے ذریعے اور ان سے مکالمہ کرو اچھے طریقے سے بے شک تیرا رب جانتا ہے جو گمراہ ہے اس کے دین سے، اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی جانتا ہے۔)

اس آیت مقدسہ میں دعوتِ دین کے تین بنیادی اصول بیان ہوئے ہیں۔ حکمت، موعظہ حسنہ اور مجادلہ بطریقِ احسن۔

2.1۔ حکمت کا مفہوم، تعریفات اور دعوت میں اس کی اہمیت

لفظ 'حکمت' مادہ 'ح ک م' سے مشتق ہے۔ اردو میں عربی سے ماخوذ ہے اور بطور اسم مستعمل ہے اسی مادہ سے دوسرا اسم 'حکم' ہے۔

"لسان العرب" میں حکم کے معنیٰ 'العلم والفقه والقضاء بالعدل[2]

یعنی علم، سوجھ بوجھ اور عدل کے مطابق فیصلہ کے آئے ہیں۔

"تاج العروس" میں اس کے معنیٰ ہیں:

القضاء فی الشیء '[3] یعنی کسی معاملہ کا فیصلہ کرنا۔

لفظ 'حکمت' بھی مادہ 'ح ک م' سے اسم ہے "لسان العرب" میں اس کے معنیٰ ہیں

---

1 سورۃ النحل ۱۶: ۱۲۵

2 ابن منظور، لسان العرب، ۱۲ /۱۴۱

3 زبیدی، تاج العروس، ۳۱ /۵۱۰

'معرفة أفضل الأشياء بأفضل العلوم'[1]

یعنی اعلیٰ چیزوں کی پہچان بہترین علوم کے ذریعہ سے حاصل کرنا۔ دوسرے معنی عدل کے بتائے گئے ہیں۔ "تاج العروس" میں حکمت سے مراد ہے۔

'العلم بحقائق الأشياء على ما هي عليه والعمل بمقتضاها'[2]

یعنی اشیا کی حقیقت کو ان کی اصلیت کے مطابق جاننا اور اس علم کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنا ہے۔ حق کو علم و عمل، دونوں کے لحاظ سے درست قرار دینا اور عدل سے فیصلہ کرنا بھی حکمت قرار دیا گیا ہے۔

علامہ سید شریف جرجانی نے حکمت کے حسب ذیل تعریفات کی ہیں:

۱۔ قوت عقلیہ جو افراط و تفریط کے درمیان متوسط ہو۔

۲۔ انسان کا اپنی طاقت کے مطابق نفس الامر میں حق اور صدق کو حاصل کرنا۔

۳۔ ہر وہ بات جو حق کے موافق ہو حکمت کہلاتی ہے اور اس لفظ کا اطلاق اس علم پر بھی ہوتا ہے جس کے ساتھ عمل پایا جائے۔

۴۔ ہر چیز کو اپنے مقام پر رکھنا حکمت ہے۔

۵۔ جس چیز کا انجام اچھا ہو، وہ حکمت ہے۔[3]

علامہ راغب اصفہانی علم اور عقل سے حق کی مطابقت کو حکمت قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالی کی حکمت کا معنی ہے اشیاء کی معرفت اور ان کو مضبوط طریقہ سے پیدا کرنا اور انسان کی حکمت ہے موجودات کی معرفت اور نیک کام کرنا۔"[4]

امام رازی رحمہ اللہ نے حکمت کی تعبیر قول و عمل کی درستی اور ہر شے کو اس کا مقام دینے سے کی ہے۔[5]

مولانا حمید الدین فراہی نے حکمت کے معانی کا تعین اہل عرب کے استعمالات کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے

---

1 ابن منظور، لسان العرب، ۱۴۰/۱۲

2 زبیدی، تاج العروس، ۵۱۰/۳۱

3 جرجانی، کتاب التعریفات ۱۲۴/۱

4 اصفہانی، راغب، علامہ (م ۵۰۲ھ)، المفردات، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۲۰۰۲ء، ج: ۱، ص: ۱۶۷،

5 رازی، مفاتیح الغیب ۱۸۹/۲

مطابق اہل عرب حکمت کا اطلاق اس قوت پر کرتے تھے جو عقل ورائے کی درستی اور اس سے پیدا ہونے والی اخلاقی شرافت کی جامع ہو۔ اسی لیے وہ ایک دانش مند اور مہذب آدمی کو حکیم کہتے تھے۔ لہٰذا مولانا حمید الدین فراہی نے حکمت کی تعبیر اس قوت سے کی ہے جس کے باعث آدمی حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اس قوت کے اثرات کلام کی حقانیت، اخلاق کی پاکیزگی اور حسن ادب کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں[1]

علامہ آلوسی حکمت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

الحجۃ القطعیۃ المذیحۃ للشبہ۔[2]

"ایسی قطعی دلیل جس سے شبہات کے بادل چھٹتے چلے جائیں۔"

پھر فرماتے ہیں:

انھا الکلام الصواب الواقع من النفس اجمل موقع۔[3]

مناسب جگہ اور وقت کا انتخاب، مدعو کے جذبات کا احترام اور اس کی عزت نفس کی پاسداری حکمت کے مقتضیات ہیں۔

مولانا حمید الدین فراہی حکمت کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حکمت کی بات عقل و دل کے نزدیک نہایت بدیہی اور واضح ہوتی ہے۔ یہ اس قدر دل میں اتر جانے والی ہوتی ہے کہ اس کو ثابت کرنے کے لیے مزید دلائل کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ حکمت ایک نور ہے۔ جس طرح روشنی سے ارد گرد کی تمام چیزیں جگمگا اٹھتی ہیں، اسی طرح حکمت کے نور سے آدمی کا علم منور ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح آگ کا اثر حرارت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور ہر شخص اس کو محسوس کر لیتا ہے، اسی طرح حکمت بھی اپنے اثرات سے پہچانی جاتی ہے۔ جب یہ کسی شخص کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر حق شناسی کا ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان سے جو بات نکلتی ہے حق نکلتی ہے اور اس سے جو فعل صادر ہوتا ہے، ٹھیک صادر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حکیم آدمی کا دل اپنے اندر رفعت محسوس کرتا ہے، اس کا کلام نہایت دل نشین ہوتا ہے، اس کا عمل نیکی پر مبنی ہوتا ہے اور وہ اعلیٰ اخلاق کا مجسمہ ہوتا

---

1 فراہی، حمید الدین، مولانا، حکمت قرآن (اردو)، ص ۲۹

2 آلوسی، سید محمود، شہاب الدین، روح المعانی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۲۰۰۵ء، ج: ۱۴، ص: ۲۵۴

3 ایضاً، ج: ۱۴، ص: ۲۵۴

ہے۔امام فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک ایک حکیم کے اندر حق کی جستجو کا مادہ اور جانچ پرکھ کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ باطل میں سے حق کو چھانٹ لیتا ہے۔ حق میں جو نورانیت ہوتی ہے، اس کو حکیم کی فطرت کی بصیرت فوراً محسوس کر لیتی ہے۔ چونکہ اس کائنات کا سب سے بڑا حق اللہ تعالی کی وحدانیت پر بندے کا ایمان لانا ہے، اس لیے مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک ایک حکیم کی پہلی شناخت اس کا ایمان ہے۔ وہ اس حق کو پہچانے، اس پر اس کا دل مطمئن ہو جائے، وہ ہر باطل سے دست کش ہو جائے اور عمل صالح کو اختیار کرلے تو وہ، بلاشبہ ایک حکیم ہے۔ اگر وہ ایمان تک نہ پہنچ سکا تو دوسرے علوم وفنون میں اس کی مہارت کی بدولت اس کو حکیم قرار نہیں دیا جا سکتا۔[1]

تحصیل حکمت کے ضمن میں مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

انسان کی دو بنیادی صفات اس کی قوت فکر اور قوت ارادہ ہیں۔ قوت فکر کے ذریعے وہ ان نشانیوں سے استدلال کر سکتا ہے جن سے آفاق و انفس بھرے پڑے ہیں اور قوت ارادہ کی بدولت وہ خیر و سعادت کے کاموں کو اختیار کرتا ہے۔ حکمت اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو غور وفکر کے ذریعے سے حاصل ہونے والے علم اور ارادہ کی قوتوں میں موافقت پیدا کرلے۔ حکمت کا منبع انسان کے خارج میں نہیں ہوتا، بلکہ اس کی ذات کے اندر اور اس کی فطرت میں ہوتا ہے، اس لیے حکمت کے طالب کو اپنے نفس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے۔ حکمت کا تحمل یک بارگی نہیں ہوتا، بلکہ بتدریج ہوتا ہے۔ یہ عمل بالکل اسی طرح کا ہوتا ہے، جس طرح ایک نقشہ کے مطابق کسی عمارت کی تعمیر درجہ بدرجہ مکمل ہوتی ہے۔

مولانا فراہی رحمہ اللہ دل کے خشوع کو وہ دروازہ قرار دیتے ہیں جس کے راستے حکمت دل میں داخل ہو کر اس کو زندگی بخشتی ہے۔ خشوع رکھنے والے شخص کو یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا ایک مقصد کے تحت وجود میں آئی ہے، اس کو پیدا کرنے والا عادل اور پاکیزہ رب ہے، جبکہ انسان غلطی کا ارتکاب کرنے والا، بھٹک جانے والا اور سرکشی اختیار کرنے والا ہے۔ اس احساس سے آدمی میں خشیت پیدا ہوتی ہے، وہ خلوت و جلوت میں حدود الٰہی کی پابندی اختیار کرتا اور خواہشات نفس کی پیروی سے باز رہتا ہے۔ ان صفات سے اس کا قلب صاف اور حکمت کے نور سے مستنیر ہونے کے لیے تیار رہتا ہے۔ حصول حکمت کے لیے جو چیزیں نہایت اہم ہیں، وہ ذکر الٰہی، تلاوت قرآن، اللہ کے بندوں پر شفقت اور ان کے

---

1 فراہی، حمید الدین، مولانا، حکمت قرآن (اردو)، ص ۲۹

لیے جذبۂ ترحم ہیں۔ قرآن حکیم حکمت کا سب سے بڑا خزانہ ہے، لیکن اس کے اندر حکمت کے موتی تلاش کرنے کے لیے غور وتدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ حصول حکمت کی تگ ودو کے لیے انسان جو ذرائع بھی اختیار کرے، لیکن مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک اس کے حصول میں کامیابی اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے۔ حکمت اللہ تعالیٰ کی وہ عطائے خاص ہے جس کے سیکھنے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔[1]

الغرض حکمت کا لفظ جن مفاہیم کی ترجمانی کرتا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ گفتگو کا موضوع بالکل واضح ہو، بات دلائل سے مزین ہو، اندازِ کلام ایسا ہو کہ ہر فہم وشعور رکھنے والا اسے دل سے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ بات کو انتہائی دانشمندی سے خوبصورت الفاظ میں بیان کیا جائے، مدعو کی علمی وذہنی سطح کو ملحوظ خاطر رکھا جائے اور انداز ایسا ہو جو مخاطب کے شبہات کو زائل کر دے۔

دعوت میں حکمت سے مراد یہ بھی ہے کہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر موقع محل کو دیکھ کر بات کی جائے۔ فرق مراتب اور مخاطب کی نفسیات کو مد نظر رکھا جائے۔ مخاطب کے جذبات کو ابھارا (Apeal) جائے، گمراہیوں اور برائیوں کا محض عقلی حیثیت سے ہی ابطال نہ کیا جائے بلکہ ان کے خلاف انسان کے اندر جو فطری نفرت وعداوت پائی جاتی ہے اس کو ابھارا جائے۔ ایسے انداز اور طریقہ کار اختیار کئے جائیں جن سے قلب واذہان مانوس ہوں، جن سے تحریک وتشویق پیدا ہو اور دعوت میں خیر خواہی، تالیف قلب اور باہم محبت کی فضا ہو۔ ایسی تڑپ اور دلسوزی سے دعوت دی جائے کہ مخاطب یہ سمجھے اور محسوس کرے کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے لیے تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اس کی بھلائی چاہتا ہے۔ یہ سب ایسے امور ہیں جو دعوتی حکمت عملی میں شامل ہیں۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ حکمت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں "کسی کام کو اس کے مناسب طریقہ پر اور اس کے مناسب وقت میں انجام دینے کو حکمت کہتے ہیں۔[2]

علامہ ابن سعدی رحمہ اللہ (ادع الیٰ سبیل ربك بالحکمة) کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں "داعی کو چاہیئے کہ وہ مدعو کو اس کی حالت اس کے فہم اور اس کے قبول کرنے اور مان لینے کی صلاحیت کے مطابق دعوت پیش کرے، اور حکمت کے امور میں یہ سب امور شامل ہیں کہ علم کے ساتھ دعوت دی جائے، اہم چیزوں سے بات کا آغاز

---

1 فراہی، حمید الدین، مولانا، حکمت قرآن (اردو)، ص ۱۳-۲۵

2 ابن قیم، مدارج السالکین، ص ۹۲

کیا جائے، پہلے آسان باتیں رکھی جائیں، پہلے ایسی باتیں رکھی جائیں جو لوگ جلدی قبول کرنے والے ہوں، اور نرم گفتاری سے کلام کیا جائے۔ لیکن اگر حکمت کے یہ مذکورہ طریقے کارگر ثابت نہ ہوں تو پھر ایسی گمبھیر صورت حال میں عمدہ نصیحت کے ذریعہ دعوت پیش کی جائے، اور عمدہ نصیحت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بھلائیوں کا حکم دینے اور برائیوں سے روکنے میں ترغیب وترہیب کا طریقہ استعمال کیا جائے۔

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾[1]

(کہیں کہ یہ میرا طریقہ ہے میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں بصیرت و دانائی کے ساتھ اور میرے ماننے والے (صحابہ کرام اور صلحاء امت) بھی، اور اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

آیت ہذا میں جو لفظ بصیرت استعمال ہوا ہے یہ حکمت کے معنی میں ہی ہے۔

﴿يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾[2]

(جس کو حکمت" عطا کر دی گئی گویا کہ اسے خیرِ کثیر دے دی گئی۔)

حکمت "علم نافع، فہم دین، صوابدید، درست ذہنی سمت کا نام ہے، "حکمت" اچھی سوچ، عمدہ رائے، ذہنِ ثاقب، اور بار آور فیصلے کو ہی کہتے ہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہو جائے حکمت اس کے اقوال وافعال سے چھلکنے لگتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کی زبان کو صحیح سمت میں گامزن کر دیتا ہے، اور دنیاوی بیماریوں کے بارے میں بصیرت نوازتے ہوئے ان کا علاج بھی عطا کر دیتا ہے۔ دعوت دین میں حکمت کا تقاضا ہے کہ ترجیحات کو بھی ترتیب دی جائے، پہلے سب سے اہم پھر اس کے بعد اس سے کم کو ترجیح دی جائے، چنانچہ پہلے عقیدہ، پھر عبادات، اور آخر میں اخلاقیات، فرائض کو نوافل پر مقدم کیا جائے، ٹکراؤ کے وقت ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر قربان کر دیا جائے، ایسے ہی ازالہ فساد کو حصول مفاد پر مقدم کیا جائے گا، اسی طرح ترجیحات کو نافذ العمل کرنے کے لیے بتدریج چلنا بھی حکمت اور عقلمندی کا حصہ ہے حکمت کا تقاضا ہے کہ قوت اور کمزوری کے حالات میں فرق کیا جائے، امن اور جنگی حالات میں امتیاز رکھیں، حق کا اعتراف کرنے والے کے لئے اچھے انداز سے نصیحت، جبکہ متلاشیانِ حق کے ساتھ اچھے انداز سے علمی مباحثہ حکمت کا درجہ رکھتا

---

1 سورۃ یوسف ۱۲: ۱۰۸

2 سورۃ البقرۃ ۲: ۲۶۹

ہے، کسی بھی چیز کے متعلق رائے قائم کرتے ہوئے افراط و تفریط کے درمیان میانہ روی اختیار کرنا عین حکمت ہے۔ جس وقت جذبات کا غلبہ ہو، فرطِ جوش پایا جائے تو حکمت کھسکنے لگتی ہے اور افراط و تفریط اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ ایک غیر تربیت یافتہ داعی، دعوتِ دین کے لیے کس قدر غیر موزوں ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے پیر محمد کرم شاہ الازہری فرماتے ہیں:

''ایک نادان اور غیر تربیت یافتہ مبلغ اپنی دعوت کے لیے اس دعوت کے دشمنوں سے بھی زیادہ ضرر رساں ہو سکتا ہے اگر اس کے پیش کئے ہوئے دلائل بودے اور کمزور ہوں گے، اگر اس کا اندازِ خطابت درشت اور معاندانہ ہو گا، اگر اس کی تبلیغ اخلاص وللہیت کے نور سے محروم ہو گی تو وہ اپنے سامعین کو اپنی دعوت سے متنفر کر دے گا۔ کیوں کہ اسلام کی نشر واشاعت کا انحصار تبلیغ اور فقط تبلیغ پر ہے۔ اس کو قبول کرنے کے لیے نہ کوئی رشوت پیش کی جاتی ہے اور نہ جبر واکراہ سے کام لیا جاتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ایمان، ایمان ہی نہیں جس کے پسِ پردہ کوئی دنیوی لالچ یا خوف وہراس ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے محبوب مکرم کو دعوتِ اسلامی کے آداب کی تعلیم دی''۔ [1]

گویا دعوت کی کامیابی میں مرکزی کردار داعی کا ہے، داعی جس قدر تربیت یافتہ اور انسانی نفسیات کا عالم ہو گا اسی قدر اس کی دعوت مؤثر ہو گی۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے مؤثر ہونے کی ایک اہم وجہ آپ ﷺ کا ذاتی کردار تھا تو دوسری بنیادی وجہ آپ ﷺ کا اسلوبِ دعوت تھا۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ مخاطبین کی ذہنی استعداد، میلانات، رجحانات اور ان کے خاندانی و علاقائی پس منظر کو سامنے رکھ کر دعوت کا کام کیا۔ دعوتِ دین کا یہ وہ اسلوب ہے جو اللہ تعالیٰ نے براہ راست اپنے حبیب مکرم ﷺ کو سکھایا اور آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو دعوتِ دین کے ان ہی مختلف اسالیب کی تعلیم دی اور پھر صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کی ہدایات اور طرزِ عمل کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ ابو وائل سے روایت ہے:

''كان عبدالله يذكّر النّاس في كل خميسٍ، فقال له رجل يا أبا عبدالرحمن لوددت أنك ذكّرتَنا كلَّ يومٍ، قال أما إنه يمنعني من ذالك أني أكره أن أملّكم وإني أتخوّلكم بالموعظة كما كان النبي ﷺ يتخوّلنا بها مخافة السآمة علينا'' [2]

''عبداللہؓ بن مسعود لوگوں کو ہر جمعرات کو وعظ سنایا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے کہا: اے ابو عبدالرحمنؓ! میری

1 محمد کرم شاہ، پیر، الازہری (م ۱۹۹۷ء) ''ضیاء القرآن''، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، ۶۱۷/۲

2 البخاری، الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب من جعل لاھل العلم ایاماً معلومة،

خواہش ہے کہ آپؓ روزانہ وعظ کیا کریں، تو انہوں نے فرمایا میں ایسا اس وجہ سے نہیں کرتا کہ کہیں تم پر بوجھ نہ بن جاؤں۔ میں بھی اسی طرح ناغہ کر کے تمہیں نصیحت سناتا ہوں جس طرح رسول اللہ ﷺ ہم کو وقفہ کر کے نصیحت سنایا کرتے تھے تاکہ ہم بیزار نہ ہو جائیں"۔

نفوذ اور اثر پزیری ایک ایسا عمل ہے، جس کا انحصار کئی باتوں پر ہے۔ مثلاً جو بات پیش کی جارہی ہے وہ انسان کے ذہن و مزاج سے کس درجہ ہم آہنگ ہے اور اُسے کس قدر اپیل کرنے والی ہے یا جس کے سامنے بات پیش کی جارہی ہے وہ خود کیسا ہے، کن حالات سے دوچار ہے، کن مسائل میں گرفتار ہے، اس کے دل کی زمین کیسی ہے اور وہ کن افکار وخیالات کا حامل اور کن عقائد کا ماننے والا ہے اور یہ بھی کہ اس کا خاندانی اور معاشرتی بیک گراؤنڈ (پس منظر) کیا ہے؟ اس لیے کہ کسی فرد کے ذہن و دل میں نفوذ کرنا اور اس کے افکار وخیالات پر اثر انداز ہونا حکیمانہ کوششوں کا طالب اور ضروری تیاریوں کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس بات کو ہم ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ ایک کسان جب زمین میں کوئی بیج ڈالتا ہے تو بیج ڈالنے سے پہلے وہ ضروری تیاریاں کرتا ہے۔ پہلے زمین سے جھاڑ جھنکاڑ صاف کرتا ہے، پھر زمین کو کاکوڑ کر مٹی کو نرم کرتا اور کنکر پتھر ہٹاتا ہے۔ جب مٹی نرم اور بھربھری ہو جاتی ہے تو اس میں بیج ڈالتا ہے۔ پھر آبیاری کر کے نتیجے کا انتظار کرتا ہے۔ بیج اگر صحیح و درست ہوتا ہے تو وہ زمین کا سینہ چیر کر کونپل نکالتا اور برگ و بار لاتا ہے اور اس برگ و بار لانے کے مرحلے میں بھی اس کی مسلسل نگہداشت، آبیاری اور منفی اثرات سے بچانے کے لیے بڑی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب کہیں جاکر وہ اپنے ثمرات سے کسان کو فیض یاب کرتا ہے۔ یہی صورت انسانوں میں نفوذ اور اثر پزیری کی بھی ہے۔ اگر ضروری تیاریوں کے بغیر انسانوں کو کچھ اچھی باتیں بتا بھی دی جائیں تو ان کے وقتی اثرات ہی ہوتے ہیں، جو بہت جلد ذہنوں سے محو ہو جاتے ہیں اور زندگی پر ان کے اثرات ظاہر نہیں ہوتے۔ ان کے فکر و نظر میں تبدیلی کا کوئی عمل واقع نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے دعوت کے کام میں حکمت کو ملحوظ رکھنا اوّلین شرط ہے۔

2.2۔ موعظۂ حسنہ

موعظۂ حسنہ ہے جس کے معنی کسی کی خیر خواہی کی بات کو اس طرح اس کے سامنے بیان کرنے کے ہیں جس کا ناگوار حصہ بھی اس کے لئے قابل قبول ہو جائے اور مخاطب کا دل اس کی قبولیت کے لئے نرم ہو جائے۔ "الحسنہ" کے معنی ہیں کہ اس کا عنوان بھی ایسا ہو کہ جس سے مخاطب کا قلب مطمئن ہو جائے. موعظۂ حسنہ سے مراد میٹھی زبان اور نرم گفتگو، دلوں کو موہ لینے والا انداز بیان ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّ مَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ صَدَقَةٍ يَّتۡبَعُهَاۤ اَذًى﴾[1]

"ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے، جس کے پیچھے دکھ ہو۔"

موعظۂ حسنہ سے مراد یہ بھی ہے کہ داعی صرف خشک دلائل کے انبار لگانے کی بجائے مدعو کے لیے سراپا خلوص و محبت بن جائے تاکہ داعی کا ایک ایک لفظ اور ہر ہر ادا مخاطب کے لیے نمونہ بن جائے۔ امام راغب اصفہانی موعظۂ حسنہ کے مفہوم کے متعلق لکھتے ہیں:

هو التذكير بالخير فيما يرق له القلب۔[2]

"وہ نصیحت جو دلوں کو موم کردے۔"

داعی کے کلام میں نرم خوئی، دلسوزی اور حسن خلق کی جھلک نمایاں ہونی چاہیے۔ مخاطب کے جذبات و احساسات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اگر مخاطب کے جذبات ایک بات کے قائل ہو جائیں تو عقل خود بخود وہ بات ماننے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ کسی کام کی ترغیب کے لیے اچھے اجر کی مثال دینا یا کسی کام سے باز رکھنے کے لیے سزا اور عذاب سے ڈرانا بھی موعظۂ حسنہ میں شامل ہے۔

3۔ جدال احسن

لفظ مجادلہ باب مفاعلہ کے وزن پر اسم مصدر ہے اور اس کا مادہ اشتقاق 'جدل' ہے۔ صاحب لسان العرب لکھتے ہیں:

الجدل: مقابلة الحجة بالحجة والمجادلة: المناظرة والمخاصمة والمراد به فى الحديث الجدل على الباط وطلب المغالبة به لاظهار الحق فان ذالک محمود لقوله عزوجل: وجادلهم بالتى هى احسن۔[3]

---

1 سورۃ البقرہ ۲: ۲۶۳

2 اصفہانی، ابوالقاسم حسین بن محمد راغب، المفردات، ، ج: ا، ص ۵۶۴

3 ابن منظور، محمد بن مکرم، افریقی، لسان العرب، ج: اا، ص: ۱۲۶، ۱۲۵

''جدل سے مراد دلیل کا مقابلہ دلیل سے کرنا ہے اور مجادلہ سے مراد مناظرہ اور مخاصمہ ہے اور حدیث پاک کے مطابق اس کا مفہوم باطل کے خلاف دلیل قائم کرنا ہے اور اس کے ذریعے غلبہ واظہار حق مطلوب ہوتا ہے اور یہ (اصلاً) محمود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان سے بطریق احسن مجادلہ کیجئے۔''

المفردات میں بھی جدال سے مراد مد مقابل پر بحث ومناظرہ کے ذریعے غلبہ حاصل کرنا' لیا گیا ہے۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

الجدال المفاوضة على سبيل المنازعة والمغالبة۔[1]

تاج العروس میں مجادلہ سے مراد مخاصمہ لیا گیا ہے اور شرعی اصطلاح کے اعتبار سے اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

مقابلة الادلة لظهور أرجحها و هو محمود ان كان للوقوف على الحق والا فخذموم۔[2]

''اپنے موقف کی ارجحیت کے اظہار کے لیے دلائل پیش کرنا (مجادلہ شرعی) ہے۔ اگر یہ حق پر آگاہی کے لیے ہو تو محمود ہے ورنہ مذموم۔''

مجادلہ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

الدلائل التي يكون المقصود من ذكرها الزام الخصوم وافحامهم وذالك هو الجدل۔[3]

''ایسے دلائل جن کے بیان کا مقصد مد مقابل (کے دلائل) کا رد کرنا اور جواب دینا ہو اسے جدل کہتے ہیں۔''

تفسیر ابن کثیر میں ہے:

وجادلهم بالتي هي احسن اى من احتاج منهم الى مناظرة وجدال، فليكن بالوجه الحسن برفق ولين وحسن خطاب۔[4]

''وجادلھم بالتی ھی احسن سے مراد یہ ہے کہ جو بحث ومناظرہ کی نوبت کو پہنچے تو اسے چاہیے کہ اچھے طریقے، نرمی، ہمدردی اور حسن خطاب سے بحث ومناظرہ کرے۔''

---

1 اصفہانی، ابو القاسم حسین بن محمد راغب، المفردات، ص: ۹۴

2 زبیدی، سید محمد مرتضیٰ، تاج العروس، دار الفکر بیروت، لبنان، مطبوعہ ۲۰۰۵ء، ج: ۱۴، ص: ۱۰۲

3 رازی، فخر الدین محمد بن عمر، التفسیر الکبیر، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، طبعہ ثانیہ ۲۰۰۴ء، ج: ۱۰، ص: ۱۱۱

4 ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، تفسیر القرآن العظیم، دار ابن حزم، بیروت، لبنان، طبع اول ۲۰۰۲ء، ج: ۲، ص: ۱۶۶۰

اور التحریر والتنویر میں ہے:

والمجادلة الاحتجاج لتصويب رأي وابطال ما يخالفه أو عمل ذالك۔[1]

"اور مجادلہ سے مراد تصویب رائے اور مخالف کے قول یا عمل کے ابطال کے لیے دلائل دینا مجادلہ ہے۔"

مجادلہ کے لفظی و اصطلاحی معانی کے متعلق درج ذیل نکات اخذ ہوتے ہیں۔

۱۔ مجادلہ کا مفہوم دلیل کے مقابل دلیل قائم کرنا ہے۔

۲۔ مجادلہ میں مد مقابل دلائل کا رد حق کی آگاہی اور تصویب رائے کے لئے ہوتا ہے۔

۳۔ مجادلہ کو عموماً بحث و مناظرہ کے معانی میں لیا گیا ہے۔

مجادلہ کے مفہوم میں بڑی جامعیت ہے۔قرآن کریم میں کئی مقامات پر مجادلہ کا ذکر کیا گیا ہے۔مفسرین نے متعلقہ آیات کے تحت مجادلہ کے مفہوم کی وضاحت میں اس کے مترادف الفاظ، مناظرہ، مباحثہ، خاصمہ، مفاوضہ، استعمال کیے ہیں۔آیات مجادلہ میں غور کیا جائے تو درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱۔قرآن کریم میں مطلق مجادلہ کا حکم نہیں دیا جارہا بلکہ مجادلہ احسن کا حکم دیا جارہا ہے۔

۲۔قرآن کریم میں مجادلہ کے بارے میں تاکید بالامر موجود ہے اور حکیم کا کوئی امر حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

۳۔مجادلہ کو دعوت کے انتہائی اہم اور بنیادی اصولوں میں ذکر کیا گیا ہے۔

۴۔مجادلہ اصلاً محمود ہے ورنہ قرآن کریم میں اس کا حکم نہ دیا جاتا۔

۵۔مجادلہ کا حکم انبیاء کرام علیھم السلام کو دیا گیا ہے جو انسانیت کا افضل ترین طبقہ ہیں۔

۶۔داعیٔ اعظم ﷺ کو خصوصیت کے ساتھ جدالِ احسن کا حکم دے کر اصول دعوت میں مجادلہ کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔

چنانچہ آیات مجادلہ کی روشنی میں مجادلۂ احسن کا مترادف بحث، مباحثہ، مکالمہ زیادہ قرینِ قیاس ہے جبکہ مناظرہ کے مفہوم میں شدت پائی جاتی ہے۔البتہ مجادلہ کی انتہائی صورت کو مناظرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس سے مراد دلائل کا باہم تبادلہ ہے۔اگر حالات بحث و مباحثہ کے ہی متقاضی ہوں تو داعی کو چاہیے کہ وہ انتہائی خوش

---

1 ابن عاشور، محمد طاہر، التحریر والتنویر، موسسۃ التاریخ العربی، بیروت، لبنان، طبعہ اولی، ۲۰۰۰ء، ج: ۱۳

اسلوبی سے بحث کرے۔ بحث و تمحیص کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ مخاطب کو لاجواب کرنے کی بجائے اسے قائل کیا جائے۔ دلائل کے تبادلے میں انتہائی تحمل و بردباری کا مظاہرہ کیا جائے اور اپنی علمی برتری ثابت کرنے کی بجائے اپنی دعوت مخاطب کے دل میں اتارنے کی کوشش کی جائے۔ علامہ راغب اصفہانی کے نزدیک جدال کا مفہوم یہ ہے:

''کسی شخص کا دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے دلائل کا انبار پیش کرنا جدل ہے۔''[1]

اور میر سید شریف لکھتے ہیں:

''جو قیاس مقدمات مشہورہ اور مقدمات مسلمہ سے مرکب ہو اس کو جدل کہتے ہو۔''[2]

اور مفسر قرآن پیر محمد کرم شاہ الازہری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

''اگر بھٹکا ہوا راہی آمادہ پیکار ہو جائے اور بحث و مناظرہ تک نوبت پہنچ جائے تو تم احسن اور عمدہ طریقے سے مناظرہ کرو۔ اپنی علمی، برتری کے گھمنڈ میں تہذیب اور شائستگی کا دامن مت چھوڑو۔ فریق مخالف کو ہر قیمت پر نیچا دکھانے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارے پیش نظر فقط حق کی سربلندی ہو جب تک کوئی مبلغ ان خوبیوں سے متصف نہ ہو اسے اس میدان میں قدم نہ رکھنا چاہیے۔ اس معیار پر پورا اُترنے کے لیے علم وآگہی کی وسعتوں کے علاوہ مکارم اخلاق اور محاسن خصائل سے مزین ہونا بھی ضروری ہے اور یہ نعمت کسی صاحب دل کی صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔''[3]

3.1۔ مجادلہ کی ضرورت واہمیت

دعوتِ دین کے متعلق قرآن کریم نے جو بنیادی اصول وضوابط مقرر فرمائے ہیں۔ ان میں بنیادی طور پر حکمت، موعظہ حسنہ اور مجادلہ احسن کا ذکر ہے۔ اس اعتبار سے مجادلہ کی اہمیت مسلم ہے بلکہ دعوت کے مراحل میں بعض اوقات مجادلہ ناگزیر ہو جاتا ہے چونکہ دعوت کے مخاطبین میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور داعی کا واسطہ مختلف المزاج لوگوں سے پڑتا ہے لہٰذا پہلا اصول 'حکمت' علم دوست لوگوں کے لیے موزوں ہے۔ دوسرا اصول 'موعظہ حسنہ' عام لوگوں کے لیے مناسب ہے اور تیسرا اصول 'مجادلہ' بے دین اور گمراہوں کے لیے موافق ہے یعنی ایسے

---

1 اصفہانی، مفردات،، ج:ا، ص: ۱۱۷

2 جرجانی۔ سید شریف، التعریفات، ص: ۵۵

3 الازہری، محمد کرم شاہ، پیر (م ۱۹۹۸ء)، ضیاء القرآن، ج: ۲، ص: ۶۱۸

لوگوں کے ساتھ شائستہ اور مہذب طریقے سے مباحثہ ومکالمہ کیا جائے۔ان کا موقف سنا جائے اور دلائل سے اس کا رد کیا جائے۔

قرآن مجید بنیادی طور پر کتاب دعوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں دعوت دین کے جملہ اصول وآداب اور شرائط قیود کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ جہاں تک مجادلۂ احسن کا متعلق ہے اس کا نہ صرف حکم دیا گیا ہے بلکہ اس کے حدود وضوابط کو الگ بیان کیا گیا ہے تاکہ عمل دعوت میں جہاں مجادلہ کی ضرورت پیش آئے، اسے بہ حسن وخوبی سرانجام دیا جائے اور اس کے زیادہ سے زیادہ ثمرات سمیٹے جا سکیں۔ ذیل میں قرآنی تعلیمات کی روشنی میں مجادلہ کی ضرورت واہمیت کا جائزہ لیا جاتا ہے:

ا۔ مجادلہ بطور بنیادی اصول دعوت

﴿ اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ ﴾ [1]

"(اے محبوب ﷺ!) بلایئے (لوگوں کو) اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے اور عمدہ نصیحت سے اور ان سے بحث (ومناظرہ) اس انداز سے کیجئے جو بڑا پسندیدہ (اور شائستہ) ہو۔"

یہاں مجادلہ کو بنیادی اصول دعوت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور مجادلہ کا حکم دیتے ہوئے اس کی حدود وقیود کی طرف راہنمائی بھی کر دیا ہے یعنی یہاں مجادلہ سے مراد لڑنا جھگڑنا، گالی گلوچ دینا، طعنہ زنی کرنا اور باہم دست وگریباں ہونا نہیں بلکہ ایسا مجادلہ مراد ہے جو بطریق احسن ہو، تہذیب وشائستگی کے دائرے میں ہو، دلائل قطعی سے مزین ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مخاطب کی ذہنی وقلبی راہنمائی کا آئینہ دار ہو۔ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں مجادلہ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"یعنی اس [مجادلہ] کی نوعیت محض مناظرہ بازی اور عقل کشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو۔ اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں۔ اس کا مقصود حریف مقابل کو چپ کرا دینا اور اپنی زبان آوری کے ڈنکے بجا دینا نہ ہو بلکہ اس میں شیریں کلامی ہو۔ اعلیٰ درجہ کا شریفانہ اخلاق ہو، معقول اور دل لگتے دلائل ہوں۔ مخاطب کے اندر ضد اور بات پچ اور ہٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے۔ سیدھے سیدھے طریقے سے اس کو بات سمجھانے کی کوشش کی جائے

---

1 سورۃ النحل ۱۶: ۱۲۵

اور جب محسوس ہو کہ وہ کج بحثی پر اتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تا کہ وہ گمراہی میں اور زیادہ دور نہ نکل جائے۔"[1]

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بیان کردہ اصول مجادلہ کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ مجادلہ کی نوعیت اور مناظرہ بازی میں نمایاں فرق ہے۔

۲۔ مجادلہ میں محض عقل کے گھوڑے نہ دوڑائے جائیں۔

۳۔ مجادلہ کو ذہنی دنگل نہ بنایا جائے۔

۴۔ مجادلہ کا مقصود مد مقابل کو خاموش کرا دینا نہ ہو۔

۵۔ مجادلہ میں شیریں کلامی کا عنصر غالب ہو۔

۶۔ مجادلہ میں اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا جائے۔

۷۔ معقول اور دل لگتے دلائل ہوں۔

۸۔ مخاطب کے اندر ہٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے۔

۹۔ اگر محسوس ہو کہ مخاطب کج بحثی پر اتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

۲۔ مجادلہ کے ذریعے اہل کتاب کو دعوتِ اسلام

﴿وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتٰبِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْا آمَنَّا بِالَّذِيْ أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلٰهُنَا وَإِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾[2]

"اور (اے مسلمانو!) بحث مباحثہ نہ کیا کرو اہل کتاب سے مگر شائستہ طریقہ سے مگر وہ جنہوں نے ظلم کیا ان سے اور تم کہو ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف اور اتارا گیا تمہاری طرف اور ہمارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اس کے سامنے گردن جھکانے والے ہیں۔"

اس مقام پر اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ کے اصول وآداب سکھلائے جا رہے ہیں کہ تمہارا اسلوب تبلیغ شائستہ اور پسندیدہ

---

1 مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، جون ۲۰۰۶ء، ج: ۲، ص: ۵۸۲

2 سورۃ العنکبوت ۲۹: ۴۶

ہو، دلائل مضبوط ہوں، کلام میں خشونت کے بجائے حلاوت ہو، عقائد اسلام کی حقانیت اور دین کی صداقت کا واضح بیان ہو۔ اس کے بعد ان سے کلام کا آغاز قدر مشترک 'توحید' سے کیا جائے تاکہ ان میں سے سلیم الفطرت لوگ اسلام کی طرف مائل ہوں اور انہیں نور ہدایت نصیب ہو جائے۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''حسنِ مجادلہ کا طریقہ بتایا جا رہا ہے کہ تم انہیں پہلے ہی بیگانہ اور مد مقابل حریف بنا کر خطاب نہ کرو بلکہ انہیں یوں کہو کہ تمہارے انبیائے کرام توحید کا جو دین لے کر آئے تھے ہمارے نبی اکرم ﷺ بھی وہی دین لے کر آئے ہیں۔ تمہارے انبیاء نے بھی اسی وحدہ لاشریک کی عبادت کا حکم دیا، ہمارے نبی مکرم ﷺ بھی یہی حکم دیتے ہیں۔ ہم صرف قرآن کریم کو ہی کلامِ الٰہی نہیں مانتے بلکہ تورات وانجیل کے متعلق بھی ہمارا یہی ایمان ہے۔ ہدایت کی جو شمع تمہارے انبیاء نے روشن کی ہم بھی اسی کو روشن رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی ایسی بات نہیں جو وجہ اختلاف اور باعث افتراق ہو۔ مرورِ وقت سے جو عمل اور عقیدے کی خرابیاں تمہارے ہاں رائج ہو چکی ہیں ان کی اصلاح کر لو پھر ہم سب ایک ہی ملت مسلمہ کے فرد بن جائیں گے۔''[1]

پیغمبرانہ مجادلے

﴿قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴾[2]

''وہ (برافروختہ ہو کر) بولے اے نوح! تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور اس جھگڑے کو بہت طول دیا۔ (اس مباحثہ کو رہنے دو) اور آؤ ہمارے پاس جس (عذاب) کی تم ہمیں دھمکی دیتے رہتے ہو اگر تم سچے ہو۔''

اس آیت کریمہ میں حضرت نوح علیہ السلام کے مجادلے کا ذکر ہے۔ آپ ساڑھے نو سو سال اپنی قوم کی اصلاح وہدایت کے لیے مسلسل محنت فرماتے رہے مگر وہ ایسی ضدی اور ہٹ دھرم قوم تھی کہ صرف گنتی کے لوگ مسلمان ہوئے۔ یہاں آپ کے مجادلہ بالکفار کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ مخالفین آپ کے پے درپے مجادلوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ چونکہ آپ کی قوم نے آپ پر بے بنیاد اعتراضات کی بوچھاڑ کی تھی اور آپ نے بفضل تعالیٰ ان کا مفصل رد فرمایا تھا اور اب قوم کو کوئی اور بات سوجھتی نہ تھی لہٰذا انہوں نے آپ کی دعوت وتبلیغ اور مجادلہ ومباحثہ کو تنقید کا نشانہ بنا ڈالا۔

---

1 الازہری، محمد کرم شاہ، پیر، ضیاء القرآن، ج: ۳، ص: ۵۳۹

2 سورۃ ہود ۱۱: ۳۲

حضرت نوح علیہ السلام کے علاوہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر پیغمبران عظام علیہم السلام کے مجادلے بھی قرآن کریم میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ ان مجادلوں پر غور و فکر کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام نے بڑی عمدگی، شائستگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ مجادلے کیے اور بطریق احسن اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے۔

3.2۔ مجادلہ کی اقسام اور بنیادی اصول

مجادلہ کی اقسام

قرآن کریم اور سیرت نبوی میں عمومی طور پر مجادلہ کی دو اقسام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۱)۔ مجادلہ محمود (۲)۔ مجادلہ مذموم

مجادلہ فی نفسہٖ تو محمود ہی ہوتا ہے البتہ بعض اوقات کچھ وجوہات کی بنا پر یہ مذموم بن جاتا ہے۔

مجادلہ محمود

مجادلہ محمود سے مراد ایسا مجادلہ ہے جس کے ذریعے احقاقِ حق اور ابطال باطل کا قصد کیا جائے۔

مجادلہ محمود پر قرآنی دلائل

۱۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾[1]

"(اے محبوب ﷺ!) بلایئے (لوگوں کو) اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے اور عمدہ نصیحت سے اور اُن سے بحث (و مناظرہ) اس انداز سے کیجیے جو بڑا پسندیدہ (اور شائستہ) ہو۔"

اس آیت کریمہ میں دعوت کے بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ کار دعوت میں جہاں حکمت اور موعظۂ حسنہ سے کام نہ چل سکے اور نوبت مجادلہ تک آ پہنچے تو مجادلہ بطریق احسن کیا جائے۔

۲۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

1 سورۃ النحل ۱۶: ۱۲۵

﴿وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ [1]

''اور (اے مسلمانو!) بحث مباحثہ نہ کیا کرو اہل کتاب سے مگر شائستہ طریقہ سے۔''

اس آیت کریمہ میں بھی مجادلہٗ احسن یا مجادلہٗ محمود کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا﴾ [2]

''وہ (برافروختہ ہو کر) بولے اے نوح علیہ السلام! تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور اس جھگڑے کو بہت طول دیا (اس مباحثہ کو رہنے دو)''

یہاں حضرت نوح علیہ السلام کے مجادلہ کا ذکر ہے اور اللہ کے پیغمبروں کا مجادلہ یقیناً مجادلہٗ احسن اور مجادلہٗ محمود ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مجادلہ کے مختلف واقعات

ا۔ نمرود کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مجادلہ کا ذکر قرآن کریم میں یوں کیا گیا ہے۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ﴾ [3]

''کیا نہ دیکھا آپ نے (اے حبیب ﷺ!) اُسے جس نے جھگڑا کیا ابراہیم علیہ السلام سے اُن کے رب کے بارے میں اس وجہ سے کہ دی تھی اللہ نے اُسے بادشاہی جب کہ کہا ابراہیم علیہ السلام نے (اُسے) کہ میرا رب وہ ہے جو جِلاتا ہے اور مارتا ہے اُس نے میں بھی جِلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے تو تو نکال لا اُسے مغرب سے (یہ سن کر) ہوش اُڑ گئے اُس کافر کے۔''

اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مجادلہ محمود کا ذکر ہے جو انہوں نے نمرود کے ساتھ اُس کو دعوت توحید دیتے ہوئے فرمایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے ساتھ جو مجادلہ فرمایا قرآن اُسے یوں بیان کرتا ہے:

---

1 سورۃ العنکبوت ۲۹:۴۶

2 سورۃ ہود ۱۱:۳۲

3 سورۃ البقرہ ۲:۲۵۸

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾[1]

''اور یاد کرو جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کیا تم بناتے ہو بتوں کو خدا بے شک میں دیکھتا ہوں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی گمراہی میں۔''

اس آیت کریمہ سے اُس واقعہ کی تفصیل کا آغاز ہو رہا ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے اور اپنی قوم کے ساتھ مجادلہ فرمایا اور انہیں بتوں کی بے ثباتی کا یقین دلاتے ہوئے توحید کی دعوت دی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صنم کدہ کے بتوں کو توڑنے کے بعد اپنی قوم سے کچھ اس طرح مجادلہ کیا:

﴿قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ﴾[2]

''لوگوں نے پوچھا اے ابراہیم! کیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ فرمایا بلکہ اُن کے اس بڑے نے یہ حرکت کی ہو گی سو ان سے پوچھو اگر یہ گفتگو کی سکت رکھتے ہوں۔''

یہاں اس واقعہ کی تفصیلات مذکور ہیں جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو غیر حاضر پا کر صنم کدہ کے بتوں کو پاش پاش کیا اور قوم کے واپس پلٹنے پر اُن سے مجادلہ فرمایا۔

مجادلہ محمود پر سیرت نبوی سے دلائل

ا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

عن عبداللہ ابن مسعود ان رسول اللہ ﷺ قال مَا مِنْ نَّبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْٓ اُمَّةٍ قَبْلِيْ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ يَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ وَيَهْتَدُوْنَ بِسُنَّتِهٖ ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَالَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَالَا يُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ۔[3]

''مجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جو انبیاء علیہ السلام مبعوث فرمائے اُن کی امت میں سے حواری اور صحابہ ہوتے جو اُن کے حکم

---

1 سورۃ الانعام ۶: ۷۴

2 سورۃ الانبیاء ۲۱: : ۶۲، ۶۳

3 ۲۔ مسلم، ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری، الجامع الصحیح، رقم الحدیث: ۷۱

کی تعمیل کرتے اور اُن کی سنت سے ہدایت حاصل کرتے پھر اُن کے بعد کچھ ایسے لوگ آئے جو کہتے تھے وہ کرتے نہیں تھے اور وہ کرتے تھے جس کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ پس جس نے اُن کے ہاتھ (طاقت) کے ساتھ جہاد کیا وہ بھی مومن تھے اور جنہوں نے زبان کے ساتھ جہاد کیا وہ بھی مومن تھے اور جنہوں نے دل کے ساتھ جہاد کیا (یعنی دل میں برا جانا) وہ بھی مومن تھے اور اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان باقی نہیں رہتا۔"

۲۔ امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں حضرت انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

عن انس عن النبی ﷺ قال جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ [1]

"مشرکین کے ساتھ جہاد کرو اپنے اموال، اپنی جانوں اور اپنی زبانوں کے ساتھ۔"

یہاں کفار کے ساتھ جہاد بالا نفس سے مراد قتال فی سبیل اللہ ہے اور جہاد باللسان سے مراد قلم، بیان اور مجادلہ کا جہاد ہے اور یہ دونوں قسمیں مشروع ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ حضور نبی کریم ﷺ کو مخاطب فرماتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ [2]

(اے نبی کریم ﷺ! جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں کے ساتھ اور سختی کیجئے اُن پر۔)

اس آیت کریمہ میں حضور نبی اکرم ﷺ کو کافروں اور منافقوں سے جہاد کا حکم دیا جا رہا ہے اور یہ بات صاف ظاہر ہے کہ منافقین کے ساتھ جہاد کا مطلب قتال نہیں بلکہ مجادلہ ہے کیونکہ قتال صرف کفار و مشرکین کے ساتھ خاص ہے۔

۴۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب مشرکین مکہ سے صلح کی شرائط طے ہو رہی تھیں تو وہ بظاہر مشرکین کے حق میں تھیں۔ چنانچہ صحابہ کرام کا فطری رد عمل کچھ اس ظاہر ہوا کہ حضرت عمرؓ حضور نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ سے اس طرح مجادلہ کیا:

یارسول اللہ ﷺ! الست برسول اللہ قال بلی قال اولسنا بالمسلمین قال بلی قال اولیسوا بالمشرکین قال بلی قال فعلام نعطی الدنیۃ فی دیننا۔ [3]

---

1 نسائی، ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب، السنن، رقم الحدیث: ۳۰۴۵

2 سورۃ التوبہ ۹: ۷۳

3 الطبری، محمد بن جریر (م ۳۱۰ھ)، تاریخ الامم والملوک، المطبعہ الحسینیہ، س ن، ج: ۳، ص: ۷۹

"یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا بے شک میں اللہ کا رسول ہوں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "کیا ہم مسلمان نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا بے شک ہم مسلمان ہیں، انہوں نے کہا کیا وہ مشرک نہیں؟ ارشاد ہوا: ہاں وہ مشرک ہیں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا: تو پھر ہم اپنے دین میں ذلت کیوں محسوس کریں؟"

اس ساری گفتگو کے آخر پر حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر کی دلی کیفیت کو بھانپ کر جو بھرپور اور جامع جواب دیا اس سے آپ ﷺ کی حکمت وبصیرت اور اپنے موقف کی سچائی پر یقین کامل کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

انا عبداللہ ورسولہ لن اخالف امرہ ولن یضیعنی [1]

"میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں اور اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا اور وہ مجھے ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے دراصل صحابہ کرامؓ کی اکثریت کے دلی جذبات کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دیا تھا اور حضور ﷺ نے اُن کی تسلی اور تشفی فرمائی تھی۔

مجادلہ مذموم

مجادلہ مذموم سے مراد ایسا مجادلہ ہے جس کے ذریعہ حق کی مخالفت یا باطل کا دفاع کیا جائے۔

مجادلہ مذموم پر قرآنی دلائل

کفار کا مجادلہ مذموم

۱۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيَاتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ﴾ [2]

"نہیں تنازعہ کیا کرتے اللہ کی آیتوں میں مگر کافر۔ پس نہ دھوکہ میں ڈالے تمہیں اُن لوگوں کا (بڑے کروفر سے) آنا جانا مختلف شہروں میں۔"

---

1 الطبری، محمد بن جریر (م ۳۱۰ھ)، تاریخ الامم والملوک، المطبعہ الحسینیہ، س ن، ج: ۳، ص: ۷۹

2 سورۃ المومن ۴۰: ۴

اس آیت کریمہ میں کفار کے مجادلے کو مذموم قرار دیا گیا ہے اور یہاں مجادلہ سے مراد آیتوں میں تنازعہ ہے۔

۲۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَجَادَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ﴾[1]

(اور جھگڑتے رہے (اُس کے ساتھ) ناحق، تاکہ جھٹلادیں اس کے ذریعے حق کو پس میں نے پکڑ لیا اُنہیں پس کتنا شدید تھا میرا عذاب۔)

یہاں کفار کے انبیاء کرام علیہ السلام کے ساتھ جھگڑنے کو مجادلہ مذموم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۳۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالُوا أَآلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ﴾[2]

(اور کہتے ہیں کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ۔ وہ نہیں بیان کرتے یہ مثال آپ سے مگر کج بحثی کے لیے۔ درحقیقت یہ لوگ بڑے جھگڑالو ہیں۔)

اس آیت کریمہ میں کفار کی کج بحثی کو مجادلہ مذموم کہا گیا ہے جو وہ انبیاء علیہ السلام کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

۴۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ﴾[3]

(اور بعض ایسے نادان لوگ بھی ہیں جو جھگڑتے ہیں (رسول کریم ﷺ سے) اللہ کے بارے میں نہ اُن کے پاس علم ہے نہ ہدایت اور نہ کوئی روشن کتاب۔)

اس مقام پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ کفار و مشرکین کا بغیر علم، ہدایت اور روشن کتاب کے حضور ﷺ سے اللہ کے بارے میں جھگڑا کرنا مجادلہ مذموم ہے۔

۵۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ إِنْ فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَا هُمْ بِبَالِغِيهِ﴾[1]

---

1 سورۃ المومن ۴۰:۵

2 سورۃ الزخرف ۴۳:۵۸

3 سورۃ لقمان ۳۱:۲۰

(بے شک جو لوگ جھگڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں بغیر کسی سند کے جو اُن کے پاس آئی ہو۔ نہیں اُن کے سینوں میں بجز بڑائی کی ایک ہوس کے جس کو وہ پا نہیں سکیں گے۔)

اس آیت کریمہ میں کفار کے بغیر کسی سند کے اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ جھگڑا کرنے کو مجادلہ قرار دیا گیا ہے۔

اہل اسلام کا مجادلہ مذموم

ا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾[2]

(حج کے چند مہینے جو معلوم ہیں پس جو نیت کرلے ان میں حج کی تو اُسے جائز نہیں بے حیائی کی بات اور نہ نافرمانی اور نہ جھگڑا حج کے دنوں میں۔)

یہاں حج کے دنوں میں جھگڑا کرنے کو مجادلہ کہا گیا ہے جو اہل اسلام کے لیے مذموم قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كَمَا اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ. يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ﴾[3]

(جس طرح نکال لایا آپ کو آپ کا رب آپ کے گھر سے حق کے ساتھ اور بے شک اہل ایمان کا ایک گروہ (اس کو) ناپسند کرنے والا تھا جھگڑ رہے تھے آپ سے سچی بات میں اس کے بعد کہ وہ واضح ہو چکی تھی۔'' یہاں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ کی طرف سے کسی بات کے واضح ہو جانے کے بعد اہل ایمان کا حضور نبی اکرم ﷺ سے اُس بات پر جھگڑا کرنا مجادلہ مذموم ہے۔)

مجادلہ مذموم سیرت نبوی کی روشنی میں

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ ، قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : مَا ضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوا عَلَيْهِ ، إِلاَّ

---

1 سورۃ المومن ۴۰: ۵۶

2 سورۃ البقرہ ۲: ۱۹۷

3 سورۃ الانفال ۸: ۶،۵

أُوتُوا الْجَدَلَ, ثُمَّ تَلاَ هَذِهِ الآيَةَ : {بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ} .[1]

"کوئی قوم ہدایت پانے کے بعد گمراہ نہیں ہوئی مگر اس لیے کہ وہ مجادلہ (مذموم) میں پڑ گئی۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ بل هم قوم خصمون۔"

مجادلہ کے بنیادی اصول

ا۔داعی کا نقل روایت کی صحت اور دعویٰ پر دلیل کا التزام

داعی کے لیے ضروری ہے کہ مجادلہ کے دوران پیش کردہ روایت کی صحت کا التزام کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دعویٰ پر دلیل بھی قائم کرے۔ یہ اصول قرآن کریم کی ان دو آیات کریمہ سے مستنبط ہوتا ہے۔

ا۔﴿قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَا إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾[2]

(آپ فرماؤ لاؤ تورات پھر پڑھو اسے اگر تم سچے ہو۔)

۲۔﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾[3]

(آپ (انہیں) فرمایئے! لاؤ اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو۔)

2۔ نصوص شرعیہ کی لفظی و معنوی موافقت

مجادلہ کے دوران پیش کیے جانے والے نقلی دلائل خصوصاً نصوص شرعیہ کی لفظی و معنوی موافقت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ سے حدیث بالمعنیٰ کی روایت سے منع کیا گیا ہے البتہ اس شرط پر اجازت دی گئی ہے کہ ناقل ماہر عالم ہو جو لفظی اور معنوی حقائق کا ادراک رکھتا ہو۔

3۔ کمی بیشی کے بغیر کلی دلیل کا ذکر کرنا

قرآن کریم میں اس اصول کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

﴿أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي

1 ابن ماجہ، ابو عبداللہ محمد بن یزید (م ۲۷۳ھ)، السنن، الْمُقَدِّمَة، بَاب اجْتِنَابِ الْبِدَعِ وَالْجَدَلِ

2 سورۃ آل عمران ۳: ۹۳

3 سورۃ البقرہ ۲: ۱۱۱

الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیَامَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰی اَشَدِّ الْعَذَابِ﴾[1]

(تو کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصہ پر اور انکار کرتے ہو کچھ حصہ کا (تم خود ہی کہو) کیا سزا ہے ایسے نابکار کی تم میں سے سوائے اس کے کہ رسوا رہے دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن تو انہیں پھینک دیا جائے گا سخت ترین عذاب میں۔)

4۔ اثبات حق کی صورت میں سر تسلیم خم کرنا

مجادلہ کی صورت میں حق کو ہر جہت سے تسلیم کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾[2]

(پس اللہ نے ہدایت بخشی انہیں جو ایمان لائے تھے اُن سچی باتوں پر جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے اپنی توفیق سے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف)

5۔ معرفتِ حق کا معیار

مجادلہ کے دوران یہ بات پیش نظر رہے کہ حق لوگوں کی وجہ سے نہیں پہچانا جاتا بلکہ لوگ حق کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر حق کا موازنہ لوگوں سے نہیں بلکہ لوگوں کا موازنہ حق کے ساتھ کیا جائے۔ داعی کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر صورت میں حق کے ساتھ وابستہ رہے۔ اُس کے لیے یہ امر پریشانی کا باعث نہ ہو کہ حق اختیار کرنے والے تعداد میں بہت کم ہیں اور بالکل اسی طرح اُسے یہ امر بھی پریشان نہ کرے کہ باطل اختیار کرنے والے تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔

6۔ حق مختلف اور متعارض نہیں ہوتا

داعی کے پیش نظر یہ بات بھی ہونی چاہیے کہ حق، اللہ کے نزدیک اور نفس امر میں واحد ہوتا ہے البتہ متنوع تو ہو سکتا ہے لیکن مختلف اور متعارض نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾[3]

---

1 سورۃ البقرہ ۲: ۸۵

2 سورۃ البقرہ ۲: ۲۱۳

3 سورۃ النساء ۴: ۸۲

(اور (اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ) اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے (بھیجا گیا) ہوتا تو ضرور پاتے اس میں اختلاف کثیر۔)

7۔ اختلاف کبھی نوع کے اعتبار ہوتا ہے تو کبھی تعارض کے اعتبار سے

مجادلہ میں اختلاف کبھی نوع کے اعتبار سے ہوتا ہے مثلاً الصراط المستقیم کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا اس سے مراد قرآن ہے، بعض نے کہا اسلام ہے اور بعض نے کہا سنت ہے۔ یہ تمام معانی درست ہیں کیونکہ ان میں تعارض نہیں۔ لہٰذا یہ اختلاف نوع کے اعتبار سے ہے۔ اور کبھی یہ اختلاف تعارض کے اعتبار سے ہوتا ہے مثلاً اذان، تشہد اور نماز شروع کرنے کی دعائوں کے صیغوں میں اختلاف تعارض کی بنا پر ہے۔

8۔ ردّ و قبولِ دلیل کا معیار شریعت ہے لوگ نہیں

مجادلہ میں کسی کلام کے مطالب اگر کتاب وسنت کے موافق ہوں تو انہیں قبول کیا جائے گا اور اگر مخالف ہوں تو انہیں رد کر دیا جائے گا یہی وجہ ہے کہ ائمہ فقہا اپنا قول کتاب وسنت کے مقابل آنے کی صورت میں اُسے رد کرنے کا حکم دیتے۔ اس اصول کا استنباط درج ذیل آیت کریمہ سے کیا گیا ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ [1]

(نہ کسی مومن مرد کو یہ حق پہنچتا ہے اور نہ کسی مومن عورت کو کہ جب فیصلہ فرمادے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ کسی معاملہ کا تو پھر اُنہیں کوئی اختیار ہو اپنے اُس معاملہ میں۔)

9۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر تقدم سے اجتناب

داعی پر لازم ہے کہ وہ صرف اتنی بات کہے جو اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ نے کہی ہو، اُس سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے جیسا کہ فرمان خداوندی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ [2]

(اے ایمان والو! آگے نہ بڑھا کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے اور ڈرتے رہا کرو)

10۔ باطل کا بطلان حق سے ہے نہ کہ باطل سے

مجادلہ میں باطل دلیل کا رد باطل سے، بدعت کا رد بدعت سے، دلیل فاسد کا رد فاسد سے نہیں بلکہ صرف حق سے ہونا

---

1 سورۃ الاحزاب ۳۳:۳۶

2 سورۃ الحجرات ۴۹:۱

چاہیے۔ دلیل فقط کتاب وسنت اور شریعت کے مقرر کردہ قواعد وضوابط کے مطابق ہونی چاہیے۔

11۔ انکار کا جواب انکار سے نہیں

مجادلہ میں اس بات کا خیال بھی ہونا چاہیے کہ اگر مدمقابل کسی بات کا انکار کر رہا ہو تو اس کے انکار کا جواب کسی بات کے انکار سے نہیں بلکہ دلیل سے دینا چاہیے۔

12۔ کسی دلیل کا علم نہ ہونا عدم علم کی دلیل نہیں

داعی کے پیش نظر یہ اصول بھی ہونا چاہیے کہ اگر دلائل کے تبادلہ کے دوران کسی نکتہ پر مدمقابل کوئی دلیل پیش نہ کرسکے تو اُس پر عدمِ علم کا الزام لگانا درست نہیں اور یہ اصول جانبین پر لازم آتا ہے۔

13۔ دلیل پر فریقین کا متفق ہونا ضروری ہے

جانبین پر لازم ہے کہ دلائل کے تبادلہ کے دوران ایسی دلیل پیش کریں جس پر دونوں فریق متفق ہوں تاکہ پیش کردہ مسئلہ کا اثبات یا نفی واضح ہو سکے اور اس میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ نیز وہ دونوں کے لیے قابل قبول ہو۔

14۔ مماثلات کے حکم اور مختلفات کے فرق پر اتفاق

باہم مماثل امور کا حکم ایک ہوگا جبکہ مختلف فیہ امور کا حکم جدا جدا ہوگا یہی وہ اصول ہے جس پر شرع کے احکام قائم ہوتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ﴾[1]

(تو کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصہ پر اور انکار کرتے ہو کچھ حصہ کا۔)

یہاں یہود کی مذمت مقصود ہے۔ جنہوں نے تورات کے بعض احکام کو مانا اور بعض کا انکار کر دیا۔

15۔ نفی کرنے والے پر دلیل لازم ہے

مجادلہ میں دلیل کی نفی کرنے والے پر دلیل دینا لازم ہے مثلاً ایک فریق دوسرے فریق سے اس کی دلیل کا جواب مانگتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے قول کے خلاف کوئی دلیل نہیں تو نفی کرنے والے پر اپنے موقف کی دلیل پیش کرنا ضروری ہے۔

---

1 سورۃ البقرہ ۲: ۸۵

16۔اصطلاحات بدل سکتی ہیں' حقائق نہیں

علوم وفنون کی وسعت کے ساتھ ساتھ آئے روز اصطلاحات بدلتی رہتی ہیں لیکن اصطلاحات بدلنے سے حقائق نہیں بدلتے بلکہ اُن کی حیثیت ہمیشہ مسلم رہتی ہے۔ لہٰذا نئی اصطلاح کی بناء پر حقائق کا رد کرنا مجادلہ کے اصولوں کے منافی ہے۔

4۔دعوت میں تدریج

جس طرح قرآنِ مجید انسان کی راہنمائی زندگی کے تمام پہلوؤں پر کرتا ہے اسی طرح دعوت و تبلیغ بھی قرآن مجید کا خاص موضوع ہے۔ دعوت و تبلیغ کے اصول وضوابط بھی قرآن مجید ہی بیان کرتا ہے۔ دعوت و تبلیغ کے قوانین اور اصولوں میں سے ایک اہم اصول ''اصول تدریج'' ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ ساری کی ساری شریعت ایک ہی بار نہ بیان کر دی جائے بلکہ مدعوین کے حالات وظروف کا لحاظ کیا جائے، ان کی، نفسیاتی اور واقعاتی صورتحال کو بھی سامنے رکھا جائے۔ اہم در اہم کو ترجیح دی جائے آہستہ آہستہ حسب موقعہ ضرورت کے مطابق بیان کیا جائے۔ ایک داعی کے لیے یہ چیز بہت اہم ہے کہ وہ ایک واضح منہج اختیار کرے۔ پہلے سب سے زیادہ اہم چیز کو بیان کرے پھر اس کے بعد دوسری چیز بیان کرے۔ ایسا کرنے سے دعوتی اثرات بہت بہتر ہوں گے ورنہ بغیر پلاننگ کے دعوت وقت کا ضیاع ہے۔

تدریج کا مطلب ہے کہ مخاطب کو آسان سے مشکل کی طرف ایک قاعدہ سے دوسرے قاعدے کی طرف پھر ان کی جزئیات کی طرف بلایا جائے۔ نظریاتی دعوت سے عمل دعوت کی طرف ایمانیات سے اعمال کی طرف توحید سے عبادت کی طرف بلایا جائے۔ پہلے بڑے گناہوں کے بارے میں بتایا جائے پھر چھوٹے گناہوں کی بات کی جائے تاکہ فرد اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جائے۔ انسان مزاجی طور پر بیک وقت تمام احکام کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ تمام حرام اور غلط کاموں کو یک دم چھوڑ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ قبل از اسلام ان چیزوں کا عادی تھا اب فوراً ان کو ترک کرنا اس کے لیے مشکل ہے۔ اس لیے شریعت کا اصولِ تدریج عین فطرت انسان کے مطابق ہے۔ نزولِ قرآن، تدریج کی اعلیٰ ترین مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سارا قرآن یک بار نازل نہیں کیا بلکہ حسب ضرورت آہستہ آہستہ نازل کیا ہے۔ جب ایمان دلوں میں جڑ پکڑ لے اور توحید مضبوط ہو جائے پھر اس کے بعد باری باری ارکانِ اسلام کی طرف دعوت دی جائے۔ پھر اس کے بعد حرام کاموں سے روکا جائے ایسا کرنے سے آدمی حرام کاموں سے باز آجاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ [1]

---

1 سورۃ العنکبوت ۲۹:۴۵

(بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔)

حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کہا کہ: "اے اللہ! شراب کے بارے میں واضح حکم نازل فرما۔" پھر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾[1]

(آپ سے وہ شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں۔)

حضرت عمرؓ کے سامنے جب یہ آیت پڑھی گئی تو انھوں نے پھر خواہش کی کہ اے اللہ شراب کے بارے میں کوئی ایسا واضح حکم نازل فرما کہ جس کے بعد مزید وضاحت کی ضرورت نہ رہے۔ تو پھر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾[2]

(اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ۔)

پھر جب حضرت عمرؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی تو انھوں نے پھر کہا کہ اے اللہ واضح حکم نازل فرما تو پھر آیت اتری:

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾[3]

"کیا تم رُک جاؤ گے۔" تو حضرت عمرؓ نے کہا ہاں ہم رک گئے۔[4]

زنا جیسے عمل کو بتدریج روکنا ناممکن تھا اس لیے وہاں یہ قاعدہ استعمال نہیں ہوا لیکن زنا کو حرام قرار دے دیا گیا اور متعہ کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی لیکن جب مخصوص حالات کا خاتمہ ہو گیا تو اللہ تعالی نے متعہ کو بھی حرام قرار دے دیا۔ اصولِ تدریج اپنانے سے کوئی کام نہ حلال ہوتا ہے نہ حرام ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی فرض ساقط ہوتا ہے۔

اصولِ تدریج آج بھی موجود ہے منسوخ نہیں ہوا۔ ان لوگوں کو کہنا محل نظر ہے جو کہتے ہیں کہ اب شریعت سازی کا عمل مکمل ہو چکا ہے اب اصولِ تدریج باقی نہیں رہا۔

---

1 سورۃ البقرۃ ۲: ۲۱۹

2 سورۃ النساء ۴: ۴۳

3 سورۃ المائدۃ ۵: ۹۱

4 ابو داؤد، کتاب الاشربۃ، باب فی تحریم الخمر

تدریج ایک طریق دعوت ہے اسے مرحلہ وار اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ حلال اور حرام کے مسائل کی طرح قابل نسخ نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خود بھی حلال و حرام کے مسائل نازل ہونے کے بعد بھی تدریج کا اصول اپنایا ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کی حدیث اس پر دلیل ہے، آپ نے انھیں اصولِ تدریج اختیار کرنے کو کہا تھا۔[1]

اصولِ تدریج خاص وجہ کی بنیاد پر اپنایا جاتا ہے جب وہ وجہ ختم ہو جاتی ہے تو اصولِ تدریج بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہے ''دہریت۔ سیکولرزم'' زدہ معاشروں کو اسلام کی طرف دعوت دینا۔ جب تک اس طرح کے لوگ موجود رہیں گے اور یہ قیامت تک موجود رہیں گے تو اصولِ تدریج بھی موجود رہے گا۔ فرض کریں اگر کوئی غیر مسلم مسلمان ہونا چاہتا ہے لیکن وہ شراب کا عادی ہے وہ شراب فی الواقت چھوڑنا نہیں چاہتا تو اس کو اسلام قبول کروادینا چاہیے۔ یا پھر وہ حج کرنا مشکل سمجھتا ہے تو بھی اس کو اسلام لانے میں کوئی حرج نہیں البتہ بعد میں اللہ تعالیٰ اس کو اس کی بھی ہدایت دے دیں گے۔ اگر کوئی خاتون اسلام قبول کرنا چاہتی ہے اور اس کو پردہ کی اہمیت کا کوئی پتہ نہیں اور وہ کہتی ہے کہ میں پردہ نہیں کروں گی لیکن میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں تو اس کو اسلام سے نہ روکا جائے۔ مختصر یہ کہ کفر کے علاوہ لوگوں پر ہر حال میں اسلام کا دروازہ کھلا رہنا چاہیے۔ ان کے لیے یہ دروازہ بند نہ کریں بعد میں آہستہ آہستہ دیگر ارکان کی تعلیم کا انتظام بھی کریں۔

حضرت وہبؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت جابرؓ سے پوچھا کہ ثقیف قبیلہ کے لوگوں نے کس شرط پر اسلام قبول کیا تو انھوں نے کہا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت اس شرط پر کی کہ وہ زکوٰۃ بھی نہیں دیں گے اور جہاد بھی نہیں کریں گے۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اگر یہ لوگ اسلام لے آئے تو زکوٰۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔[2]

دورِ حاضر میں بھی جہاں جہاں مسلمان مکے کی طرح دباؤ کا شکار ہیں اور وہ کھل کر اسلام کے اوپر عمل نہیں کر سکتے تو ایسے لوگوں پر کوئی عتاب اور وعید نہیں ہے۔

اصولِ تدریج دعوت میں ایک مؤثر ترین ہتھیار ہے جس کا استعمال داعی حضرات کے لیے بہت ضروری ہے۔ یورپ اور مغربی ممالک جو کہ مادی ترقی میں بہت آگے ہیں ان میں اسلام بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے لیکن وہاں پر بھی لوگوں

---

1 ابوداؤد، کتاب الاشربۃ، باب فی تحریم الخمر

2 الامام، احمد ابن حنبل، المسند احمد، ج ۲، ص ۳۴۱ بحوالہ، منہج الدعوہ فی ضوء المعاصر، ترجمہ عبدالرحمٰن یوسف، ڈاکٹر، ص ۲۶۰

کے مسائل کچھ اسی طرح کے ہیں جن میں اصولِ تدریج کی اشد ضرورت ہے۔

برما، ایریٹیریا، ہندوستان، چائنا جیسے ممالک میں بھی مسلمان اور نو مسلم حضرات کے لیے کئی طرح کے مسائل ہیں، سماجی دباؤ، معاشی بدحالی، غربت، تعلیمی جہالت، وسائل کی کمی اور مسائل کی زیادتی غیر مسلم حکومتوں کا عدم تعاون اور دیگر بے شمار قسم کی رُکاوٹیں ہیں جن میں عام مسلمانوں کے ایمان کو بچانے کے لیے اور ان کو مایوسی اور پریشانی سے نجات دلانے کی غرض سے وہاں کے حالات وظروف کے مطابق اصولِ تدریج پر عمل ضروری ہے۔

5۔دعوت و تبلیغ میں رفق ونرمی

داعی دعوت کا کوئی بھی اسلوب اختیار کرے، جب تک وہ مخاطب سے نرمی اور خیر خواہی کے جذبہ سے بات نہیں کرے گا،اس کی دعوت مؤثر نہیں ہوگی۔ سختی اور شدت مخاطب کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتی ہے، جس سے مخاطب اپنی ضد پر اڑ جاتا ہے۔ نتیجتاً دعوت کا سارا فائدہ اور نصیحت کا سارا اثر زائل ہو جاتا ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو اپنے بدترین مخالفین سے بھی نرم انداز میں گفتگو کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ وہارون علیہم السلام کو فرعون جیسے باغی کے سامنے پیغام ربانی لے کر جانے کا حکم دیا تو یہ ہدایت بھی فرمائی۔

﴿اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى . فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾۔[1]

(تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ،اس نے سرکشی کی ہے، تو اس سے نرم گفتگو کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا (اللہ سے) ڈرے۔)

دعوت و تبلیغ میں رفق ونرمی کی اس سے بہتر مثال نہیں ہوسکتی کہ نہ انبیاء سے بہتر کوئی داعی ہو سکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی سرکش اور باغی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسے مجرم کے سامنے وعظ و نصیحت کرتے وقت نرمی اختیار کرنے کا حکم ہے تو عام مجرم اور گمراہ لوگوں سے تو کہیں بڑھ کر نرمی اختیار کرنی چاہیے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مبلغ صحابہ کرامؓ کو ہمیشہ نرمی اختیار کرنے کا حکم فرمایا۔ حضرت طفیلؓ بن عمرو نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی ہی قوم کی طرف مبلغ بنا کر بھیجا۔ چنانچہ وہ لوگوں کو مسلسل دعوت دیتے رہے لیکن قوم انکار کرتی رہی۔ بالآخر وہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، یارسول اللہ،

---

1 سورة طٰہ ۴۳، ۴۴

قبیلہ دوس نے مجھے ہرا دیا۔ میں نے ان کو بہت دعوت دی لیکن وہ ایمان نہیں لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے بدعا کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا کرنے کی بجائے قبیلہ دوس کے لیے یہ دعا فرمائی۔

اللهم اهد دوسا، ارجع الى قومك فادعهم وارفق بهم۔[1]

اے اللہ دوس کو ہدایت عطا فرما۔ (طفیل بن عمرو سے فرمایا) تم اپنی قوم کی طرف لوٹ جاؤ، ان کو دعوت دیتے رہو لیکن ان کے ساتھ نرمی اختیار کرو۔

چنانچہ مأخذ سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم کردہ اسلوب کو اختیار کرنے کا نتیجہ شاندار نکلا۔ کثیر لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ۷ھ میں جب حضرت طفیلؓ بن عمرو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے ساتھ قبیلہ دوس کے ستر یا اسی گھرانوں کے لوگ تھے۔

ایک صحیح حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دعائیہ ارشاد ہے۔

اللهم من ولی من أمر أمتی شيئا فشق عليهم فاشقق عليه ومن ولی من أمر أمتی شيئا فرفق بهم فارفق به[2]

اے اللہ! جو شخص میری امت کے کسی کام کا ذمہ دار بنایا جائے اور وہ ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کرے، تو بھی اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کر اور جو کوئی میری امت کے کسی کام کا والی مقرر ہو اور وہ اُن پر سختی کرے تو تُو بھی اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کر۔

6۔ عدم اکراہ

قرآن حکیم کا ایک اصول دعوت یہ بھی ہے کہ کسی شخص سے جبر کے ساتھ اپنی بات نہ منوائی جائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾[3]

---

1 ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ

2 مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الإمارۃ، باب فضیلۃ الإمام العادل وعقوبۃ الجائر

3۔ سورۃ البقرہ ۲:۲۵۶

(کوئی زبردستی نہیں ہے دین میں بے شک خوب واضح ہوگئی ہے ہدایت گمراہی سے تو جو انکار کرے شیطان کا اور ایمان لائے اللہ کے ساتھ تو اُس نے پکڑ لیا مضبوط حلقہ جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ تعالی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔)

دعوت و تبلیغ سے یہ مقصود نہیں کہ کسی کو زبردستی یا تلوار کے زور پر مسلمان کیا جائے بلکہ اللہ تعالی نے اپنے نبی برحق ﷺ کے ذریعے ایسے معجزات اور کھلی نشانیاں ظاہر فرمادی ہیں کہ ان سے حق اور باطل اس طرح علیحدہ اور ممتاز ہو گئے جیسے دن اور رات ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ لوگوں تک دین پہنچانے کے لیے آپ نے جبر واکراہ کا طریقہ کبھی اختیار نہیں فرمایا بلکہ آپ ﷺ ہمیشہ پر امن تبلیغ کا راستہ اپنایا۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا وہ آپ کی پوری حیات طیبہ سے ایسا ایک واقعہ بھی پیش نہیں کر سکتے جس سے جبر واکراہ ثابت کیا جا سکے۔ قبول اسلام ایک اختیاری معاملہ ہے اور اسلام غیر مسلموں کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾[1]

(اور فرمایئے حق تمہارے رب کی طرف سے ہے پس جس کا جی چاہے وہ ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کرتا رہے۔)

دین اسلام کے حق ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اب جس کا دل چاہے اسے قبول کرلے اور جس کا دل نہ چاہے وہ اس کو قبول نہ کرے۔ اسے مکمل اختیار حاصل ہے۔ اہل عقل و بصیرت خود ایمان و کفر میں سے کسی ایک کو اختیار کرلیں گے۔ ان پر کوئی زبردستی نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس بات کو متعدد مواقع پر صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ رسول ﷺ کا کام اللہ عزوجل کا پیغام لوگوں تک پہنچادینا ہے ان سے زبردستی منوانا نہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾ [2]

(پھر اگر تم نے روگردانی کی (تو تمہاری قسمت) ہمارے رسول کے ذمہ فقط کھول کر (پیغام) پہنچانا ہے۔)

﴿مَّا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ﴾[3]

1۔ سورۃ الکھف ۱۸:۲۹

2۔ سورۃ التغابن ۶۴:۱۲

3۔ سورۃ المائدہ ۵:۹۹

(نہیں (ہمارے) رسول پر کوئی ذمہ داری سوائے پیغام پہنچانے کے اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کر رہے ہو اور جو چھپا رہے ہو۔)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ [1]

(ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور آپ اُن پر جبر کرنے والے نہیں پس آپ نصیحت کرتے رہیے اُس قرآن سے ہر اُس شخص کو جو (میرے) عذاب سے ڈرتا ہے۔)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ [2]

(پس آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں آپ کا کام تو سمجھانا ہی ہے آپ اُن کو جبر سے منوانے والے تو نہیں ہیں مگر جس نے رو گردانی کی اور کفر کیا تو اللہ اُس کو سخت عذاب دے گا بے شک انہیں (آخر) ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے۔ پھر یقینا ہمارے ہی ذمہ اُن کا حساب لینا ہے۔)

مذکورہ بالا بحث سے ثابت ہوا کہ آپ ﷺ نے دعوت کے تمام مراحل میں پر امن تبلیغ کو اپنا مقصد بنائے رکھا۔ اکراہ کا ایک واقعہ بھی آپ ﷺ کی سیرت میں نہیں ملتا۔

7۔ آسانی اور سہولت کی تلقین

دین کی جائز آسانی اور سہولت کو پیش نظر رکھنا، دین کو درشت اور مشکل نہ بنانا اس کی قبولیت کا اہم ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام مسلمانوں کے لیے ہمیشہ آسانی اور سہولت کے پہلو کو پیش نظر رکھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کے متعلق ارشاد فرماتی ہیں:

"ما خيّر رسول الله صلى الله عليه وسلم بين امرين الا أخذ ايسرهما ما لم يكن اثما، فان كان اثما كان ابعد الناس منه، وما انتقم رسول الله صلى الله عليه وسلم لنفسه الا ان تنتهك حرمة الله

1۔ سورۃ ق ۵۰:۴۵

2۔ سورۃ الغاشیہ ۸۸:۲۶۔۲۱

فینتقم للہ بہا"[1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی دو امور میں اختیار نہیں دیا گیا مگر یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے آسان کو اختیار کیا بشرطیکہ اس میں گناہ نہ ہو۔ اگر گناہ ہو تو اس سے تمام انسانوں سے زیادہ دور ہوتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا مگر جبکہ اللہ کی حرمت مجروح ہو تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے لیے انتقام لیتے۔"

انسان طبعاً سہولت پسند ہے اس لیے داعی کا فرض ہے کہ وہ دین کو مشکلات کا مجموعہ نہ بنائے بلکہ جہاں تک ممکن ہو، دینی زندگی کو لوگوں کے لیے آسان بنا کر پیش کرے۔ دینی معاملات میں تشدد پسندی اور سختی سے حتی الوسع پرہیز کرے اور اگر کسی سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو جو حل سب سے آسان ہو، اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے اس کی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"ایک دیہاتی مسجد میں آیا، اس نے دو رکعتیں ادا کیں پھر کہنے لگا: اے اللہ مجھ پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی اور پر نہ فرما۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ فرمائی اور فرمایا: تو نے وسیع چیز کو تنگ کر دیا۔ پھر اس نے جلدی سے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ لوگ اس کی طرف (مارنے کی خاطر) دوڑے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھیں آسانی کرنے والا بنایا گیا ہے، مشکل پسند نہیں۔ اس پر پانی کا ایک ڈول بہادو"[2]

جہالت یا عدم واقفیت ایک مرض ہے۔ اسے ایک قسم کی معذوری سمجھ کر ازالے کی کوشش کرنا ہی انسانیت کی خدمت ہے لیکن اس سے اظہارِ نفرت وانتقام گویا اس کی اصلاح کے تمام راستے بند کرنے والی بات ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"عن انس رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: خیر دینکم ایسرہ، وخیر العبادۃ الفقہ"[3]

---

1 (الموطأ، کتاب حسن الخلق، باب ماجاء فی حسن الخلق، ح: ۶۹۰، ص: ۵۵۵۔ صحیح مسلم، ح: ۶۰۴۵۔ صحیح البخاری، ح: ۶۱۲۶

2 صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب یصیب الماء علی البول فی المسجد، ح: ۲۲۰، ص: ۴۱۔ ایضاً، کتاب الادب، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسروا ولا تعسروا، ح: ۶۱۲۸، ص: ۱۰۶۸۔ صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب وجوب غسل البول وغیرہ: ۶۶۱، ص: ۱۳۳۔ جامع الترمذی، کتاب الطھارۃ، باب ماجاء فی البول یصیب الارض، ح: ۱۴۷، ص: ۴۱۔۷

3 ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ، باب تفصیل العلم علی العبادۃ، ۲۱/۱

''حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا دین آسان ہے اور اچھی عبادت دینی بصیرت حاصل کرنا ہے''

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل اور ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہما کو یمن میں دعوتی مہم پر روانہ فرمایا تو ان کو اسی اسلوب دعوت کی تقلین ان الفاظ میں فرمائی:

'یسرا ولا تعسرا، وبشرا ولا تنفّرا''[1]

''دین کو آسان بنا کر پیش کرنا سخت بنا کر پیش نہ کرنا، لوگوں کو خوشخبری سنانا نفرت نہ دلانا''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اگر کبھی دینی معاملات میں اعتدال سے ہٹ کر تشدد کی راہ اپنائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی سختی سے منع فرمایا۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبل نے ایک مرتبہ انصار کو نمازِ مغرب پڑھائی اور قرأت کو خوب طویل دیا۔ حضرت حازم انصاری رضی اللہ عنہ نہ ٹھہر سکے اور اپنی علیحدہ نماز پڑھ کر چل دیے۔ حضرت معاذ بن جبل ان سے سخت ناراض ہوئے۔ حضرت حازم رضی اللہ عنہ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ معاذ ہمیں بہت طویل نماز پڑھاتے ہیں جس کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''یامعاذ! أفتّان أنت؟ أفتان أنت؟ اقرأ بكذا، اقرأ بكذا''[2]

''اے معاذ! کیا تم فتنہ میں ڈالنے والے ہو؟ اے معاذ لوگوں پر تخفیف کرو''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثقیف پر حضرت عثمان بن ابی العاص کو امیر مقرر کر کے روانہ فرمایا۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے جو آخری عہد لیا، وہ یہ تھا:

'یاعثمان! تجاوز في الصلوة، و اقدر الناس بأضعفهم، فان فيهم الكبير و الصغير و الضعيف و ذا الحاجة''(ابن هشام، امر وفد ثقيف و اسلامها[3]

''اے عثمان! نماز ہلکی رکھنا اور لوگوں میں ان کے سب سے زیادہ ضعیف آدمی کو معیار بنانا، کیونکہ (نماز پڑھنے والے)

---

1 ابن ہشام، وصیۃ الرسول معاذا حین بعثہ الی الیمن، ۲۴۶/۴

2 سنن ابی داؤد، کتاب الصلوۃ، باب تخفیف الصلوۃ، ح: ۷۹۰، ص: ۱۲۳۔ اسد الغابہ، تذکرہ حازم انصاری، ۳۶۰/۱

3 اسد الغابۃ، تذکرہ عثمان بن ابی العاص، ۳۷۲/۳)

لوگوں میں بڑے بھی ہوتے ہیں اور چھوٹے بھی، ضعف بھی ہوتے ہیں اور صاحب ضرورت بھی"

شاہانِ حمیر نے قاصد کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اسلام لانے کی اطلاع بھیجی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف چند صحابہ کو محاصل جمع کرنے اور دعوت و تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا، ان لوگوں میں حضرت معاذ بن جبل بھی تھے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانگی کے وقت ان سے عہد لیا اور سہولت اور آسانی کا اسلوب اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

"یسّر ولا تعسّر، وبشّر ولا تنفّر، وانك ستقدم علی قوم من اهل الکتاب، یسئلونك ما مفتاح الجنة؟ فقل شهادة ان لا اله الا الله وحده لا شریك له[1]

"آسانی پیدا کرنا، دشواری پیدا نہ کرنا، خوش رکھنے والی باتیں کرنا، نفرت دلانے والی باتیں نہ کرنا، تم اہلِ کتاب کے کچھ لوگوں کے پاس جا رہے، وہ تم سے پوچھیں گے جنت کی کنجی کیا ہے؟ تو تم کہنا: اس بات کی گواہی دینا کہ خدائے واحد کے سوا اور کوئی ہستی عبادت کے لائق نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے"۔

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں تو فلاں شخص کی وجہ سے فجر کی نماز سے پیچھے رہ جاتا ہوں (باجماعت ادا نہیں کر سکتا)، کیونکہ وہ بہت لمبی نماز پڑھاتا ہے"۔

راوی کا بیان ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وعظ کے دوران کبھی اس قدر غصے میں نہیں دیکھا جتنا اس دن ہوئے۔ پھر فرمایا:

"یا ایها الناس! ان منکم منفرین، فایکم ما صلی بالناس فلیوجز، فان فیهم الکبیر و الضعیف وذا الحاجة۔[2]

"اے لوگو! تم میں کچھ لوگ نفرت پھیلانے والے ہیں، جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے وہ مختصر (قرأت وغیرہ) کرے، ان میں بوڑھے، کمزور اور کام والے بھی ہوتے ہیں"۔

---

1 ابن ہشام، وصیة الرسول صلی اللہ علیہ وسلم معاذا حین بعثه الی الیمن، ۲۴۶/۴)

2 صحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب ہل یقضی القاضی اور یفتی و ہو غضبان؟ (صحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب ہل یقضی القاضی اور یفتی و ہو غضبان؟ ح: ۷۱۵۹، ص: ۱۲۳۲۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب تخفیف الامام فی القیام، ح: ۷۰۲، ۷۰۴، ۹۰، ۶۱۱۰۔

8۔ دعوت کی ناکامی کے اسباب

دعوت و تبلیغ کا فریضہ اپنی اہمیت کے پیش نظر ہر عہد میں خاص اہمیت کا حامل رہا ہے۔ ہر دور میں دعوت کا کام اپنے اپنے انداز میں جاری رہا۔ مسلمانوں کے دور عروج میں دعوت کے مثبت نتائج سامنے آتے رہے اور کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں۔ مگر دورِ زوال میں خصوصاً گذشتہ چند صدیوں میں دعوت و تبلیغ کے وہ نتائج سامنے نہیں آئے جو قرونِ اولی میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس فریضہ کی اہمیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ دعوت کی تاریخ کا تجزیہ کیا جائے اور دعوت کی ناکامی کے اسباب کا تعین کیا جائے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اپنے عہد کے مبلغین کے طرز عمل کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

زمانہ دراز کا تعامل جب کسی کام کے لئے کسی طریقہ کار کو مانوس بنا دیتا ہے تو دلوں پر اس کا ایسا سکہ بیٹھ جاتا ہے کہ لوگ اس سے علیحدہ ہو کر سوچ ہی نہیں سکتے۔ اور وہی طریقہ اس کے لئے قدرتی خیال کیا جاتا ہے۔ جو شخص اس کو انجام دینا چاہے وہی طریقہ اختیار کرتا ہے۔۔۔۔ مگر رائج طریق دعوت نہ صرف غلط ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ طریقۂ تبلیغ اپنے فلسفہ کے اعتبار سے بھی غلط ہے اور اپنے طریقہ کار کے پہلو سے بھی غلط ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تبلیغ اسلام کے نام سے جو جدوجہد کی گئی وہ بیشتر نا صرف اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے لا حاصل رہی بلکہ الٹا اس سے اسلام کو سخت نقصان پہنچا۔[1] برصغیر پاک و ہند کے تناظر میں بالخصوص اور عصر حاضر میں عالم اسلام کے حوالے سے بالعموم جو طریق تبلیغ رائج ہے اس میں علمی اور عملی لحاظ سے کئی پہلو ایسے ہیں جو نہ صرف غلط بلکہ مقصد کے لحاظ سے نقصان دہ ہیں۔ ان اسباب کو دو اقسام میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) علمی اسباب (۲) عملی اسباب

8.1۔ علمی اسباب

علمی حوالے سے دعوت کی ناکامی کے اسباب درج ذیل ہیں:

ا۔ دعوت کی پیشکش کا حریفانہ انداز دعوت

دعوت کی پیشکش کا حریفانہ انداز دعوت دین کی پیشکش کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ داعیوں نے اسلام کا درست

---

1 دعوت دین اور اس کا طریق کار: ص ۱۵

موقف پیش نہیں کیا ہے قرآن نے اسلام کو پہلے انسان سے لے کر قیامت تک آنے والوں کا دین بتایا جس میں وقتاً فوقتاً بگاڑ پیدا ہونے پر انبیاء آکر اصلاح کرتے رہے اور آخر میں آنحضرت ﷺ تشریف لائے اس لحاظ سے قرآن ہر زمانے کے انبیاء کی تصدیق کرتا ہے، لیکن عصری ضرورت کے حوالے سے ان کی مدتِ عمل کا تعین کرتا ہے۔ مگر داعیوں نے اسلام کے اثبات کے لئے یا نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے اثبات کے لئے دیگر ادیان کی تکذیب کو شرط سمجھ لیا اور دیگر مصلحین اور انبیاء کا درجہ آنحضرت ﷺ سے کم ثابت کرنے کو اصل مسئلہ بنالیا۔ حالانکہ آنحضرت ﷺ نے اس قسم کی ترجیح وتفصیل سے منع فرمایا ہے۔ قرآن مجید نے ادیان باطلہ کے معبودوں یا ان کی قابل احترام ہستیوں کی تحقیر سے بھی منع فرمایا

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾[1]

(اور جن کی یہ اللہ کے سوا پرستش کرتے ہیں تم ان کو برا بھلا نہ کہو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی جہالت اور زیادتی کرتے ہوئے اللہ کو برا بھلا کہیں۔)

پیر کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

مبلغ اگر تربیت یافتہ نہ ہو تو اپنے نظریات وعقائد کے جوش میں وہ حد اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے اور معقولین کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے نظریات اور عقائد کے متعلق اس کے سامعین کے دلوں میں تعصب پیدا ہو جاتا ہے بسا اوقات نوبت گالی گلوچ تک پہنچ جاتی ہے اس آیت سے مبلغین کی تربیت مقصود ہے تاکہ وہ اسلام کی دعوت کو پوری شائستگی اور متانت سے پہنچانے کے لئے تیار ہو جائیں انہیں حکم دیا کہ مشرکین کے باطل خداؤں کو بھی برا نہ کہو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مشتعل ہو کر تمہارے معبود برحق کی شان میں گستاخی کریں۔ اسلام کا پیغام انہیں اس انداز سے پہنچاؤ اور ان کے عقائد باطلہ کی تردید اس انداز سے کرو کہ انہیں تمہارے دعوت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ رہے۔[2] یعنی موازنے یا مقابلے کی فضا پیدا نہیں کرنی۔ کجا یہ کہ بعض بے شعور واعظوں نے مخاطبین کے معبودان ومزعومات کا مذاق اڑایا بعض بڑے بڑے مصنفوں کی کتب میں بھی زہر آلود جملے پائے گئے اگرچہ یہ سب مسلمانوں نے جواباً کیا مگر شر کا جواب شر سے دے کر دعوت کے راستے میں مشکلات حائل کیں۔ کیونکہ اس سے غیر

---

1 سورۃ الانعام: ۱۰۹

2 پیر کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن: ج ۱، ص ۵۹۰

مسلموں کے دلوں میں کدورت پیدا ہوئی اور انہوں نے اس حقیقت پر غور ہی نہ کیا کہ اسلام کوئی نئی بات نہیں لایا بلکہ انہی کی اپنی بھلائی ہوئی سچائیاں انہیں یاد دلانے آیا ہے۔ بقول مولانا اصلاحی اور انہوں نے اسلام کو رہزن اور حریف سمجھا جو خود ان پر مسلط ہونے آیا۔[1]

۲۔ دین اسلام کی جزوی پیشکش

دعوت کی ناکامی کا دوسرا بڑا سبب یہ ہوا کہ مبلغین نے اس کی اصل حیثیت کو نظرانداز کر دیا قرآنی ہدایات **ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً**[2] اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ کے برعکس بعض جزوی مسائل پر توجہ رکھی۔ انہوں نے اسلام کو نظام زندگی ثابت کرنے پر زور صرف نہ کیا جو کہ انفرادی واجتماعی تمام معاملات میں رہنمائی فراہم کرتا ہے بلکہ بعض مسائل پر جو کہ چند لوگوں کی دلچسپی کا موضوع ہوتے ہیں بحث و تمحیص میں وسائل اور وقت ضائع کیا جاتا ہے نتیجہ دعوت کی ناکامی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

۳۔ دعوتی ادب (لٹریچر) کی غیر موزونیت

دعوت کی پیشکش میں ایک بڑی غلطی یہ رہی ہے کہ اسلام پر جو کچھ لکھا یا بولا گیا اس کا انداز مناظرانہ یا متکلمانہ رہا جبکہ یہ چیز قریب لانے کی بجائے دور لے جانے والی اور فریقین کو اپنے اپنے مسلک پر جما دینے والی ہے خواہ اپنے مسلک کی غلطی ثابت ہی کیوں نہ ہو جائے۔ متکلمین کا طرز استدلال عقل و فطرت سے بعید تر ہے اس سے کسی مسئلہ کی پیچیدگی میں ہی اضافہ ہوتا ہے۔ حالانکہ اسلام کو پیش کرنے کا طریقہ نرمی اور حکمت کے ساتھ بات کرنا ہے۔ وہی طریقہ جو قرآن حکیم نے بتایا: ﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾[3] اس کے علاوہ اس ادب نے یہ ثابت کیا کہ یہ عقل سے دور محض جذبات و طلسمات کا دین ہے اس نظریہ نے دعوت کو بہت نقصان پہنچایا۔

8.2۔ عملی اسباب

دعوت کی ناکامی کے عملی اسباب درج ذیل ہیں:

---

1 اصلاحی، امین احسن، مولانا، دعوت دین اور اس کا طریق کار ص ۱۸

2 ۔ سورۃ البقرہ ۲:۲۰۸

3 ۔ سورۃ النحل ۱۶:۱۲۵

۱۔ قول و فعل کا تضاد

مسلمانوں کا من حیثیت القوم اور واعظین و مبلغین کا بالعموم قول و فعل میں تضاد ہے۔ مسلمان اپنی تعلیمات کے مطابق اصولی جماعت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جس کی بنیاد اس کے عقائد پر ہے مگر عملاً اس کی بنیاد دیگر نظریات پر ہے جو دیگر قوموں کی طرح رنگ، نسل یا دیگر مادی فوائد پر ہے۔ لہٰذا ان میں اور دیگر گروہوں میں زیادہ فرق نہیں رہ جاتا۔ یہی دعوت کی ناکامی کی ایک بنیادی وجہ بھی ہے۔

۲۔ تحقیق و اجتہاد کا فقدان

دعوت کی ناکامی کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ دور زوال میں امت مسلمہ نے علم و تحقیق کو چھوڑ دیا۔ امت کا عمومی مزاج غیر محققانہ ہو گیا۔ تقلید اور عدم اجتہاد، زوال دعوت کا سبب بنی۔ عہد بنو امیہ اور عہد بنو عباس میں مسلمانوں نے علمی و تحقیقی ترقی کی اور یونانیوں کے ورثہ کی تنقیح و ترتیب کے بعد اس کو وسعت دی اور اس میں اضافے کئے یونانیوں کے علمی و تحقیقی اور عملی مزاج کی وجہ سے امت مسلمہ نے ترقی کی اور دعوت کو بھی مثبت اور سازگار فضاء میسر آئی، کیونکہ امت کی خوشحالی اور دین و دنیا کی فلاح و ترقی ہر ایک کے لئے قابلِ رشک تھی اور یہ بذات خود دعوت تھی لہٰذا لوگ اسلام کی طرف بڑھے۔ لیکن جب تحقیق کا عمل مسلمانوں سے مغرب کی طرف منتقل ہو گیا اور مسلمانوں کا مزاج علم و تحقیق کی بجائے عیش پرستی کا ہو گیا تو اہل اسلام کا عمل خود دعوت و تبلیغ کا ضرورت مند بن گیا اور اس میں باہر والوں کے لئے رشک و تقلید کا کوئی پہلو نہ رہا علمی معیار پست ہو گیا اور یہ عیش دعوت کے زوال کا باعث بنی۔

۳۔ اسلامی تہذیب کا زوال

علم و تحقیق کے زوال کے ساتھ اسلامی تہذیب بھی زوال پذیر ہو گئی اور جب اسلامی تہذیب زوال کی طرف گامزن تھی تو عین اسی وقت یورپ میں تحریک احیائے علوم زوروں پر تھی۔ یورپ دنیا پر غالب ہو گیا، اور اس طرح وہ آپ ہی داعی بن گئی اور امت مسلمہ میں دعوت کا فریضہ ناکام ہو گیا۔ ایسے میں علماء و صلحاء امت کی کوشش بے کار ثابت ہوئیں کیونکہ ان کا تناسب آٹے میں نمک کے برابر تھا جبکہ عوام الناس اور حکمرانوں کا مزاج خود زوال پذیر، شکست خوردہ ہونے کی وجہ سے مغربی تہذیب کی نقالی کی طرف گامزن تھا۔ غیر اسلامی نظریات اور نظاموں کی سی خصوصیات اُن میں موجود ہیں۔ یعنی وہ اپنے معاشی، معاشرتی اور سیاسی معاملات میں دیگر دنیا سے مختلف تعلیمات کی تبلیغ تو کرتے ہیں مگر خود مسلمانوں

کے سیاسی و معاشی اور معاشرتی و تمدنی معاملات بھی دیگر دنیا کی طرح بلکہ دوسروں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق چل رہے ہیں لٰہذا قول و فعل کا یہ تضاد غیر مسلموں کی اسلام میں دلچسپی کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

۴۔ موقع و محل کا نامناسب انتخاب

مولانا اصلاحی کے بقول: "مسلمانوں نے بھی مشنریوں کی دیکھا دیکھی پست حال طبقات پر نظر رکھی۔ حالانکہ یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ تبلیغ میں اول خطاب ان طبقات سے ہونا چاہئے جن کے افکار و نظریات کی قیادت میں سوسائٹی کا نظام چل رہا ہو یہی لوگ دراصل کسی قوم کو بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ اگر یہ لوگ راہ راست پر آجائیں تو سارا نظام آپ ہی راہ راست پر آجاتا ہے۔ اور اگر یہ بگڑے رہیں۔ تو اولاً نیچے کے طبقات میں کوئی اصلاح ہی واقع نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو عارضی ہوتی ہے۔ بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہِ راست پر لانا اسی وقت ممکن ہے جب پورا ماحول سنورے اور پورا ماحاول سنورنا اس وقت ممکن ہے جب ذہین لوگ کارفرما طبقہ اصلاح قبول کرے۔"[1]

یعنی پست حال طبقات کو محض کلمہ نماز سکھا دینے سے دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا نہیں ہوتا۔ یہ ادائیگی تو اسلام کو بحیثیت نظام نافذ کرنے سے ہو گی مگر گذشتہ دور میں داعیوں نے اس سے صرف نظر کئے رکھا لٰہذا دعوت و تبلیغ کے مشن میں کامیابی بھی جزوی ہی رہی۔

۵۔ مبلغین کی بے عملی

تبلیغ کی ناکامی کا ایک اہم سبب مبلغین کی اپنی بے عملی رہی ہے۔ یعنی مبلغین نے محض نظام اسلام کی خوبیاں بتائیں مگر آگے بڑھ کر اسلام کو بحیثیت ثمر آور نظام نافذ کرنے کی طرف دعوت نہیں دی۔ مبلغین اسلام کی تمدنی و اجتماعی برکات بتاتے رہے مگر اسلامی سوسائٹی ان برکات سے خالی اور جاہلیت کے مفاسد سے بھری رہی۔ لٰہذا دعوت لاحاصل رہی۔ اگر مبلغین ایک اسلامی سوسائٹی بھی تعمیر کر کے دکھاتے اور محض شاندار تاریخ سے کام چلاتے کی کوشش نہ کرتے تو نتائج مختلف ہوتے۔

۶۔ مبلغین کا مطلوبہ علمی معیار سے خالی ہونا

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن کے مقدمے میں لکھا کہ ۔۔۔ اور درست ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان کسی

---

1 اصلاحی، امین احسن، مولانا، دعوت دین اور اس کا طریق کار: ص ۲۴

اور کام کے لئے مہارت حاصل کرنے کو ضروری سمجھیں یا نہ سمجھیں، دو کاموں کے لئے کسی قابلیت کی ضرورت نہیں ایک تبلیغ دین اور دوسرے امامت۔ گو کہ قرونِ اعلیٰ میں اسی فریضہ کے لئے اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے حاملین کو مخصوص کیا جاتا تھا۔ اور یہ تاثر عام تھا کہ جس دلسوزی اور محنت و مشقت کے ساتھ آنحضور ﷺ نے ہم تک دین کو پہنچایا ہمیں اسی طرح دوسروں تک پہنچانا ہے۔ اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ہر چیز کو قربان کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مگر عصر حاضر میں بنیادی تعلیمات کے حصول کے بغیر ہی تبلیغ کو مشق ستم بنالیا جاتا ہے نتیجہ ناکامی ہے۔

۷۔ دعوت کی سرپرستی سے محرومی

موجودہ زمانوں میں داعیان یا مبلغین ہمیشہ ذاتی حوالوں سے فریضہ تبلیغ کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں یا پھر جماعتیں جو یہ کام کرتی ہیں وہ بھی غیر حکومتی ہیں۔ جبکہ ایک ایسا عہد گذرا ہے جس میں وعظ کہنے والا سردار یا قاضی ہوتا تھا۔ اور حکومت وقت کفالت کرتی تھی۔ حکومتی سرپرستی سے محرومی کی وجہ سے وسائل میں بھی مشکلات آئیں اور دیگر مشکلات کی وجہ سے دعوت لاحاصل ہوتی گئی۔ عہد نبوی میں اگر دیکھیں تو مکہ مشقتوں اور اذیتوں اور صبر و برداشت کے ساتھ تبلیغ کے جواب میں کل اڑھائی تین سو افراد مسلمان ہوئے۔ لیکن جب مدینہ میں آپ ﷺ نے سربراہ ریاست کی حیثیت سے تبلیغ کی تو بہت زیادہ لوگ آئے اور سارا ملک مسلمان ہو گیا۔ یعنی مکہ میں آپ انفرادی حیثیت سے دعوت کا فریضہ انجام دیتے رہے لیکن وہاں اس نئے نظریہ کی عملی صورت آنکھوں کے سامنے نہ تھی لوگوں کے دلوں میں شبہات تھے اور لوگ اس کو خیالی تحریک سمجھے بیٹھے تھے جو چند دنوں میں دم توڑ جائے گی۔ اس وقت صرف غیر معمولی ذہانت اور سمجھ کے افراد ہی اس پر ایمان لائے جن کی بصیرت نے اس نئے نظام میں انسانیت کی فلاح کو پہنچان لیا تھا۔ لیکن جب مدینہ میں آپ سربراہ ریاست کی حیثیت سے دعوت کی بات کرتے تو اس وقت اس نظام فکر پر ایک مکمل نظام حیات قائم ہو چکا تھا اور ظاہری آنکھوں سے اس میں حقیقت اور پختگی نظر آتی تھی تب عوام الناس کے اندازے غلط ہوئے اور جوق در جوق وہ اس دعوت کی طرف لپکے (بعد میں خلفاء راشدین آنحضرت ﷺ کے عہد اور بعد کے ادوار میں جب تک دعوت کا کام حکومت کے ہاتھ میں رہا تو دعوت کامیاب رہی اور جب یہ افراد کے ہاتھوں میں آیا تو کام صرف نماز، روزے کی تلقین تک رہ گیا۔

درج بالا تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ دعوت دین کی کامیابی کے لئے اقتدار کی سرپرستی نہایت ضروری ہے اس سے محرومی دعوت کی ناکامی کا ایک سبب ہے۔

خود آزمائی

1۔ دعوت دین میں اصول و منہج دعوت کی اہمیت بیان کریں۔

2۔ قرآن حکیم کی روشنی میں دعوتی اصول بیان کریں۔

3۔ حکمت سے کیا مراد ہے ؟ دعوت و تبلیغ میں اس کیا اہمیت ہے ؟

4۔ مجادلہ احسن سے کیا مراد ہے ؟ مجادلہ کی اقسام اور اصول بیان کریں۔

5۔ دعوت دین میں تدریج کی حکمت عملی کی اہمیت اور تاثیر بیان کریں۔

6۔ دعوت دین میں عدم اکراہ سے کیا مراد ہے ؟اس کے عملی پہلو کون سے ہیں ؟

7۔ رفق اور نرمی کی دعوت دین میں کیا اہمیت ہے ؟ قرآن و سنت کی روشنی میں بحث کریں۔

8۔ دعوت دین میں ناکامی کے علمی و عملی اسباب کی وضاحت کریں۔

ماخذ و مصادر

حکمت تبلیغ	سید ابوالا علیٰ مودودی
منہج دعوت نبوی	شوکت علی شوکانی
بنیادی اصول دعوت اور مجادلہ کا دائرہ کار	محمد نورالحسن ضیا
صحابہ کرام کا اسلوب دعوت	ڈاکٹر محمد اکرم ورک

یونٹ نمبر 4

تاریخ دعوت: انبیائے کرام علیہم السلام

تالیف:

ڈاکٹر محمد سجاد

فہرست

صفحہ نمبر

یونٹ کا تعارف	126
یونٹ کے مقاصد	127
1۔ انبیاے کرام علیہ السلام کا مقصدِ بعثت	129
2۔ انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیاء کرام علیہ السلام کی بعثت	129
3 ۔ تمام قوموں میں انبیاء کرام علیہ السلام بھیجے گئے	132
4۔ انبیاء کرام علیہ السلام ایک ہی دین کے علم بردار تھے	133
5۔ دعوت انبیاء کرام علیہ السلام کے مشترکہ نکات	134
5.1۔ توحید	136
5.2۔ رسالت	137
5.3۔ عقیدۂ آخرت	139
5.4۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کی یاددہانی	140
5.5۔ انعاماتِ الٰہی پر شکر کی تلقین	143
5.6۔ فساد اور سرکشی پر تنبیہ	145
5.7۔ توبہ واستغفار کی تلقین	147
5.8۔ پچھلی اقوام کے انجام سے ڈرانا	149
6۔ دعوت انبیاء کرام علیہ السلام کے مخاطبین اور طریق دعوت	154
6.1۔ دعوت میں تدریج	157
6.2۔ صبر وبرداشت، عفوودرگذر	157
6.3۔ دعوت کے ساتھ مادی اسباب کی فراہمی	157
6.4۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دعوتی منہج کا نمونہ	158

6.5۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے طریق دعوت کا نمونہ	160
7۔ انبیائے کرام علیہ السلام کی دعوت قبول نہ کرنے والوں کی عادات وخصائل	161
7.1۔ انکارِ حق	161
7.2۔ استکبار فی الارض	165
7.3۔ آخرت سے غفلت	167
7.4۔ مفاد پرستی	170
خود آزمائی	172
ماخذ و مصادر	172

یونٹ کا تعارف

انبیاء علیہم السلام کائنات کی سب سے برگزیدہ ہستیاں تھیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کی نشر واشاعت کے لیے خود کو وقف کیے رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت، بصیرت اور غیر معمولی دانائی سے نوازا تھا۔ استقامت اور اولوالعزمی کے عظیم ترین جوہر ان کی ذات میں موجود تھے۔ قرآن مجید نے سابقہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور بالخصوص ان کے دعوتی اسلوب کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کے بعد دعوت کے اسلوب کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام کی سیرت کے جو پہلو سامنے آتے ہیں ان میں ایک بنیادی چیز استقامت ہے۔

انبیاء علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دیتے ہوئے اس راستے میں آنے والی تکالیف کو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا۔ انبیاء علیہم السلام اپنی دعوتی سرگرمیوں کے حوالے سے فقط اللہ تبارک وتعالیٰ سے اجر کے طلب گار رہے اور انہوں نے اس حوالے سے لوگوں سے کسی قسم کے اجر یا مال کی تمنا نہیں کی۔ چنانچہ سورہ شعراء کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ حضرت نوح، حضرت لوط حضرت شعیب اور حضرت صالح علیہم السلام نے دعوت دین کے ساتھ ساتھ یہ الفاظ بھی کہے کہ "اور نہیں میں سوال کرتا اس پر کسی اجرت کا میری اجرت فقط رب العالمین کے ذمے ہے۔" انبیاء علیہم السلام اپنی دعوت کے بدلے دنیا والوں سے کسی قسم کے مفادات یا مال کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ ہمہ وقت اللہ تبارک وتعالیٰ سے اجر کے امیدوار رہے۔

انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں حکمت ودانائی کا پہلو بھی پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ستارہ پرستوں کا تجزیہ کیا تو آپؑ نے ستارے کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر یہ بات کہی کہ مجھے ڈوب جانے والوں سے۔ محبت نہیں، چاند کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر آپؑ نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہدایت کو طلب کیا اور سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر آپؑ نے اس بات کا اعلان کر دیا کہ میں اپنے چہرے کا رخ کر لیا، اس کے لیے جس نے آسمانوں وزمین کو پیدا کیا یکسو ہو کر اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں کے لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف لانے کے لیے توحید کے مشترکہ نکتے پر جمع ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ اہل کتاب کو جب بھی سیدھے راستے کی طرف آنے کی دعوت دی گئی تو ان کو یہ بات بھی کہی گئی کہ اس نکتے کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور نہ اس کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں گے۔ انبیاء علیہم السلام نے توحید کی آفاقی

دعوت کو نکتہ مشترکہ کے طور پر اجاگر کر کے بنی نوع کو اس پر مجتمع ہونے کی بھی دعوت دی۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں تدریج کا پہلو بھی پایا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ انسانوں کو رفتہ رفتہ دین کی طرف دعوت دیتے۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور مسلمانوں کو اس کے تمام احکامات کو بغیر کسی کمی بیشی کے ماننا واجب ہے۔ لیکن نزول وحی کے دور میں بہت سے معاملات پر اہل دین کی بتدریج اصلاح کی گئی۔ شراب اور جوئے کی حرمت سے قبل ان کے نقصانات سے اہل ایمان کو آگاہ کیا گیا۔ جب ان کے نقصانات کے حوالے سے اہل ایمان کو شرح صدر حاصل ہو گیا تو نبی کریم ﷺ نے اللہ کے حکم پر شراب اور جوئے کو حرام قرار دے دیا۔ انبیاء علیہم السلام کے اسلوب دعوت میں علم اور دلائل کا پہلو بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور وہ ہمیشہ بات کو دلائل کی بنیاد پر لوگوں کے سامنے رکھتے اور وحی الٰہی کے ذریعے ملنے والے پیغامات کو بڑے مدلل انداز میں لوگوں کے سامنے رکھتے رہے۔ چنانچہ دین کی دعوت دینے والوں کو دلائل شریعہ کو مدلل انداز میں لوگوں کے سامنے رکھنا چاہیے تاکہ اعمال اور عقائد کی اصلاح ہو سکے۔

انبیاء علیہم السلام کے اسلوب دعوت پر عمل کرنے کے ساتھ یقیناً مخلوق کی اصلاح کے امکانات بڑھ سکتے ہیں اور یہ یہی طریقہ اور اسلوب دعوت در حقیقت عوام کی اصلاح پر منتج ہو سکتا ہے۔ اس یونٹ میں انبیائے کرام علیھم السلام کی دعوت اور منہج پر بحث کی گئی ہے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ انبیاء کرام علیہ السلام کی سیرت کا مطالعہ کر سکیں۔

2۔ دعوت انبیائے کرام علیہ السلام کے بنیادی نکات جان سکیں۔

3۔ دعوت انبیائے کرام علیہ السلام کے مشترکہ نکات کا مطالعہ کر سکیں۔

4۔ انبیائے کرام علیہ السلام کے دعوتی منہج و اسلوب سے واقف ہو سکیں۔

5۔ دعوت انبیائے کرام علیہ السلام کی خصوصیات کا مطالعہ کر سکیں۔

تمہید

قرآن مجید میں گذشتہ انبیاء کرام اور ان کی قوموں کے احوال کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔انبیاء کے واقعات سے نزول قرآن کے وقت کے مخاطبین اور بعد کے ادوار کے مخاطبین کو عبرت و نصیحت دلانا مقصود ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾[1]

(بے شک ان کے قصوں میں عقل والوں کے لئے عبرت ہے)

داعیٔ اعظم رسول اکرم ﷺ کو اور آپ کے بعد آپ کے ذریعے سے قیامت تک حق کی دعوت دینے والوں کو انبیاء کے اسوہ سے تسلی دلانا مقصود ہے کہ مسائل و مشکلات دعوت کی راہ کا لازمی حصہ ہیں اور ان کو باحسن طریق برداشت کرنا بلندی درجات کا موجب ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

﴿وَكُلًّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ وَجَاءَكَ فِي هَذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ﴾[2]

(اور ہر ایک قصہ جو ہم آپ سے بیان کرتے ہیں اس لئے کہ آپ کے دل کو ثبات عطاء کریں اور اس میں آپ کے پاس حق اور مومنوں کے لئے ذکر اور نصیحت آئی ہے)

یعنی آنحضور ﷺ کے دل کو ثابت قدم رکھنے کے علاوہ اہل ایمان کے لئے ہدایات ہے اور عام مخاطبین کے لئے بھی نصیحت ہے کہ وہ عذاب میں گرفتار اور انعام کی مستحق قوموں کے حالات کے علم سے اس نتیجے پر پہنچیں کہ اللہ تعالی کا قانون اٹل ہے اس کے قاعدے اور ضابطے مستقل ہیں قرآن مجید میں ارشاد ہے

﴿سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا﴾[3]

(جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں ان کے بارے میں بھی اللہ تعالی کی سنت یہی رہی ہے اور تم اللہ تعالی کی سنت میں (آئندہ بھی) کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے)

---

1 سورۃ یوسف ۱۲:۱۱۱

2 سورۃ ھود ۱۱:۱۲۰

3 سورۃ الاحزاب ۳۳:۶۲

اسی طرح اللہ تعالیٰ ہدایات فرماتا ہے۔

﴿ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴾[1]

ترجمہ:-"تم سے پہلے بھی دنیا میں احکام و قوانین کے نتائج گزر چکے ہیں پس ملکوں کی سیر کرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا"

1۔انبیائے کرام علیہ السلام کا مقصدِ بعثت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو زمین میں آباد کرتے وقت ان کی ضرورت کی تمام چیزیں فراہم کر دیں اور کائنات کی تمام قوتوں کو ان کی خدمت میں لگا دیا۔ ان کے اعضا و جوارح ان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں اور نباتات و حیوانات ان کی غذائی اور دوسری ضرورتوں کی تکمیل میں۔ چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، دریا اور دوسرے مظاہر نظام کائنات میں توازن قائم کیے ہوئے ہیں۔ ہوا، پانی، روشنی وغیرہ سے ان کی زندگی کا تسلسل قائم ہے۔ ان مادی ضروریات کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کی روحانی ضرورت کی تکمیل بھی فرمائی ہے۔ اس نے ابتدا ہی سے اس کا بھی انتظام کر رکھا ہے کہ انسانوں کو معلوم ہو کہ انھیں کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ انھیں پیدا کرنے والا کون ہے اور وہ ان سے کیا چاہتا ہے؟ دنیا میں انھیں کس طرح زندگی بسر کرنی ہے؟ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے؟

﴿ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴾[2]

"اور ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

2۔انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیا کرام علیہ السلام کی بعثت

ابتداء میں تمام انسان راہِ راست پر قائم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں زندگی گزارنے کا جو طریقہ بتایا تھا اس پر وہ عمل پیرا

1 سورۃ آل عمران ۳:۱۳۷

2 سورۃ البقرہ ۲:۳۸-۳۹

تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان میں انحراف آنے لگا، نفسانی خواہشیں سر اٹھانے لگیں اور وہ سیدھے راستے سے اِدھر اُدھر بھٹکنے لگے۔ اس وقت ان کے درمیان اتحاد واتفاق باقی نہ رہ سکا۔ کچھ لوگ سیدھی راہ پر قائم رہے اور کچھ لوگ غلط راہوں پر جاپڑے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے:

﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا﴾[1]

(ابتداءً سارے انسان ایک ہی امت تھے، پھر انھوں نے اختلاف کیا۔)

اس آیت میں "لوگوں کے ایک امت ہونے" کی بات کہی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابتداء میں راہِ حق پر قائم اور ہدایت یافتہ تھے: ابن عباس کا قول ہے **کلھم علی شریعة من الحق** اور قتادہ کہتے ہیں **کانوا علی الھدیٰ جمیعاً**[2] امام رازی نے لکھاہے: **انھم کانو علی دین واحد وھوالایمان والحق وھو قول اکثر المحققین**،[3]

بعد میں ان میں اختلاف برپاہوا۔ اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ بعد کے زمانوں میں تمام لوگ راہِ حق پر قائم نہ رہ سکے۔ بعض لوگوں میں طرح طرح کی بُرائیاں پیدا ہو گئیں۔ انھوں نے مختلف مظاہر کائنات کو خدائی میں شریک کرلیا، سورج، چاند، ستاروں، درختوں، جانوروں اور دریاؤں وغیرہ کی پرستش شروع کردی۔ مٹی پتھر کے بت بناکر انھیں پوجنے لگے۔ انسانی آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی اور مختلف قومیں وجود میں آگئیں۔ ان قوموں کے مذاہب جدا جدا ہو گئے۔ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کو فراموش کرکے اپنی خواہشوں کی پیروی شروع کردی۔ جاہلی رسمیں ایجاد کرلی گئیں اور انھی حقیقی دین سمجھا جانے لگا۔

﴿إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ﴾[4]

(یہ تمھاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمھارا رب ہوں، مگر یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ انھوں نے آپس

---

1 سورۃ یونس ۱۰: ۱۹

2 ابو جعفر محمد بن جریر طبری، جامع البیان عن تاویل آی القرآن، دار المعارف مصر ۶۷۲/۴،

3 فخر الدین الرازی، مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر، المکتبۃ التوفیقیہ، مصر ۱۱/۶

4 سورۃ الانبیا ۲۱: ۹۲-۹۳

میں دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے۔)

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر بھیجے اور ان کے ساتھ اپنی روشن تعلیمات بھی بھیجیں۔ تاکہ لوگوں کے درمیان حق اور باطل، صحیح اور غلط کھل کر سامنے آجائے۔ ان پیغمبروں نے ان کے سامنے اللہ کا پیغام پیش کیا، ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، شرک وبت پرستی سے روکا اور صاف الفاظ میں انھیں آگاہ کیا کہ کن کاموں سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور کن کاموں سے ناراض۔ اس طرح پیغمبروں اور ان کی لائی ہوئی تعلیمات کے ذریعے لوگوں کے اختلاف کا فیصلہ ہو گیا اور حق وباطل میں امتیاز قائم ہو گیا۔ قرآن مجید کہتا ہے:

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنذِرِيْنَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ﴾[1]

(ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو (راست روی پر) بشارت دینے والے اور (کج روی کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی، تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے، ان کا فیصلہ کرے۔)

اس آیت میں انبیا کے لیے ''مبشرین'' بشارت دینے والے اور منذرین ڈرانے والے کے الفاظ آئے ہیں۔ مبشرین کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرنے والوں اور اس کے حکموں پر چلنے والوں کو بے پایاں اجر وانعام اور اچھے ٹھکانے کی خوش خبری دیتے ہیں اور منذرین کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور کفر کی روش اختیار کرنے والوں کو وہ سخت سزا، زبردست بازپرس اور ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈال دیے جانے سے ڈراتے ہیں۔

یہ اوصاف، جو انبیاے کرام علیہ السلام کے فریضۂ منصبی اور مقصدِ بعثت کی وضاحت کرتے ہیں، قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بیان کیے گئے ہیں:

﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ إِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنذِرِيْنَ﴾[2]

(ہم جو رسول بھیجتے ہیں، اسی لیے تو بھیجتے ہیں کہ وہ (نیک کردار لوگوں کے لیے) خوش خبری دینے والے اور (بدکرداروں کے لیے) ڈرانے والے ہوں۔)

---

1 سورۃ البقرہ ۲: ۲۱۳

2 سورۃ الانعام ٦: ۴۸

آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ﴾[1]

(اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے۔)

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ انبیاے کرام علیہ السلام اپنی قوموں کے پاس "بیّنات" لے کر گئے۔ "بیّنۃ" واضح دلیل کو کہتے ہیں خواہ وہ عقلی ہو یا حِسّی، اس کا اطلاق انبیا کو دیے جانے والے معجزات پر بھی کیا گیا ہے اور ان کے ذریعے انسانوں کو بھیجی جانے والی ہدایات اور تعلیمات پر بھی۔

3۔ تمام قوموں میں انبیا کرام علیہ السلام بھیجے گئے

انسانی آبادی دنیا میں جہاں جہاں پھیلی اور جوں جوں اس میں گم راہی عام ہوئی اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت کا سامان کیا۔ چنانچہ اس نے اپنے برگزیدہ بندوں کو صحیح تعلیمات اور واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا۔ یہ انبیا تمام قوموں میں مبعوث کیے گئے۔ البتہ قرآن میں صرف ان چند بڑی بڑی قوموں کے احوال ہیں جن سے اہل عرب واقف تھے۔ ان کے پاس بھیجے جانے والے پیغمبروں اور ان کی دعوت کا بھی تذکرہ ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ یہ ہادی و رہ نما اور بشارت دینے والے اور ڈرانے والے ہر قوم میں بھیجے گئے۔ آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے قرآن ک مجید کہتا ہے:

﴿ إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾[2]

(تم تو محض خبردار کر دینے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک رہ نما ہے۔)

﴿ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ﴾[3]

(ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اور کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔)

---

1 سورۃ الروم ۳۰: ۴۷

2 سورۃ الرعد ۱۳: ۷

3 سورۃ فاطر ۳۵: ۲۴

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الأَوَّلِيْنَ﴾ [1]

(اے نبی! ہم تم سے پہلے بہت سی گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں۔)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی خطۂ زمین کے انسانوں کو اس حال میں نہیں رہنے دیا کہ ان تک اس کی ہدایت نہ پہنچی ہو۔

4۔انبیا کرام علیہ السلام ایک ہی دین کے علم بردار تھے

قرآن مجید ایک دوسری حقیقت کو بھی واشگاف کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف علاقوں اور خطوں میں اور مختلف قوموں میں جتنے بھی انبیا بھیجے سب ایک ہی دین کے علمبردار تھے اور سب کی بنیادی دعوت ایک ہی تھی۔ ہر نبی کو اسی چیز کی وحی کی گئی تھی کہ اس کائنات کو وجود بخشنے والا اور انسانوں کو پیدا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لیے وہی اس بات کا مستحق ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ ہر نبی نے اپنی قوم سے اسی کا مطالبہ کیا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ﴾ [2]

(ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔)

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللّهَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ﴾ [3]

(ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ ''اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔)

اس آیت میں انبیا کی بنیادی دعوت، یہ قرار دی گئی ہے کہ ''اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو'' عربی زبان میں طاغوت کا مادہ ''طغیٰ'' ہے،اس کے معنی حد سے آگے بڑھنے، سرکشی کرنے کے ہیں۔ طاغوت میں ہر وہ چیز داخل ہے،

---

1 سورۃ الحجر ۱۵: ۱۰

2 سورۃ الانبیاء ۲۱: ۲۵

3 سورۃ النحل ۱۶: ۳۶

جس کی اللہ واحد کو چھوڑ کر، پرستش کی جائے۔ علامہ ابن کثیرؒ نے ان آیات کی تشریح میں لکھا ہے:

''اللہ تعالی نے ہر زمانے میں اور لوگوں کے ہر گروہ کے پاس ایک رسول بھیجا۔ یہ سب اللہ کی عبادت کی دعوت دیتے تھے اور اس کے علاوہ دوسروں کی عبادت سے روکتے تھے۔ سب سے پہلے بنو آدم میں قوم نوح میں شرک پھیلا، اس وقت اللہ تعالٰی نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کے پاس بھیجا۔ وہ پہلے رسول تھے، جنھیں اللہ نے اہل زمین کے پاس بھیجا تھا۔ اس کے بعد وہ برابر لوگوں کی طرف رسول بھیجتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رسالت کا خاتمہ کر دیا۔ آپ ﷺ کی دعوت روئے زمین کے تمام انسانوں اور جنات کے لیے عام تھی۔''[1]

قرآن حکیم میں مختلف قوموں کے احوال اور ان کی طرف بھیجے جانے والے پیغمبروں کا تذکرہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی دعوت بھی زیر بحث آئی ہے۔ ہر پیغمبر نے اپنی قوم سے ایک ہی چیز کا مطالبہ کیا: ''صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے احکام سے سرتابی نہ کرو۔'' سورۂ الاعراف اور سورۂ ہود میں قوم نوح، عاد، ثمود اور مدین وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ ہر قوم سے اس کے پیغمبر نے یہی کہا:

﴿يَاقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾[2]

''اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔''

ان قوموں کا تذکرہ سورۂ الشعرا میں بھی ہے۔ وہاں ہر نبی کی دعوت ان الفاظ میں مذکور ہے:

﴿أَلَا تَتَّقُونَ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ﴾[3]

''کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔''

5۔ دعوت انبیائے کرام علیہ السلام کے مشترکہ نکات

دنیا کے مختلف علاقوں اور زمانوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا بھیجے۔ انھوں نے اپنی اپنی قوموں تک اللہ تعالی کا پیغام پہنچایا اور اس کے احکام و تعلیمات سے انھیں روشناس کیا۔ قرآن کریم میں انبیا اور ان کی قوموں کے احوال و واقعات کے ضمن

1 ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم ۳/۳۹۹۲

2 سورۃ الاعراف ۷:۵۹

3 سورۃ الشعراء ۲۶:۱۷۹

میں دعوت انبیا کے مختلف پہلوئوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان میں بتایا گیا ہے کہ ان انبیا نے اپنی اپنی قوموں کے افراد کو کن باتوں کا حکم دیا اور کن کاموں سے روکا؟ کن عقائد کی تعلیم دی اور کن معتقدات وتصورات کی مذمت کی؟ کن رویّوں پر اللہ تعالٰی کے اجر وانعام کی خوش خبری سنائی اور کن کاموں کے بُرے انجام سے ڈرایا؟ان سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ کچھ بنیادی تعلیمات ایسی ہیں جو انبیاے کرام کی دعوت میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔کوئی پیغمبر کسی زمانے کا ہو اور کسی علاقے میں بھیجا گیا ہو،اس نے اپنی قوم کو ان سے ضرور باخبر کیا ہے، لیکن کچھ تعلیمات ایسی ہیں جن کا تذکرہ صرف بعض پیغمبروں کی دعوتوں میں آیا ہے۔تمام انبیا نے اپنی قوموں کے سامنے بنیادی عقائد توحید، رسالت، آخرت اور ان کے دلائل پیش کیے ہیں اور الٰہ واحد کی عبادت پر زور دیا ہے۔تمام انبیا کی دعوت میں اشتراک پایا جاتا ہے اور وہ ایک ہی مشن کے حامل تھے،اس کا اظہار سورۃالشوریٰ کی اس آیت سے بھی ہوتا ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ﴾[1]

(اس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمد ﷺ) اب تمھاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں۔اس تاکید کے ساتھ کہ قایم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔)

اس آیت میں اللہ تعالٰی اپنے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ ہم نے جو دین تمھاری طرف وحی کیا ہے اسی کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کو بھی بھیجا تھا۔حضرت نوح علیہ السلام سب سے پہلے صاحبِ شریعت رسول ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخری۔درمیان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیے گئے جو اوالوالعزم رسولوں میں سے تھے۔ان رسولوں کا یکجا تذکرہ سورۃ الاحزاب آیت ے میں بھی ہوا ہے۔یہ تمام رسول جو دین لے کر آئے تھے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ ان آیات میں خاص طور سے مذکورہ رسولوں کا تذکرہ اس لیے کیا گیا کہ وہ اصحاب شرائع ہیں یا ان پر ایمان لانے والوں کی بڑی جمعیت ہے۔

---

1 سورۃالشوریٰ ۴۲:۱۳

5.1۔توحید

رسول کی دعوت کا بنیادی نقطہ توحید ہی ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو غیر اللہ کی بندگی سے روکا اور اللہ واحد کی عبادت کرنے کی تلقین کی سورۃ الاعراف میں آپ کی دعوت کے حوالے سے آتا ہے۔

﴿يَاقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ [1]

(پس آپ نے فرمایا اے میری قوم اس اللہ کی عبادت کرو جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے)

توحید ہی ہر داعی کی دعوت کا نقطہ آغاز رہا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی قوم کو شرک میں مبتلا پایا۔ شرک ایسی برائی ہے جس سے دیگر برائیاں پھوٹتی ہیں شرک جہالت کی پیداوار اور جہالت کو فروغ دینے کا ذریعہ ہوتا ہے۔اللہ کے رسول توحید کے علمبردار اور علم کی اشاعت پر مامور ہوتے ہیں۔ چنانچہ توحید ہی تمام انبیاء کی دعوت میں مشترک حقیقت ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں۔

"تمام فساد فی الارض کی جڑ شرک ہے کسی قوم کے شرک میں مبتلا ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ نظریات وعقائد اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اعمال واخلاق ہر چیز میں فطرت کی صراط مستقیم سے منحرف ہوگئی ہے اور اب زمین میں اس کا بڑھنا کسی خیر و صلاح کا بڑھنا نہیں، بلکہ شر و فساد بڑھنا ہے اور جب تک یہ قوم باقی رہے گی اس کے ہاتھوں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں فساد ہی کو فروغ حاصل ہوگا اس وجہ سے اللہ کے رسول اپنی اصلاح کی دعوت اسی اصل نقطہ سے شروع کرتے ہیں یہ چیز انبیاء ورسل کی دعوت کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی نبی کی دعوت بغیر اس خصوصیت کے پائی جائے۔[2]

﴿أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ﴾ [3]

(اے میری قوم) اللہ کی عبادت کرو اس کی حدود کی پابندی کرو اور میری اطاعت کرو)

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کی وضاحت ہو رہی ہے۔ توحید اور اللہ کی شریعت کی پابندی اور رسول کی اطاعت حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے بنیادی ارکان بتائے گئے ہیں اور تمام انبیاء کی دعوت کے عناصر ہیں۔ باقی تمام امورِ

---

1 سورۃ الاعراف ۷: ۵۹

2 اصلاحی، امین احسن، مولانا م تدبر قرآن، ج ۲ ص

3 سورۃ نوح ۷۱: ۳

دین انہی تین بنیادی ارکان پر منحصر ہیں۔ان کو چھوڑ دینا گویا اصل راہ کو چھوڑ دینا ہے اور اس کے اختیار کرنے اور اس پر عمل کرنے کے بغیر فلاح کا کوئی تصور نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے حالت جاننے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کا سارا زور توحید کے اثبات پر تھا۔ شرک، بت پرستی، کواکب پرستی غرض ان گنت خداؤں کے ماننے والوں کو ایک خدا کی خدائی تسلیم کرنے پر آمادہ کرنا آپ کی دعوت کا نکتہ آغاز تھا۔ توحید ہی وہ بنیادی اور مرکزی عقیدہ ہے کہ باقی تمام عقائد اور معاملات اسی ایک بنیاد کے ساتھ منسلک ہیں۔اور جب تک قوم توحید کو تسلیم نہ کرے باقی معاملات کی دعوت دینا بے فائدہ ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوہ میں توحید کے اثبات پر تفصیلی دلائل ملتے ہیں۔ فرمایا:

﴿إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ۔ قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ۔ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ۔ قَالُوا أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنْتَ مِنَ اللَّاعِبِينَ۔ قَالَ بَلْ رَبُّكُمْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ وَأَنَا عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ﴾[1]

(جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا یہ کیا مورتیں ہیں جن پر تم دھرنا دئے بیٹھے ہو۔انہوں نے جواب دیا ہم نے اپنے باپ دادا کو انہی کی عبادت کرتے پایا۔اس نے کہا تم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی ایک کھلی گمراہی میں مبتلا رہے۔انہوں نے پوچھا یہ جو کچھ تم ہمارے سامنے پیش کررہے ہو سنجیدہ بات پیش کررہے ہو یا ہنسی مسخری کررہے ہو۔ اس نے کہا بلکہ تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور میں اس پر تمہارے سامنے گواہی دینے والوں میں سے ہوں)

درج بالا آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے آغاز کی صورت حال بیان کی جارہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم پر بتوں کی بے بسی واضح کرنا چاہی اور ان کے طریقے کو گمراہی اور حق ناشناسی قرار دیا۔

5.2۔رسالت

عقیدۂ رسالت ہر نبی اور رسول کی دعوت کے بنیادی نکات میں سے ہے۔ رسالت عقیدۂ توحید کے اثبات کا لازمی ذریعہ

1 سورۃ الانبیاء ۲۱: ۵۲تا۵۶

ہے۔ عقیدۂ توحید کا درست فہم اور اس کے مطابق عمل اسی صورت میں ممکن ہے جب انسانوں کے پاس اس کا درست علم ہو اور اس کا درست علم اللہ تعالی نے اپنے رسولوں کے ذریعے فراہم کیا ہے۔ ہر رسول نے اپنی قوم کو اس بات کا اعلان کیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اپنی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ مگر ان کی قوم نے ان کو جھٹلایا، ان کی رسالت کا اقرار نہ کیا اور ان پر الزامات لگائے۔ مگر انہوں نے ان الزامات کی تردید کی اور اپنی رسالت کی تائید میں دلائل پیش کئے۔ سورۃ اعراف میں ارشاد ہے۔

﴿قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي ضَلَالَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنْصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَلَى رَجُلٍ مِنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾[1]

(اے میری قوم میں کسی گمراہی میں پڑا ہوا نہیں ہوں بلکہ رب العالمین کا رسول ہوں۔ میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا ہے کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمہارے رب کی یاددہانی آئی تاکہ تمہیں خبر دار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ تاکہ تم پر رحم کیا جائے)

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی تو انہوں نے آپ پر گمراہی کا الزام لگا دیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے وضاحت فرمائی کہ میں گمراہ نہیں ہوں بلکہ اپنے رب کا رسول ہوں۔ آپ کے بیان سے ان تمام شبہات اور اعتراضات کی نفی ہوتی ہے جو عام طور پر رسالت پر لگائے جاتے ہیں اور اپنا مقصد رسالت بھی بتایا کہ میں اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں اور تمہارے خیر خواہی چاہتا ہوں کہ تم عذاب سے بچ جاؤ۔ نیز یہ کہ رسول کا انسان ہونا اس کی رسالت میں مانع نہیں ہے۔ جیسا کہ تمہارا خیال ہے۔ حالانکہ رسول کا مقصد تو محض لوگوں کو ان کے اعمال کے انجام کی خبر دینا اور آگاہ کرنا ہے تاکہ وہ غلط روش سے بچ سکیں اور رحم کے مستحق ہو سکیں۔ لہٰذا حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اپنی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت میں رسالت کا بھی اثبات کیا گیا

---

1 سورۃ الاعراف ۷:۶۱، ۶۲

ہے۔ قرآن مجید کی رو سے رسالت دعوت کا اہم ترین حصہ ہے کیونکہ داعی دعوت کے کامیاب ابلاغ کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رسالت کے بارے میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے۔

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا﴾ [1]

(اے پیغمبر کتاب میں سے ابراہیمؑ کا ذکر کریں وہ یقیناً سچے اور نبی تھے)

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رسالت کی خود خبر دے دی ہے خواہ لوگ اس کو جھٹلائیں اور پھر انہوں نے اپنی قوم کے آگے اپنی اس منصب کے لئے اہلیت بھی ثابت کی قرآن مجید میں ارشاد ہے

﴿يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا﴾ [2]

(اے میرے باپ میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ تو آپ میری پیروی کریں، میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دلائل سے یہ بتایا کہ میرے پاس وہ علم ہے جو آپ کے پاس نہیں لہٰذا میری اتباع کی جائے کیونکہ میں سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کروں گا اور یہی ایک رسول کا فرض منصبی ہے۔

5.3۔ عقیدۂ آخرت

انبیاء کرام علیہ السلام کی دعوت کا تیسرا بنیادی نکتہ عقیدۂ آخرت تھا۔ ہر نبی اور رسول اپنی قوم کو یہی حقیقت سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ حیات بعد الممات یقینی ہے اور اخروی زندگی میں فلاح کا دارومدار اس بات پر ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنی زندگی کس طرح گزارتا ہے۔ لہٰذا رسول اپنی قوم کو عقیدہ آخرت کو سمجھنے اور آخرت میں برے انجام سے بچنے کی دعوت دیتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو عقیدۂ آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ انہوں نے واضح کیا کہ عالم آخرت اس دنیا کی نسبت بہت وسیع ہے اور اس دنیا کے تمام اعمال کا حساب رکھا جا رہا ہے۔ اسی کے مطابق آخرت میں فیصلہ ہوگا۔ نیز یہ کہ آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ عقیدۂ آخرت پر پختہ ایمان لایا جائے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔

---

1 سورۃ مریم ۱۹: ۴۱

2 سورۃ مریم ۱۹: ۴۳

﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾[1]

(ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ اپنی قوم کو ڈرائے اس سے پہلے کہ ان پر دردناک عذاب پہنچے)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کو آخرت پر ایمان کی بھی دعوت دی جس کا قوم نے سابقہ اقوام کے رویوں کی طرح سے مذاق اڑایا اور انکار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس رویہ کے انجام کی خبر دی اور خود بھی آخرت کی بھلائی کی دعا کی۔

﴿وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ۔ يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ﴾[2]

(اور جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے اس دن مجھے رسوانہ کرنا اور جس دن نہ مال کام آئے اور نہ اولاد)

حضرت ابراہیم علیہ السلام قوم کو آخرت کے برحق ہونے کا اتنا قوی تصور دیتے ہیں کہ خود آخرت میں اپنے لئے بھی بھلائی کی دعا فرماتے ہیں۔ فطری اور نفسیاتی طریقہ ہے کہ جو چیز خود نبی اور رسول اپنے لئے پسند کر رہا ہے وہی یقیناً قوم کے حق میں بھی بہتر ہو گی۔ لہٰذا آپ نے اس فطری دلیل کو اپنے حق میں تصور آخرت کو منوانے کے لئے استعمال کیا۔

5.4۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کی یاددہانی

دعوتِ انبیا کا ایک بنیادی موضوع یہ ہے کہ وہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات یاد دلاتے ہیں، ان کے سامنے ان دنیوی نعمتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، جن سے اس نے نوازا ہے۔ ان آسائشوں اور خوش حالیوں کا حوالہ دیتے ہیں، جن سے اس نے بہرہ ور کیا ہے، تہذیب و تمدن کی ان ترقیوں کو بیان کرتے ہیں جو انھیں حاصل ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ یہ تم پر اللہ تعالیٰ کے احسانات ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ اس کا شکر بجالاو، صرف اسی کی عبادت کرو، اس کے حکموں پر چلو، اس کی نافرمانی سے بچو اور روئے زمین میں فتنہ وفساد نہ پھیلاؤ۔ بسا اوقات انبیاے کرام دنیوی نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کے اجر وانعام کے طور پر بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی قوموں سے کہتے ہیں کہ اپنی غلط روش سے باز آؤ، اللہ سے معافی مانگو، توبہ واستغفار کرو اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارو۔ اگر ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمھیں اپنی بے پایاں نعمتوں سے نوازے گا، تمھیں خوش حالی عطا کرے گا، مال ودولت اور آل واولاد سے نوازے گا اور تمھیں قوت وشوکت سے بہرہ ور کرے گا۔

---

1 سورۃ نوح ۷۱:۱

2 سورۃ الشعراء ۲۶: ۸۷، ۸۸

قرآن کریم میں دعوتِ انبیا کے جو تذکرے ہیں ان میں یہ دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہدایت کے لیے بارگاہِ الٰہی میں جو دعا کی تھی وہ سورۂ نوح میں مذکور ہے۔ اس میں ان کی دعوت کا بھی تفصیلی بیان ہے، جو انھوں نے قوم کے سامنے پیش کی تھی۔ انھوں نے فرمایا تھا:

﴿ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ بِسَاطًا لِتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴾[1]

(اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمھیں مال و اولاد سے نوازے گا، تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کرے گا۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے لیے تم کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے، حالاں کہ اس نے طرح طرح سے تمھیں بنایا ہے، کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بر تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا، پھر وہ تمھیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکایک تم کو نکال کھڑا کرے گا اور اللہ نے زمین کو تمھارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا، تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو۔)

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو حاصل ہونے والی آسائشوں اور اس کی تمدنی ترقیوں کا تذکرہ کیا اور ان کے حوالے سے اُسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کی تلقین کی۔ فرمایا:

﴿ أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ وَاتَّقُوا الَّذِي أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُونَ أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ وَجَنَّاتٍ وَعُيُونٍ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴾[2]

---

1 سورۂ نوح ۷۱: ۱۰تا۲۰

2 سورۂ الشعراء ۲۶: ۱۲۸تا۱۳۵

(یہ تمھارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بناڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو، گویا تمھیں ہمیشہ رہنا ہے اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبّار بن کر ڈالتے ہو، پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اس سے جس نے وہ کچھ تمھیں دیا ہے جو تم جانتے ہو۔ تمھیں جانور دیے، اولادیں دیں، باغ دیے اور چشمے دیے، مجھے تمھارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔)

دوسری طرف حضرت ہود علیہ السلام نے دنیوی نعمتوں کو راست روی کے اجر وانعام کے طور پر بھی پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا:

﴿وَيَاقَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ﴾[1]

(اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمھاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرم بن کر (بندگی سے) منہ نہ پھیرو۔)

اسی طرح قوم ثمود بھی اپنے زمانے میں دنیوی ترقیات کے عروج پر تھی، لیکن راہِ حق سے بھٹکی ہوئی تھی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اسے یاد دلایا کہ وہ ساری ترقیات تمھیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور نعمت کے طور پر حاصل ہیں، اس لیے اس سے ڈرو اور زمین میں فتنہ وفساد نہ پھیلاؤ۔ فرمایا:

﴿أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا آمِنِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ﴾[2]

(کیا تم ان سب چیزوں کے درمیان، جو یہاں ہیں، بس یوں ہی اطمینان سے رہنے دیے جاؤگے؟ ان باغوں اور چشموں میں؟ ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟ تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ ان میں عمارتیں بناتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔)

---

1 سورۃ ہود: ۵۲

2 سورۃالشعراء: ۱۴۶-۱۵۱

ایک دوسرے مقام پر ہے کہ انھوں نے ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد دلائے:

﴿وَاذْكُرُوٓا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِن بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِى الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ مِن سُهُولِهَا قُصُوراً وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتاً فَاذْكُرُوٓا آلَاءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾[1]

(یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمھیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہم وار میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو، پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔)

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کی کثرتِ تعداد کو اللہ تعالیٰ کے ایک احسان کی حیثیت سے پیش کیا۔ انھوں نے قوم کی گم راہیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلاً فَكَثَّرَكُمْ﴾[2]

(یاد کرو وہ زمانہ جب کہ تم تھوڑے تھے، پھر اللہ نے تمھیں بہت کر دیا۔)

5.5۔ انعاماتِ الٰہی پر شکر کی تلقین

بندوں سے مطلوب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں جن نعمتوں سے نوازا ہے، وہ ان سے فائدہ اٹھائیں اور ان پر اس کا شکر بجا لائیں۔ اللہ کے پیغمبروں کی زبانیں انعاماتِ الٰہی پر شکر گزاری سے تر رہتی تھیں۔ قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بہت سے اوصاف مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

﴿شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ﴾[3]

(وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا)

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی نعمتوں سے نوازا تھا۔ ہواؤں، چرند وپرند اور جنّات وغیرہ کو بھی ان کے لیے مسخر کر رکھا تھا۔ ایک موقعے پر انھوں نے اپنے ایک کارندے کے ذریعے ملکۂ سبا کا تخت منگوایا۔ پلک جھپکتے ہی وہ

---

1 سورۃ الاعراف: ۷۴

2 سورۃ الاعراف: ۸۶

3 سورۃ النحل: ۱۲۱

تخت ان کے سامنے موجود تھا۔ یہ دیکھ کر ان کا دل شکرِ الٰہی کے جذبے سے معمور ہو گیا اور ان کی زبان پر یہ کلمات جاری ہو گئے:

﴿هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ﴾[1]

(یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہو یا کافرِ نعمت بن جاتا ہوں اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔)

پیغمبروں نے اپنی قوموں کو بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اس کی شکر گزاری کی تلقین کی۔ انھوں نے اس کے مختلف احسانات یاد دلائے۔ انھیں سمجھایا کہ بندگی کا تقاضا ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے اور اسی کی عبادت کی جائے، ورنہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، کوئی شکر کرے یا نہ کرے، اللہ کا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستی پر تنقید کرتے ہوئے جب اپنی قوم کو سمجھایا کہ جنھیں تم اللہ واحد کو چھوڑ کر پوجتے ہو وہ تمھاری روزی کے مالک نہیں ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

﴿فَابْتَغُوا عِنْدَ اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ وَاشْكُرُوا لَهُ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾[2]

(اللہ سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔)

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے جیل کے ساتھیوں کے سامنے دعوتِ توحید پیش کرتے ہوئے اسے شکر گزاری کا لازمی تقاضا قرار دیا۔ فرمایا:

﴿مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ذَلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ﴾[3]

(درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر ﴿کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا﴾ مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔)

---

1 سورۃ النمل: ۴۰

2 سورۃ العنکبوت: ۱۷

3 سورۃ یوسف: ۳۸

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کے بے پایاں احسانات یاد دلائے یہ بھی فرمایا:

﴿ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ . وَقَالَ مُوسَى إِنْ تَكْفُرُوا أَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴾[1]

(اور یاد رکھو تمھارے رب نے خبر دار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور کفرانِ نعمت کروگے تو میری سزا بہت سخت ہے اور موسیٰؑ نے کہا کہ اگر تم کفر کرو اور زمین کے سارے رہنے والے بھی کافر ہو جائیں تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔)

خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے مخاطبین کے سامنے زور دے کر یہ بات فرمائی کہ اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرو، اس میں تمھارا ہی بھلا ہے۔ اگر ناشکری کروگے تو اپنے آپ کو نقصان پہنچاؤ گے:

﴿إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضَى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَإِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ﴾[2]

(اگر تم کفر کرو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے، لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو تو اسے وہ تمھارے لیے پسند کرتا ہے۔)

اہل ایمان سے کہا گیا کہ وہ اللہ کی عطا کردہ پاکیزہ غذائوں سے لطف اندوز ہوں اور اس کا شکر بجالائیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ﴾[3]

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں، انھیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔)

5.6۔ فساد اور سرکشی پر تنبیہ

اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کو جائے امن بنایا ہے۔ اس نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق پہچانیں، عدل وانصاف کو لازم پکڑیں اور ظلم و زیادتی سے بچیں۔ لیکن عام طور سے انسانوں نے شیطان کے بہکاوے میں

---

1 سورۃ ابراہیم: ۷، ۸

2 سورۃ الزمر: ۷

3 سورۃ البقرہ: ۱۷۲

آ کر اور اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کر کے دوسروں کے حقوق پر دست درازی کی، انھیں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور اللہ کی زمین کو فتنہ وفساد سے بھر دیا۔ پیغمبروں نے اپنی قوموں کو ان کی سرکشی اور فساد پر سخت تنبیہ کی ہے اور اللہ کی پکڑ سے ڈرایا ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کی قوم تمدنی اعتبار سے بہت فائق تھی۔ لیکن طرح طرح کی بُرائیوں میں مبتلا تھی۔ انھوں نے اسے اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات یاد دلائے اور فساد انگیزی کی روش سے باز آنے کی تلقین کی۔ فرمایا:

﴿فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾[1]

(پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔)

ان کی قوم میں کچھ لوگ بڑے فسادی تھے، فتنہ انگیزی میں پیش پیش رہتے تھے، حضرت صالح علیہ السلام نے ان کی بھی سرزنش کی اور قوم کے دوسرے لوگوں کو بھی سمجھایا کہ وہ ان کی باتوں میں نہ آئیں:

﴿وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ﴾[2]

(ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔)

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم مختلف سماجی بُرائیوں میں مبتلا تھی۔ مال و دولت کی حرص نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ لوٹ کھسوٹ کرنا، دوسروں کا حق مارنا، جائز و ناجائز کی پروا کیے بغیر اسباب معیشت اکٹھا کرنا اس کی پہچان بن گئی تھی۔ اس چیز نے ان کے سماج کو فتنہ وفساد کی آماج گاہ بنا دیا تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے انھیں اس سے باز رہنے کی تاکید کی۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾[3]

(اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔)

سورۂ اعراف میں اسی مضمون میں کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے:

﴿وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ

---

1 سورۃ الاعراف: ۴

2 سورۃ الشعرائ: ۲۵۲-۲۵۱

3 سورۃ ہود: ۸۵

مُؤْمِنِينَ وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا وَاذْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ وَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ﴾[1]

(لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے، اسی میں تمھاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مومن ہو۔ اور (زندگی کے) ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوف زدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگے اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔)

آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بھی ایسے کاموں سے منع کیا گیا ہے جو روئے زمین میں فساد وانتشار کا سبب بنتے ہیں، جن سے بندگانِ خدا کے حقوق پامال ہوتے ہیں اور ان کے درمیان بغض و نفرت اور باہمی عداوت کو بڑھاوا ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا﴾[2]

(زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔)

5.7۔ توبہ واستغفار کی تلقین

انسانوں کو بہکانے کے لیے شیطان ہر دم ان کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اللہ کے بندے اس کی سیدھی راہ سے بھٹک جائیں اور غلط کاموں میں پھنس جائیں۔ مطلوب یہ نہیں ہے کہ ان سے کبھی کوئی غلطی اور کوتاہی سرزد نہ ہو، بلکہ مطلوب یہ ہے کہ جب بھی دانستہ یا نادانستہ وہ کسی معصیت میں مبتلا ہو جائیں، کسی غلط کام کا ارتکاب کر بیٹھیں اور کوئی لغزش ان سے سرزد ہو جائے فوراً انھیں تنبہ ہو جائے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ اس سے معافی چاہیں اور آئندہ اس غلطی کا ارتکاب نہ کرنے کا عہد کریں۔ اللہ کے پیغمبروں نے اپنی قوموں کو ہمیشہ توبہ واستغفار کی تلقین کی ہے۔ انھیں اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات یاد دلائے ہیں، اس کی صفتِ رحمت وشانِ کریمی کو نمایاں کیا ہے اور انھیں امید دلائی ہے کہ اگر وہ اس کی طرف پلٹیں گے اور اپنی کوتاہیوں پر اس سے معافی مانگیں گے تو وہ انھیں اپنی مزید نعمتوں سے نوازے گا اور دنیوی آسائشوں سے مالامال کردے گا۔

---

1 سورۃ الاعراف ۷: ۸۵-۸۶

2 سورۃ الاعراف ۷: ۵۶

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت، سورۂ نوح میں تفصیل سے مذکور ہے۔ انہوں نے اپنی قوم سے من جملہ دیگر باتوں کے یہ بھی فرمایا:

﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيُمْدِدْكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَارًا﴾ [1]

(اپنے رب سے معافی مانگو بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمھیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کر دے گا۔)

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کو اپنے مجرمانہ افعال سے باز آنے اور بارگاہِ الٰہی میں توبہ واستغفار کی تلقین کی اور اللہ تعالیٰ کے اجر وانعام کا یقین دلایا۔ فرمایا:

﴿وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ﴾ [2]

(اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمھاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرم بن کر (بندگی سے) منہ نہ پھیرو۔)

قوم ثمود کے ترقی یافتہ تمدن نے ان میں شکر گزاری اور احسان شناسی کا جذبہ پیدا کرنے کی بجائے انھیں بُرائیوں کی راہ پر ڈال دیا تھا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے انھیں اس سے توبہ کرنے، اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرنے اور نیکی کی راہ اختیار کرنے کی تاکید کی۔ فرمایا:

﴿يَا قَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُونَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُونَ اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ [3]

(اے میری قوم کے لوگو! بھلائی سے پہلے بُرائی کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہو؟ کیوں نہیں اللہ سے مغفرت طلب کرتے؟ شاید کہ تم پر رحم فرمایا جائے؟)

سورۂ ہود میں حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا مکالمہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ

---

1 سورۃ نوح: ۱۲-۱۰

2 سورۃ ہود: ۵۲

3 سورۃ النمل: ۴۶

بھی فرمایا:

﴿وَاسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِؕ اِنَّ رَبِّىۡ رَحِيۡمٌ وَّدُوۡدٌ ﴾[1]

(اور اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، بے شک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے۔)

خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی توبہ واستغفار کی تلقین کا پہلو نمایاں ہے۔ آپ نے توحید کی تعلیم دی اور معبود واحد کی عبادت کا حکم دیا اور اپنی کوتاہیوں اور خطاؤں پر مغفرت طلب کرنے کی تاکید کی۔ یہ دعوت قرآن الفاظ میں یہ ہے:

﴿أَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا إِلَّا اللّٰهَؕ إِنَّنِىۡ لَكُمۡ مِّنۡهُ نَذِيۡرٌ وَّبَشِيۡرٌۙ وَّأَنِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا إِلَيۡهِ يُمَتِّعۡكُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا إِلٰٓى أَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤۡتِ كُلَّ ذِىۡ فَضۡلٍ فَضۡلَهٗ﴾[2]

(کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی، میں اُس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دے گا اور ہر صاحبِ فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔)

دوسری جگہ آپ ﷺ کو اپنی قوم سے خطاب کر کے یہ پیغام پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے:

﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُوۡحٰٓى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسۡتَقِيۡمُوۡۤا اِلَيۡهِ وَاسۡتَغۡفِرُوۡهُ ﴾[3]

(اے نبی! ان سے کہو کہ میں تو ایک بشر ہوں، تم جیسا۔ مجھے وحی کے ذریعے سے بتایا جاتا ہے کہ تمھارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے۔ لہٰذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اسی سے معافی چاہو۔)

5.8۔ پچھلی اقوام کے انجام سے ڈرانا

انبیائے کرام کی دعوت میں یہ پہلو بھی بہت ابھرا ہوا ہے کہ انھوں نے اپنی قوموں کو پچھلی قوموں کے بُرے انجام سے ڈرایا ہے۔ انھوں نے ان سے خطاب کرتے ہوئے واضح کیا کہ تم سے پہلے کے لوگ بہت شان و شوکت والے تھے۔ بڑی طاقت و قوت کے مالک تھے، ان کی دنیوی ترقیات عروج پر تھیں، روے زمین پر انھیں کروفر حاصل تھا۔ لیکن جب

---

1 سورۃ ہود: ۹۰

2 سورۃ ہود: ۲

3 سورۃ حم السجدہ: ۶

انھوں نے احکام الٰہی سے سرتابی کی اور زمین کو فتنہ وفساد سے بھر دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کردیا۔ ان کا دنیوی جاہ وجلال ان کے کچھ کام نہ آسکا اور وہ بعد کے لوگوں کے لیے نمونۂ عبرت بنا دیے گئے۔

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم عاد کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ﴾[1]

(بھول نہ جاؤ کہ تمھارے رب نے نوحؑ کی قوم کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا۔)

پھر جب قوم عاد بھی اپنے جرائم کی پاداش میں ہلاک کردی گئی اور قوم ثمود کو اس کا جانشین بنایا گیا تو ان کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام نے بھی انھیں اپنے پیش رووں کے انجام سے عبرت پکڑنے کی تاکید کی:

﴿وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ﴾[2]

(یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قومِ عاد کے بعد تمھیں اس کا جانشیں بنایا۔)

"جانشین بنائے جانے" کے تذکرے میں یہ تنبیہ پوشیدہ ہے کہ اب اس دنیا میں زندگی گزارنے اور اپنی سرگرمیاں انجام دینے کا جو موقع تمھیں ملا ہے، اگر تم نے اس کی قدر نہیں کی، پچھلی قوموں کی طرح تم بھی بداعمالیوں کا شکار رہے، اللہ کے پیغمبروں کا کہنا نہیں مانا اور انھیں جھٹلایا تو تمھارا بھی وہی انجام ہوگا، جس سے گزشتہ قومیں دوچار ہوئی تھیں اور اسی طرح تمھیں بھی ہلاک کردیا جائے گا جس طرح وہ صفحۂ ہستی سے مٹادی گئیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو، "من جملہ دوسری نصیحتوں کے" اس بات سے بھی ہوشیار کیا۔

﴿وَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ﴾[3]

(اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے)

قرآن کے دوسرے مقام پر ان کا جو خطاب مذکور ہے، اس میں انھوں نے پہلے ہلاک ہونے والی ایک ایک قوم کا نام لے کر اس کے انجام بد سے اپنی قوم کو ڈرایا ہے اور اس سے بچنے کی تاکید کی ہے:

---

1 سورۃ الاعراف: ۶۹

2 سورۃ الاعراف: ۷۴

3 سورۃ الاعراف: ۸۶

﴿وَيَاقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِنْكُمْ بِبَعِيدٍ﴾ [1]

(اور اے برادرانِ قوم! میرے خلاف تمہاری ہٹ دھرمی کہیں یہ نوبت نہ پہنچادے کہ آخر کار تم پر بھی وہی عذاب آکر رہے جو نوح علیہ السلام یا ہود علیہ السلام یا صالح علیہ السلام کی قوم پر آیا تھا اور لوط علیہ السلام کی قوم تو تم سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔)

قرآن کریم میں ''رجل مومن'' مردِ مومن اور اس کی دعوت کا مفصل بیان موجود ہے۔ یہ وہ شخص تھا جو دربارِ فرعون میں قدر و منزلت کا مالک تھا۔ اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت قبول کرنے اور ان پر ایمان لانے کی توفیق حاصل ہوئی تو اس نے اپنی قوم کو بھی سیدھی راہ دکھانے کی کوشش کی۔ اس نے ان کے سامنے دعوتِ حق پیش کی تو یہ بات بھی کہی:

﴿يَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُم مِّثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْماً لِّلْعِبَادِ﴾ [2]

(اے میری قوم کے لوگو! مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ دن نہ آجائے جو اس سے پہلے بہت سے جتھوں پر آچکا ہے، جیسا دن قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والی قوموں پر آیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔)

قرآن کریم میں پیغمبر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بھی سابقہ اقوام کے انجام سے عبرت پزیری کا بار بار تذکرہ ہوا ہے۔ وہ جب بیان کرتا ہے کہ ان قوموں نے اللہ کے احکام کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس کے پیغمبروں کو جھٹلایا، اس لیے انھیں ہلاک کر دیا گیا تو ساتھ ہی اپنے مخاطبین سے صراحت سے کہتا ہے کہ ان کا انجام دیکھ لو اور اس سے عبرت حاصل کرو۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت اور ان کی قوم کے اسے قبول کرنے سے انکار کا تذکرہ کرنے کے بعد اس کا انجام قرآن نے یہ بیان کیا ہے:

---

1 سورۃ ہود: ۸۹

2 سورۃ مومن: ۳۱-۳۰

﴿وَأَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنذَرِيْنَ ﴾[1]

(اور ہم نے ان سب لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ پس دیکھ لو کہ جنھیں متنبہ کیا گیا تھا (اور پھر بھی انھوں نے مان کر نہ دیا) ان کا کیا انجام ہوا۔)

قوم ثمود کی سرکشی بیان کرنے کے ساتھ اس کے انجام کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:

﴿ وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ (51) فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾[2]

(یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انھیں خبر نہ تھی۔ اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا اُن کو اور ان کی پوری قوم کو۔ وہ ان کے گھر خالی پڑے ہیں اُس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے۔ اس میں ایک نشانِ عبرت ہے، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔)

قوم لوط کا انجام ان الفاظ میں مذکور ہے:

﴿ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ﴾[3]

(اور اس قوم پر برسائی ایک بارش، پھر دیکھو کہ ان مجرموں کا کیا انجام ہوا)

فرعون اور اس کی قوم کی سرکشی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے بھیانک انجام کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے:

﴿ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ﴾[4]

(اس نے اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور سمجھے کہ انھیں کبھی ہماری طرف پلٹنا نہیں ہے۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور سمندر میں پھینک دیا۔ اب دیکھ لو کہ ان ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔)

---

1 سورۃ یونس: ۷۳

2 سورۃ النمل: ۵۲-۵۰

3 سورۃ الاعراف: ۸۴

4 سورۃ القصص: ۴۰-۳۹

آیاتِ بالا میں گزشتہ قوموں کی ہلاکت کے تذکرے کے ساتھ ان کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اُنْظُرْ (دیکھو) واحد کا صیغہ ہے۔ اس کے ذریعے ہر سننے والے کو مخاطب بنایا گیا ہے۔ ان آیات میں گزشتہ قوموں کے ناموں کی صراحت ہے۔ بہت سی آیات میں ان کا اجمالی بیان ہے۔ مثلاً نبی ﷺ کی دعوت کو جھٹلانے والوں کے تذکرے کے بعد فرمایا گیا:

﴿كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ﴾[1]

(اسی طرح ان سے پہلے کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں، پھر دیکھ لو ان ظالموں کا کیا انجام ہوا۔)

گزشتہ قوموں کی ہلاکت اور تباہی و بربادی سے عبرت حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ وہ زمین میں چلیں پھریں، آثارِ قدیمہ کا مشاہدہ کریں اور دیکھیں کہ جو قومیں کبھی بڑی شان و شوکت کی مالک تھیں، اب کس طرح ان کا نام و نشان مٹ گیا ہے۔

﴿وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ o قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾[2]

((اے نبی) تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے، مگر ان مذاق اڑانے والوں پر آخرکار وہی حقیقت مسلط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ ان سے کہو، ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے۔)

جو لوگ روے زمین کے آثار کو عبرت کی نظر سے نہیں دیکھتے اور سابقہ قوموں کے احوال کو جان کر اپنے رویوں پر نظرِ ثانی نہیں کرتے، قرآن ان کی سرزنش کرتا ہے اور ان آثار کی عبرت ناکی کی طرف ان کی توجہ مبذول کرتا ہے:

﴿أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِن وَاقٍ o ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانَت تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَكَفَرُوا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ إِنَّهُ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾[3]

---

1 سورۃ یونس: ۳۹

2 سورۃ الانعام: ۱۱-۱۰

3 سورۃ مومن: ۲۲،۲۱

(کیا یہ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انھیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے زیادہ طاقت ور تھے اور ان سے زیادہ زبردست آثار زمین میں چھوڑ گئے ہیں۔ مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ ان کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس اُن کے رسول بیّنات لے کر آئے اور انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے ان کو پکڑ لیا۔ یقیناً وہ بڑی قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے۔)

سابقہ اقوام کے انجام سے ڈرانے کے نتیجے کے طور پر انبیاے کرام نے اپنی قوموں سے زور دے کر یہ بات کہی ہے کہ اگر تم نے بھی ویسے ہی کام کیے جیسے تم سے پہلے کے لوگ کرتے رہے ہیں اور تم نے بھی اپنے پیش رووں کی طرح احکام الٰہی سے روگردانی کی تو اللہ تعالیٰ تمھیں بھی اسی طرح ہلاک کر دے گا جس طرح تم سے پہلے کے لوگ تباہ و برباد کر دیے گئے اور تمھاری جگہ وہ دوسرے لوگوں کو لا بسائے گا۔ کوئی نہیں جو اللہ کی اس ''سنت'' میں رکاوٹ ڈال سکے اور اسے ایسا کرنے سے روک سکے۔

6۔ دعوت انبیاء کرام علیہ السلام کے مخاطبین اور طریق دعوت

نبی کی بعثت پوری قوم اور امت کی طرف ہوتی ہے جس میں ہر سطح کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام کی عمومی دعوت ہر ایک کے لیے یکساں ہوتی ہے تاہم انبیائے کرام کا اسلوب دعوت یہ رہا ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی قوم کے سر کردہ افراد کو مخاطب کرتے ہیں۔ جب بھی انبیاء کرام علیہم السلام نے دعوتِ حق دی تو سب سے پہلے مخالفت اسی طبقہ نے کی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو دعوت دی تو اُن کے سرداروں نے جواب دیا:

﴿قَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِهِۦٓ إِنَّا لَنَرَىٰكَ فِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ﴾[1]

(قوم کے سرداروں نے کہا: ہم تو تمہیں کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔)

یہ معاملہ صرف حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان ہی پیش نہیں آیا، بلکہ ہر نبی کی قوم کے سرداروں اور مترفین نے ان کے ساتھ اس طرح کا رویہ اختیار کیا۔

مولانا مودودی تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں:

اس سے قرآن اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ انسان کی گمراہی ہر زمانے میں بنیادی طور پر ایک ہی طرح کی

---

1 سورۃ الاعراف 7: 60

رہی ہے اور خدا کے بھیجے ہوئے معلّموں کی دعوت بھی ہر عہد اور ہر سر زمین میں یکساں رہی ہے اور ٹھیک اسی طرح اُن لوگوں کا انجام بھی ایک ہی جیسا ہوا ہے اور ہو گا، جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی دعوت سے منہ موڑا اور اپنی گمراہی پر اصرار کیا[1]۔

"ملأ" کے ساتھ ساتھ "مترفین" نے بھی انبیاء کی مخالفت کی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ﴾[2]

(کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبر دار کرنے والا بھیجا ہو اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں مانتے۔)

یہ ایک عام رویہ ہے ہمیشہ سے ہی ایسے ہوتا آیا ہے کہ اہلِ ثروت اور کھاتے پیتے لوگوں کی جھوٹی قدریں ان کو دھوکہ دیتی ہیں۔ ان کے پاس جو دولت اور قوت ہوتی ہے وہ ان کو دھوکے میں ڈالے رکھتی ہے کیونکہ خوشحالی اور اقتدار ان کے دلوں میں سختی پیدا کر دیتی ہے اور سچائی انہیں نظر نہیں آتی۔ گویا انبیاء علیہم السلام کی دعوت اُن کے اقتدار کا خاتمہ ہے۔ اس لیے حق کی مخالفت میں وہ پیش پیش ہوتے ہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے اُنہیں دھمکی دی کہ یا تو تم ہماری ملت میں آجاؤ یا پھر ہم تمہیں اس بستی سے نکال دیں گے۔ سورۃ الاعراف میں ہے:

﴿قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ﴾[3]

(اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اس سے کہا کہ اے شعیب! ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے اپنی بستی سے نکال دیں گے یا تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا۔ شعیب علیہ السلام نے جواب دیا: کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں۔)

قرآنِ مجید کی سورۃ سبا میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

---

1 مودودی، ابوالاعلیٰ، (المتوفی: 1979ء)، تفہیم القرآن، ج 2 ص 42، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، 1982ء

2 سورۃ سبا 34:34

3 سورۃ الاعراف 7:88

﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَآ إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَّأَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ﴾[1]

(اور ہم نے جس بستی میں بھی آگاہ کرنے والا بھیجا وہاں کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ جس چیز کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں اور کہا کہ ہم مال اور اولاد میں بہت بڑھے ہوئے ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم عذاب دیئے جائیں۔)

یعنی چونکہ ہمیں مال و دولت سے نوازا گیا ہے، اس لیے ہم بری الذمہ ہیں حساب کتاب سے ہم سے کوئی سوال جواب نہیں ہوگا۔

انبیائے کرام کے اولین مخاطبین ہمیشہ سربراہان اقوام رہے۔ نبی آخر الزمان ﷺ نے بھی دعوت کا آغاز سرداران قریش سے کیا۔ اس کے بعد عمومی دعوت کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ اولین مخاطبین عام طور پر سیادت، ثروت، فہم و فراست اور اثر و رسوخ میں دوسرے تمام لوگوں پر فائق ہوتے۔

اس اسلوب دعوت کی حکمتیں

انبیائے کرام علیہ السلام نے امراء سے دعوت کا آغاز کیوں کیا؟ اس کی متعدد حکمتیں ہیں:

۱۔ عوام الناس عام طور پر اپنے لیڈروں کی اتباع کرتے ہیں۔ لہٰذا لیڈروں کی راہنمائی عوام کے لیے زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتی ہے۔

۲۔ یہ طبقہ عموماً فہم و ذکاء میں بھی دوسروں سے بڑھ کر ہوتا ہے لہٰذا ان کی فکری تربیت زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔

۳۔ اس طبقے کے لوگ مادی وسائل سے بھی مالا مال ہوتے ہیں۔ لہٰذا عمل دعوت میں انہیں بہتر طور پر استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

۴۔ اس طریق دعوت میں چند افراد کی ہدایت سینکڑوں افراد کی ہدایت کا سبب بن سکتی ہے۔

۵۔ عام سطح کے لوگوں کے ساتھ عمل دعوت میں زیادہ الجھنا پڑتا ہے اور ثمرات کم حاصل ہوتے ہیں جبکہ خواص کے ساتھ مدلل گفتگو کے نتیجے میں زیادہ ثمرات حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

---

1 سورۃ سبا 34:34-35

6.1۔ دعوت میں تدریج

حضرت نوحؑ نے دعوت دین کے سلسلے میں حکمت اور انسانی نفسیات کا بھی لحاظ رکھا اور دعوت پیش کرنے میں تدریج کو اختیار کیا۔ یہ عین وہی طریقہ ہے جو ہمیں آنحضرت ﷺ کی دعوت میں بھی ملتا ہے کہ پہلے محدود حلقہ میں دعوت دی اور پھر کچھ حد تک ماحول کو اس کے لئے سازگار کر کے اعلانیہ دعوت دی۔ سورہ نوح میں ہے:

﴿ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا﴾[1]

(پھر میں نے ان کو بلند آواز سے بلایا پھر میں نے ان کو اعلانیہ بھی سمجھایا اور پوشیدہ طور پر بھی سمجھایا)

مراد یہ ہے کہ دعوت کے بلند مقاصد کے حصول کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا اور ہر طریقے سے سمجھایا۔

6.2۔ صبر و برداشت، عفو و درگذر

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو نرمی کے ساتھ سمجھایا۔ قوم کی تکالیف پر صبر کیا۔ ان کو برداشت کیا اور نرمی کے ساتھ انکو دعوت قبول کرنے کی ترغیب دی اللہ کے غفور رحیم ہونے کی طرف متوجہ کیا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا﴾[2]

(پس میں نے ان سے کہا کہ اپنے رب سے مغفرت طلب کرو بے شک وہ بہت بخشنے والا ہے)

اس معاملے میں انہوں نے تمسخر اور مذاق اڑانے والوں کی بھی پروانہ کی۔ اور مستقل مزاجی سے دعوت میں مصروف رہے

6.3۔ دعوت کے ساتھ مادی اسباب کی فراہمی

داعی کے لئے یہ پہلو نہایت اہم ہے کہ وہ کبھی بھی معجزات اور تائید ایزدی کی توقع پر مادی اسباب و وسائل کو نظر انداز نہیں کرتا۔ یہی نکتہ حضرت نوح علیہ السلام کے طریق دعوت میں بطورِ خاص نمایاں ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے کشتی بنائی اور جب طوفان آیا تو اہل ایمان نے اس کشتی کے ذریعے اپنا تحفظ کیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔

﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ مُغْرَقُونَ﴾[1]

---

1 ۔ سورۃ نوح ۷۱: ۹۔۸

2 ۔ سورۃ نوح ۷۱: ۱۰

(اور ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق کشتی بناؤ اور ظالموں کے بارے میں اب ہم سے کچھ نہ کہو بے شک یہ غرق ہونے والے ہیں)۔

اہل ایمان کی نجات کے لئے کشتی کا بنانا اس لئے ضروری ہوا کہ قوم نوح پر اللہ تعالی کی طرف سے پانی کے طوفان کی سزا مقرر ہو چکی تھی۔ مادی اسباب کے بغیر اہل ایمان کو بچا لینا اللہ کی قدرت سے بعید نہیں تھا مگر اللہ تعالی نے اس عالم کو عالم علل واسباب بنایا ہے۔ لہٰذا اہل ایمان کو مادی اسباب کے ذریعے طوفان سے نجات دی۔

6.4۔ حضرت براہیم علیہ السلام کے دعوتی منہج کا نمونہ

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے دو نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان دونوں نمونوں میں ''حکمت'' جو دعوت کا انتہائی اہم عنصر ہے، کس درجہ حسن کمال کے ساتھ جلوہ گر ہے، اور پیغمبرانہ انداز تبلیغ کی مکمل نمائندگی ان کے طرزِ خطاب میں موجود ہے۔ ایک نمونہ تو وہ ہے جب انھوں نے اپنے والد گرامی کو دعوت دین دی، اور دوسرا نمونہ وہ ہے جس میں انھوں نے اپنی قوم کو مخاطب کیا۔ ان دونوں دعوتوں کے انداز بیان میں حکیمانہ تنوع پایا جاتا ہے۔

قرآن مجید نے ابراہیم علیہ السلام کی زبان دعوت کے الفاظ یوں بیان کیے ہیں:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا يٰٓاَبَتِ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا﴾[2]

(ابراہیم کو کتاب میں پڑھو بے شک وہ سچے نبی تھے۔ جب انھوں نے اپنے باپ سے کہا، اے ابا جان! تم ان کی عبادت کیونکر کرتے ہو جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں اور نہ آپ کے کسی کام آ سکتے ہیں۔ اے ابا جان! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے، آپ میری پیروی کریں میں آپ کو سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کروں گا۔ اے ابا جان! شیطان کی بات نہ مانو، بے شک شیطان اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے۔ اے ابا جان! مجھے خطرہ ہے کہ کہیں تمھیں اللہ کا عذاب نہ پکڑ لے اور تم شیطان کے دوست بن جاؤ۔)

---

1 ۔ سورۃ ھود ۱۱: ۳۷

2 سورۃ مریم ۱۹: ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶

جب ایک بیٹا اپنے باپ کو یآبت کہہ کر پکارتا ہے تو باپ کا جذبہ شفقت و ہمدردی پوری طرح بیدار ہو جاتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ اندازِ تخاطب جان بوجھ کر اختیار کیا تھا تاکہ ان کی بات باپ کے دل کی گہرائی تک پہنچ جائے۔اور باپ کی پدرانہ محبت دل کے دروازے کھول دے۔ایک باپ اپنے فرزند سے کتنا بھی خفا کیوں نہ ہو وہ جب اس کو یآبت کہہ کر پکارتا ہے تو باپ کا دل فوراً نرم ہو جاتا ہے۔اور اس کی بات سننے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔حضرت ابراہیم نے اپنی دعوت میں جذبہ ٔایمان سے پہلے شفقت پدری کے تاروں کو چھیڑا،اور یہ چیک کیا کہ محبت بسااوقات ایمان سے پہلے دل میں گھر کرتی ہے۔ایسا بھی ممکن ہے کہ باپ شفیق باپ تو ہو مگر مومن نہ ہو۔اس کی محبت کا چشمہ تو جاری ہے لیکن ایمان کا چشمہ خشک ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتی اسلوب کا دوسرا نمونہ یہ ہے جس میں اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں

﴿ وَ اتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ اِبۡرٰهِيۡمَ‌ۘ اِذۡ قَالَ لِاَبِيۡهِ وَ قَوۡمِهٖ مَا تَعۡبُدُوۡنَ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اَصۡنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيۡنَ قَالَ هَلۡ يَسۡمَعُوۡنَكُمۡ اِذۡ تَدۡعُوۡنَۙ اَوۡ يَنۡفَعُوۡنَكُمۡ اَوۡ يَضُرُّوۡنَ ﴾[1]

(ان کو ابراہیم کا واقعہ سناؤ،جب انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟انھوں نے جواب دیا کہ ہم بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور اسی پر ہم قائم ہیں،اس نے کہا کیا وہ تمھاری پکار کو سنتے ہیں جب تم ان کو پکارتے ہو؟کیا وہ تمھیں کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے معبودانِ باطل کی کوئی ہجو یا مذمت نہیں کی نہ ان کو برا بھلا کہا،اگر وہ ایسا کرتے تو ممکن تھا ان کے مخاطب بپھر جاتے اور بات سننے سے ہی انکار کر دیتے۔لٰہذا آپ نے ان کو بجائے خود مجبور کر دیا کہ وہ بولیں اور بتائیں۔فرمایا:تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟

﴿قَالُوۡا بَلۡ وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفۡعَلُوۡنَ﴾[2]

(کہنے لگے(کہ یہ بات نہیں کہ وہ ہمیں نفع دیتے ہیں یا نقصان)بلکہ یہ بات ہے کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو اس طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔)

یہی وہ بات تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے منہ سے نکلوانا چاہتے تھے کہ یہ ہاتھوں سے بنائے ہوئے بے جان

---

1 سورۃ الشعراء ۲۶: ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳

2 سورۃ الشعرآء ۲۶: ۷۴

پتھروں کے بت ان کا انسانی زندگی سے کیا رشتہ ہے؟ یہ انسانوں کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ کس مصیبت سے نجات دلا سکتے ہیں، کوئی علمی توجیہ، کوئی حقیقت اور علم پر مبنی بنیاد بھی ان کی ہے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اب اس کے بعد اپنی دعوت شروع کی اور اللہ کی توحید اور اس کی ذات سے ان کو آشنا کرنا شروع کر دیا اور فرمایا:

﴿قَالَ أَفَرَءَيْتُم مَّا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ ۝ أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ ۝ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝ الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ۝ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ۝ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ۝ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ۝ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ﴾[1]

(کیا دیکھا تم نے جن کی تم اور تمھارے پہلے باپ دادا عبادت کرتے تھے، بے شک وہ میرے دشمن ہیں سوائے اللہ تعالی کے جو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے، وہی ذات ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی میری راہنمائی کرے گا، اور وہی ذات مجھے کھلاتی اور پلاتی ہے، اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفاعطاء کرتا ہے اور وہی مجھے فوت کرے گا اور وہی پھر مجھے زندہ کرے گا، اور اُسی سے میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ میرے گناہ معاف کرے گا قیامت کے دن۔)

6.5۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے طریق دعوت کا نمونہ

قرآن حکیم میں حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ کے ضمن میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ ۖ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْرًا ۖ وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَانِي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْزًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۖ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ ۖ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ۝ قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَن يَأْتِيَكُمَا ۚ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۚ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَا أَن نُّشْرِكَ بِاللَّهِ مِن شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِن فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝ يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾[2]

---

1 سورۃ الشعرآء ۲۶: ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲

2 سورۃ یوسف ۱۲: ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱

(اور داخل ہوئے اس کے ساتھ جیل میں اور بھی دو نوجوان، اُن دونوں میں سے ایک نے کہا: میں خواب دیکھتا ہوں کہ میں شراب نکال رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا میں خواب دیکھ رہا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اُٹھائے ہوئے ہوں اور اُن میں سے پرندے کھا رہے ہیں، ہمیں اس کی تعبیر بتاؤ ہم تمھیں نیک سمجھتے ہیں۔(یوسف نے) کہا نہیں آئے گا تمھارے پاس کھانا جو تمھیں دیا جاتا ہے، مگر میں تمھیں وہ کھانا آنے سے پہلے پہلے اس کی تعبیر بتادوں گا۔ یہ اس وجہ سے جو میرے اللہ نے مجھے سکھایا ہے۔ بے شک میں نے ایسی قوم کا دین چھوڑا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتی اور وہ آخرت کے منکر ہیں، میں ایسے دین کی پیروی کرتا ہوں جو میرے باپ دادا ابراہیم، اسحاق، اور یعقوب کا دین ہے۔ ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرائیں۔ ہم پر اللہ کا فضل ہے اور لوگوں پر بھی لیکن اکثر لوگ اس بات کو سمجھتے نہیں اور نہ ہی اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اے میرے جیل کے ساتھیو! کیا جدا جُدا خدا بہتر ہیں یا کہ ایک ہی اللہِ جو زبردست قوت والا ہے۔ جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو وہ تو صرف نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھے ہوئے ہیں جن کے متعلق اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے۔ حکم تو صرف اللہ کا چلتا ہے، اُس نے حکم دیا ہے کہ تم صرف اُسی کی بندگی کرو، یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔)

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح کیا کہ پہلے ان کو مطمئن کیا کہ وہ ان کی خواب کی تعبیر بتا سکتے ہیں وہ بالکل اس اہل ہیں، یہ ایک فطرتی بات ہے کہ حاجت مند چاہتا ہے کہ اس کی ضرورت فوراً پوری ہو، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا یہ جو میں خوابوں کی تعبیر کرتا ہوں اور کرتا بھی بالکل درست ہوں تو یہ سارے کا سارا میرے اللہ کا کرم ہے۔ تاکہ ان کا ذہن اس بات پر پختہ کر دیا جائے کہ واقعی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو یہ چیز عطا فرمائی ہے جس کی بدولت یہ تعبیر درست کرتے ہیں، لیکن ہم تو اس اللہ کو مانتے ہی نہیں ہیں نہ ہی ہمیں اس بات کا علم ہے حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک بات کر کے ان کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔

7۔انبیائے کرام علیہ السلام کی دعوت قبول نہ کرنے والوں کی عادات وخصائل

7.1۔انکارِ حق

ہر دور کے ''ملأ'' و ''مترفین'' اپنے آپ کو حق سے بالا تر سمجھتے رہے اور حق سے انکار کرتے رہے۔ ایک طرف حق ہے اور دوسری طرف باطل۔ حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور یہ بالعموم دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے ایک صحیح اور سچی عدل و انصاف کے مطابق حقیقت بات خواہ وہ عقیدہ اور ایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دُنیا کے معاملات سے،

دوسرے وہ حق جس کا ذکر انسان پر واجب ہو خواہ خُدا کا حق ہو یا بندوں کا حق۔ حق و باطل کے درمیان ازل سے کشمکش جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ یہ دُنیا دارِ امتحان ہے اور حق و باطل کے معرکے کا میدان ہے۔ حق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کے لیڈر انبیاء ورسل ہیں اور ظاہری اور مادی شان وشوکت باطل کی جانب ہوتی ہے۔ مقصد صرف امتحان ہے کہ کون ظاہری اور مادی شان وشوکت دیکھ کر باطل کی جانب جاتا ہے اور کون حق کو قبول کرتا ہے۔

داعی اور دعوت میں حق و باطل کے درمیان فرق اس طرح واضح کیا گیا ہے:

''حق کے وجود میں ہر چیز کی اصلیت ہے اور باطل کی کوئی اصلیت اور اس کا کوئی وجود نہیں۔ حق کے مقابلے میں اس کی حیثیت وہی ہے جو جھاگ کی پانی کے مقابلے میں۔ باطل محض وہم و خرافات اور اہواو خواہشات کے دھوکہ اور مظہر کا نام ہے جو لوگوں کے سامنے اصلیت کے اس لباس میں آتا ہے جس میں حق جلوہ گر ہوتا ہے اور امر واقعہ کی بعض محسوس شکلیں اور صورتیں اختیار کر لیتا ہے جس سے کوتاہ بین اور سیدھے سادھے لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں لیکن حُسنِ انجام اسی چیز کے لیے ہے جو بقاء کے عناصر اور نفع رسانی کی خصوصیات رکھتی ہوں''[1]۔

یعنی بقاءاُسی چیز میں ہے جو نفع رسانی کا باعث ہوتی ہے۔قرآنِ حکیم میں حق و باطل کی حیثیت اس طرح واضح کی گئی ہے:

﴿كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ﴾[2]

(اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے جو جھاگ ہے وہ اُڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔اسی طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے۔)

چونکہ حق کے لیڈر انبیاء کرام ہوتے ہیں، اس لیے انبیائے کرام کا سکھایا ہوا راہِ راست ہی سیدھا راستہ ہوتا ہے اور اس سے ہٹا ہوا راستہ باطل اور گمراہی کا راستہ ہوتا ہے جو کہ انسان کو دنیا میں بھی تباہی و بربادی سے دوچار کرتا ہے اور آخرت میں بھی۔ اسی لیے جب انسان گمراہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل کی شکل میں اپنے نمائندے بھیجے۔ انبیائے کرام علیہم السلام نے جب دعوتِ حق پیش کی تو ایک گروہ جنہوں نے ہلاکت کی راہ اپنائی قرآنِ مجید میں اُنہیں ''ملأ'' و''مترفین'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، انکارِ حق میں پیش پیش رہا۔اُنہوں نے انبیائے کرام کی دعوت یعنی اللہ تعالیٰ کا پیغام ماننے

---

1 البہی الخولی، داعی اور دعوت، ص 141-142، اسلامک بک پبلشرز اُردو بازار لاہور

2 سورۃ الرّعد 17:13

سے انکار کر دیا۔

انبیائے کرام علیہ السلام کا مشن اور ان کی آمد کا مقصد خدائے واحد کی خُدائی منوانا اور صرف اسی ایک اللہ کی عبادت کرانا تھا۔ قرآنِ مجید میں وضاحت کے ساتھ یہ بات بتائی گئی ہے کہ جن سے انبیاء کی لڑائی تھی اُنہیں اللہ کے وجود سے انکار نہیں تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ نہ صرف زمین و آسمان کا خالق اللہ ہے بلکہ اُن کا خالق بھی اللہ ہے اور کائنات کا سارا انتظام بھی وہی اللہ چلا رہا ہے۔ سب چیزیں اُسی کی پابند ہیں۔ سورۃ العنکبوت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ﴾ [1]

(اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سُورج کو کس نے مسخر کر رکھا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر یہ کدھر سے دھوکا کھا رہے ہیں۔)

﴿وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ﴾ [2]

(اور اگر تم ان سے پوچھو کہ تم کو کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟)

انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت کا بنیادی نقطہ یہی تھا کہ جسے تم رب العالمین مانتے ہو جو نہ صرف تمہارا بلکہ اس کائنات کا بھی خالق ہے دراصل وہی تمہاری ضرورتوں کا کفیل بھی ہے۔ وہی اکیلا تمہارا اِلٰہ بھی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی ہستی نہیں تمہاری ضروریات پوری کرنے والی اور مشکلیں آسان کرنے والی، جبکہ ''ملأ'' و ''مترفین'' اس بات پر بضد تھے کہ ربّ العالمین تو اللہ ہی ہے مگر دوسرے بھی خُدائی کے انتظام میں دخل رکھتے ہیں اور ان سے ہماری حاجتیں وابستہ ہیں۔ لہٰذا ہم اللہ کے ساتھ ان کو بھی رب مانیں گے۔ مولانا مودودی سابقہ اقوام کے تصورِ رب کے بارے میں اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

''رب کا یہ مفہوم کہ وہ فوق الفطری طور پر مخلوقات کی پرورش، خبر گیری، حاجت روائی اور نگہبانی کا کفیل ہوتا ہے، ان کی نگاہ میں ایک الگ نوعیت رکھتا تھا اور اس مفہوم کے اعتبار سے وہ اگرچہ ربّ اعلیٰ تو اللہ ہی کو مانتے تھے مگر اس کے ساتھ فرشتوں اور دیوتاؤں کو، جنوں کو، غیر مرئی قوّتوں کو، ستاروں اور سیاروں کو، انبیاء و اولیاء اور روحانی پیشواؤں کو بھی ربوبیت میں شریک ٹھہراتے تھے اور رب کا مفہوم کہ وہ امر و نہی کا مختار، اقتدارِ اعلیٰ کا مالک، ہدایت و رہنمائی کا منبع، قانون

---

1 سورۃ العنکبوت 61:29

2 سورۃ الزخرف 87:43

کا ماخذ، مملکت کا رئیس اور اجتماع کا مرکز ہوتا ہے، ان کے نزدیک بالکل ہی ایک دوسری حیثیت رکھتا تھا اور اس مفہوم کے اعتبار سے وہ یا تو اللہ کے بجائے صرف انسانوں کو رب مانتے تھے یا نظریے کی حد تک اللہ کو رب ماننے کے بعد عملاً انسانوں کی اخلاقی و تمدّنی اور سیاسی ربوبیت کے آگے سرِ اطاعت خم کیے دیتے تھے"[1]۔

اسی گمراہی کو دور کرنے کے لیے ابتداء سے آخر تک انبیاء مبعوث ہوئے کہ رب ایک ہی ہے۔ ربوبیت ناقابلِ تقسیم ہے۔ جس کائنات کو ایک اللہ نے پیدا کیا فرماں روائی بھی اُسی کی ہے۔ سارے اختیارات و اقتدار کا مالک بھی وہی ہے۔ اُس کی خدائی میں کوئی حصّہ دار نہیں ہے۔ اُلوہیت و ربوبیت اُسی کے لیے خاص ہے۔ سیّد مودودی بندگی رب کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

"ہمارے نزدیک قرآن اور اس سے پہلے کی تمام آسمانی کتابیں، اور محمد ﷺ اور آپ سے پہلے کے تمام پیغمبر جو دُنیا کے مختلف گوشوں میں آئے، ان کی بالاتفاق دعوت جس بندگی رب کی طرف تھی، وہ یہ تھی کہ انسان خدا کو پورے معنی میں الٰہ اور رب، معبود اور حاکم، آقا اور مالک، راہنما اور قانون ساز، محاسب اور مجازی (جزا دینے والا) تسلیم کرے، اور اپنی پوری زندگی کو خواہ وہ شخصی ہو یا اجتماعی، اخلاقی ہو یا مذہبی، تمدّنی و سیاسی اور معاشی ہو یا علمی اور نظری، اسی ایک خدا کی بندگی میں سپرد کر دے"[2]۔ دوسرے الفاظ میں یہی مطالبہ ہے جو قرآنِ مجید میں بھی کہا گیا ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً﴾[3]

(اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ۔)

یعنی اپنی زندگی کے کسی پہلو کو بندگی رب سے محفوظ کر کے نہ رکھو۔ اپنے تمام وجود کے ساتھ، اپنی پوری ہستی کے ساتھ خدا کی غلامی و اطاعت میں آجاؤ۔ بندگی رب پیغمبرانہ دعوت کا اصل الاصول ہے۔ ہر نبی نے اپنی دعوت کا آغاز اسی سے کیا کیونکہ انسان کی انفرادی گمراہی اور اجتماعی فساد کا سبب بندگی رب سے انحراف اور دوسروں کی بندگی اختیار کرنا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء کا ایک ہی پیغام تھا اور یہی پیغام حضرت محمد ﷺ کا بھی ہے۔

---

1 مودودی، ابوالاعلیٰ، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، ص 90

2 مودودی، ابوالاعلیٰ، (1979ء)، دعوتِ اسلامی اور اُس کے مطالبات، ص 11، اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور، 2008ء

3 سورۃ البقرۃ 2:208

﴿إِنَّمَآ أَنَا مُنذِرٌ وَّمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ * رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ﴾[1]

(میں بس ایک متنبہ کرنے والا ہوں۔ کوئی الٰہ نہیں ہے بجزاس ایک اللہ کے جو سب پر غالب ہے، جو رب ہے اور آسمانوں اور زمین کا اور ہر اس چیز کا جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہے۔ زبردست اور درگزر کرنے والا ہے۔)

7.2۔استکبار فی الارض

استکبار قبولِ حق میں سب سے بڑی رکاوٹ رہا ہے اور استکبار کی سب سے بڑی وجہ دنیاوی مال و متاع کی فراوانی یا مذہبی و دنیوی قیادت ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں مذکور ''ملأ'' و''مترفین'' کے اندر موجود غرور و تکبر ہی قبولِ حق میں مانع ہوا۔ دعوتِ حق سے انکار اور دوسرے معنوں میں اللہ سے بغاوت کی وجہ استکبار ہی ہے۔

قرآنِ حکیم میں بھی ''ملأ'' و''مترفین'' کے استکبار کا اسی طرح ذکر کیا گیا ہے کہ جب بھی انبیائے کرام علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ان تک پہنچایا تو اُنہوں نے انکار کیا اور انبیائے کرام علیہم السلام پر اعتراضات شروع کر دیئے۔ کبھی نبوّت کو بشریت کے منافی قرار دیا تو کبھی معاشرتی مقام و مرتبے پر تنقید کی اور یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ چونکہ انبیاء علیہم السلام اور اُن کے متبعین کا وہ مقام و مرتبہ نہیں اس لیے ہم اس دعوت کو قبول نہیں کرتے۔ حضرت نوح علیہ السلام بھی اپنی قوم کے اس رویّے کا اسی طرح ذکر کرتے ہیں:

﴿وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا﴾[2]

(اور اپنی روِش پر اَڑ گئے اور بڑا تکبّر کیا۔)

یعنی قبولِ حق سے اُنہوں نے تکبر کیا۔ تفہیم القرآن کے مطابق:

''تکبّر سے مراد یہ ہے کہ اُنہوں نے حق کے آگے سَر جُھکا دینے اور خدا کے رسول کی نصیحت قبول کر لینے کو اپنی شان سے گری ہوئی بات سمجھا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بھلا آدمی کسی بگڑے ہوئے شخص کو نصیحت کرے اور وہ جواب میں سَر جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہو اور پاؤں پٹختا ہوا نکل جائے تو یہ تکبّر کے ساتھ کلامِ نصیحت کو رَد کرنا ہوگا''[3]۔

---

1 سورۃ ص 38:65-66

2 سورۃ نوح 71:7

3 مودودی، تفہیم القرآن، ج6 ص100

اسی طرح قومِ ثمود کے ''ملأ'' و ''مترفین'' بھی حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت کو قبول کرنے میں اپنی ذلّت سمجھتے اور ازراہِ تکبر ایمان والوں سے کہنے لگے:

﴿قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا مُرْسَلٌ مِنْ رَبِّهِ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ * قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ﴾[1]

(اس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کمزور طبقہ کے اُن لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھا، کہا: کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح علیہ السلام اپنے رب کا پیغمبر ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا: بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اُسے ہم مانتے ہیں۔ اُن بڑائی کے مدعیوں نے کہا: جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اُس کے منکر ہیں۔)

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں اُن کی قوم اُنہیں دھمکیاں دے رہی ہے۔ سورۃ الاعراف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا﴾[2]

(اُس کی قوم کے سرداروں نے جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اس سے کہا کہ اے شعیبؑ! ہم تجھے اور اُن لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔)

بجائے اس کے کہ پیغمبر کی دعوت کو قبول کریں متکبرانہ انداز اختیار کر رہے ہیں کہ تمہاری پیروی تو گھاٹے کا سودا ہے اور اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم لوگوں کو بستی سے نکال باہر کریں گے۔ بگڑی ہوئی قومیں مادی طاقت اور دُنیوی وسائل کے بل بوتے متکبرانہ انداز اختیار کرتے ہوئے حق کا انکار کرتی ہیں اور بالآخر یہی گھمنڈ اُنہیں عذابِ الٰہی سے دوچار کرتا ہے یعنی ساری ناکامیوں اور گمراہی کا سبب یہی متکبرانہ رویّہ ہے۔ ہر نبی کی قوم نے اپنے نبی سے غرور و تکبر والا انداز اپنایا۔ سابقہ انبیاء کی طرح حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے ''ملأ'' و ''مترفین'' نے بھی استکبار و تکذیب کا رویّہ اپنایا۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

---

1 سورۃ الاعراف 7: 75-76

2 سورۃ الاعراف 7: 88

﴿ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوسَى وَأَخَاهُ هَارُونَ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِينٍ * إِلَى فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ﴾[1]

(پھر ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اُس کے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنی نشانیوں اور کھُلی سَند کے ساتھ فرعون اور اس کے اَعیانِ سلطنت کی طرف بھیجا مگر اُنہوں نے تکبر کیا اور وہ بہت متکبر لوگ تھے۔)

استکبار کو قرآنِ مجید میں بھی قبولِ حق میں سب سے بڑی وجہ کہا گیا ہے کیونکہ دُنیوی مال و دولت کی فراوانی اور مذہبی و دُنیوی قیادت و سیادت کی وجہ سے غرور و تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔

7.3۔آخرت سے غفلت

دُنیا میں فساد اور ظلم و استحصال اور لالچ و حرص کا سبب آخرت سے غفلت ہے۔ حُبِ دُنیا ہر بُرائی کی جڑ ہے۔ اگر ایک مرتبہ انسان حرص و لالچ کی راہ پر چل پڑے تو پھر وہ کسی بلند نصب العین کے لیے بیکار ہو جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں ''ملأ'' و ''مترفین'' کی جو عادات و خصائل بیان کیے گئے ہیں اُن میں سے ایک آخرت سے غفلت ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ یہ دُنیاوی زندگی ہی ہے۔ اُخروی زندگی کچھ بھی نہیں ہے۔ دُنیاوی ظاہری زیب و زینت کو پا کر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

آخرت اسلام کی تعلیمات میں ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ یہ خدا کو ماننے اور رسول کو تسلیم کرنے کا لازمی تقاضا ہے۔ جس طرح خدا کو تسلیم کر کے انسان آوارہ مزاجی، پریشانیوں اور دل و دماغ کی بے سکونی سے نجات حاصل کرتا ہے، رسول کو تسلیم کر کے ایک منظم اور بامقصد زندگی کا حامل بن جاتا ہے اسی طرح آخرت کو تسلیم کر کے انسان غیر مسؤولیت، غیر ذمہ داری اور بے لگامی سے نجات حاصل کر کے ایک ذمہ دارانہ زندگی اختیار کر لیتا ہے جبکہ آخرت سے غافل انسان اپنی خواہش کے سوا اور کسی حد کا پابند نہیں ہوتا۔ دُنیاوی زندگی ہی اُس کے لیے سب کچھ ہوتی ہے کیونکہ وہ دُنیاوی زندگی میں لہو و لعب اور کھیل تماشے میں مشغول ہوتا ہے اور اُخروی زندگی سے بالکل غافل ہوتا ہے۔ ''ملأ'' و ''مترفین'' دُنیاوی آن بان اور شان و شوکت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سورۃ الروم میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے:

---

1 سورۃ المؤمنون 23: 45-46

﴿يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ﴾[1]

(وہ تو صرف دُنیاوی زندگی کے ظاہر کو ہی جانتے ہیں اور آخرت سے تو بالکل ہی بے خبر ہیں۔)

ضیاءالقرآن میں پیر کرم شاہ لکھتے ہیں:

''اس آیت کا یہ مفہوم بھی بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ جن کا آنے والی زندگی پر ایمان نہیں وہ اس دُنیاوی زندگی کو پُر لطف اور باوقار بنانے کے لیے ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کی فہم و فراست کو دیکھ کر انسان عَش عَش کر اٹھتا ہے۔ تجارت، حرفت، صنعت، زراعت اور دیگر دنیاوی اُمور میں ان کی جدّت طرازیاں اور نُدرت آفرینیاں لوگوں کو حیران کر دیتی ہیں لیکن یہی لوگ بایں ہمہ عقل و دانش اپنی عاقبت سنوارنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور ایسی نیکیاں کرنے کا شوق ان کے دلوں میں پیدا نہیں ہوتا جو آسان بھی ہیں اور ارزاں بھی۔ اس معاملہ میں ان کی کوتاہیوں پر جب نظر پڑتی ہے تو ان کی نادانی اور حماقت پر ہنسی آجاتی ہے''[2]۔

یعنی اکثر لوگوں کو دُنیاوی معاملات کا خوب علم ہے اس لیے وہ ان میں تو اپنی چابکدستی اور مہارتِ فن کا مظاہرہ کرتے ہیں جن کا فائدہ عارضی اور چند روزہ ہے لیکن اس کے برعکس آخرت کے معاملات سے یہ غافل ہیں جن کا نفع مستقل اور پائیدار ہے یعنی دُنیا کے امور کو خوب پہنچاتے ہیں اور دین سے بالکل بے خبر ہیں۔

قومِ عاد جو دُنیاوی طور پر بہت خوشحال تھی اور دُنیاوی زیب و زینت پر بہت زیادہ فخر کرتے اور اسی کو سب کچھ سمجھ رکھا تھا اور آخرت کو فراموش کیے ہوئے تھی۔ جب اُن کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام نے اُنہیں اس پر متنبہ کیا تو اُن کی قوم نے اُن پر اعتراضات شروع کر دیئے اور اپنے نبی کو جھوٹا کہنا شروع کر دیا۔

﴿وَقَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ﴾[3]

(اور سردارانِ قوم نے جواب دیا جو کفر کرتے تھے اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے تھے اور ہم نے انہیں دُنیاوی زندگی میں خوشحال کر رکھا تھا کہ یہ تو تم جیسا ہی انسان ہے۔ تمہاری ہی خوراک یہ بھی کھاتا ہے اور تمہارے پینے کا

---

1 سورۃالروم 7:30

2 پیر محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن، ج 5 ص 563

3 المؤمنون 33:23

پانی ہی یہ بھی پیتا ہے)۔

یہ دُنیا جس کا سامان سراسر دھوکے کا سامان ہے اور اس کی لذتیں فانی اور ناپائیدار ہیں اور جس میں منہمک ہو کر آخرت سے غافل ہو گیا ہے، قرآنِ مجید نے تو اس دُنیاوی زندگی کو محض لہو و لعب کہا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَآ إِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾[1]

(اور یہ دُنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اصل زندگی کا گھر تو دارِ آخرت ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے)۔

یعنی دُنیا کی حقیقت تو بس لہو و لعب جیسی اور اتنی سی ہے جیسے بچے تھوڑی دیر کے لیے کھیلتے ہیں اور پھر اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ اس مختصر زندگی پر جو یہ مرمٹے ہیں اور کچھ شوکت و حشمت کے ٹھاٹھ فراہم کر لیے ہیں۔ ان کی یہ ساری کامرانیاں اور جدوجہد دل کے بہلاوے سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ بے شک جتنا دل بہلانا ہے بہلا لیں، اصل زندگی تو آخرت کی ہمیشہ رہنے والی زندگی ہے جس سے یہ غافل ہیں اور یہ دُنیاوی زندگی تو فانی ہے اور چند روزہ ہے جو کہ ظاہری زیب و زینت اور مال و اولاد کی کثرت پر فخر کرنا ہے اور پُر تعیش زندگی کی دوڑ میں مقابلہ بازی ہے۔ سورۃ الحدید میں ارشاد ہے:

﴿اِعْلَمُوٓا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِينَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا﴾[2]

(خوب جان رکھو کہ دُنیا کی زندگی صرف کھیل تماشا، زینت اور آپس میں فخر (و غرور) اور مال و اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے آپ کو زیادہ بتلانا ہے جیسے بارش اور اس کی پیداوار کسانوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر جب وہ خشک ہو جاتی ہے تو زرد رنگ میں اس کو تم دیکھتے ہو، پھر وہ بالکل چورا چورا ہو جاتی ہے)۔

مولانا وحید الدین ''تذکیر القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''دنیا میں اللہ نے آخرت کی مثالیں قائم کر دی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال کھیتی کی ہے۔ کھیتی جب پانی پا کر تیار ہوتی ہے تو تھوڑے دنوں کے لیے اس کی سرسبزی نہایت پُرکشش معلوم ہوتی ہے مگر بہت جلد گرم ہوائیں چلتی ہیں۔ ساری سرسبزی اچانک ختم ہو جاتی ہے، پھر اس کو کاٹ کر اسے چورا چورا کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا کی رونق بھی چند روزہ ہے۔ آدمی اس کو پا کر دھوکے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اسی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے مگر اس کے بعد جب وہ خدا کی طرف لوٹایا

---

1 سورۃ العنکبوت 29:64

2 سورۃ الحدید 57:20

جائے گا تو اس پر کھلے گا کہ دنیا کی رونقوں کی کوئی حقیقت نہ تھی"[1]۔

اسبابِ دنیا کی کثرت اور آسائش و راحت سے بھرپور زندگی بعض اوقات قبولِ حق کی راہ میں رُکاوٹ بن جاتی ہے۔ آسودہ اور خوشحال زندگی انسان کے اندر سے اطاعت کا جذبہ چھین لیتی ہے اور اسے اللہ کا باغی بنا دیتی ہے۔ عیش و عشرت میں انسان اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو رَد کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سرکشی پر بار بار متنبہ کرتا ہے لیکن اپنی سرکشی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے وہ اپنی نافرمانی سے باز نہیں آتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ مکافات اس کو پیس کر رکھ دیتا ہے۔

7.4۔ مفاد پرستی

دُنیا میں اصل فساد کی جڑ یہی مفاد پرستی ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَا فِي قَرۡيَةٖ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوهَآ إِنَّا بِمَآ أُرۡسِلۡتُم بِهِۦ كَٰفِرُونَ﴾[2]

(کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے۔)

ترجمان القرآن کے مطابق:

"انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا مقابلہ سب سے پہلے خوشحال طبقوں نے کیا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر دعوتِ حق کامیاب ہو گئی تو ان کے ظالمانہ اختیارات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ لوگ اپنی دولت و اقتدار کے نشے میں یہ کہہ کر انبیاء علیہم السلام کی دعوت ٹھکرا رہے ہیں کہ ہم تم سے زیادہ اللہ کے ہاں پسندیدہ ہیں اور قرآنِ مجید نے متعدّد مقامات پر دنیا پرستوں کی اس گمراہی اور غلط فہمی کی تردید کی ہے"[3]۔

قرآنِ حکیم کی اس آیت سے بھی وضاحت ہو رہی ہے کہ انکار کا سبب یہی مفاد پرستی ہے یعنی اُنہیں اس بات کا ڈر ہوتا ہے کہ جو دنیاوی مقام و مرتبہ اور شان و شوکت ہے اُس سے وہ محروم ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

---

1 وحید الدین خان، تذکیر القرآن، ج 6 ص 1464، مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی، اشاعت اوّل، 1985ء

2 سورۃ سبا 34:34

3 آزاد، ابوالکلام احمد، ترجمان القرآن، ج 3 ص 229، اسلامی اکادمی اُردو بازار لاہور، 1986ء

''تاریخِ انبیاؑ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ دعوت کی مخالفت میں یہی صاحبانِ اثر و رسوخ پیش پیش ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کی نظر سطحی احوال پر ہوتی ہے اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ اس دعوت کو قبول کرنے کے نتیجے میں ان کی سیادت اور انکا اثر و رسوخ ختم ہو جائے گا، حالانکہ نئی دعوت کی کامیابی کی صورت میں قیادت انہی کے پاس ہوتی ہے جو سب سے پہلے اسے قبول کرتے ہیں۔ غالباً سب سے بڑی وجہ ان کی شر پسندی اور بغاوت ہوتی ہے جو انہیں اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی متابعت سے روکتی ہے۔ چونکہ وہ دعوت کو رد کر بیٹھتے ہیں اس لیے اس کے خلاف دلائل بھی مہیا کرتے ہیں اور عملاً صف آراء بھی ہوتے ہیں''[1]۔ سورۃ القصص میں ارشاد ہے:

﴿وَقَالُوٓا إِن نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَآ﴾''[2]

(وہ کہتے ہیں: اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کرلیں تو اپنی زمین سے اُچک لیے جائیں گے۔)

مولانا مودودی ''تفہیم القرآن'' میں اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''جب نبی کریم ﷺ کی دعوتِ توحید اُٹھی تو دینِ آبائی کے تعصّب سے بھی بڑھ کر جو چیز قریش کے لیے اُس کے خلاف وجہ اشتعال بنی وہ یہ تھی کہ اس دعوت کی بدولت انہیں اپنا مفاد خطرے میں نظر آرہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ معقول دلائل اور حجتوں سے شرک و بُت پرستی غلط اور توحید صحیح بھی ہو تو اُس کو چھوڑنا اور اسے قبول کرلینا ہمارے لیے تباہ کن ہے۔ ایسا کرتے ہی تمام عرب ہمارے خلاف بھڑک اُٹھے گا، ہمیں کعبہ کی تولّیت سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ بُت پرست قبائل کے ساتھ ہمارے وہ تمام معاہدانہ تعلّقات ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے ہمارے تجارتی قافلے رات دن عرب کے مختلف حصّوں سے گزرتے ہیں۔ اِسی طرح یہ دین ہمارے مذہبی اثر و رسوخ کا بھی خاتمہ کردے گا اور ہماری معاشی خوشحالی کا بھی، بلکہ بعید نہیں کہ تمام قبائلِ عرب ہمیں سرے سے مکّہ چھوڑ دینے پر مجبور کردیں گے''۔

امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ بعینہٖ وہی اعتراض ہے جو آج ہمارے لیڈر حضرات اسلامی نظام، اسلامی معاشرت، اسلامی حدود و تعزیرات اور اسلام کے نظامِ معیشت کے خلاف اُٹھاتے ہیں کہ اگر ہم ان کو اختیار کرلیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے تمام نظامِ معیشت و معاشرت کا تیا پانچہ کرکے رکھ دیں اور ساری دُنیا میں نکو بن کے رہ جائیں''[1]۔

---

1 خالد علوی، پیغمبرانہ منہاج دعوت، ص 26

2 سورۃ القصص 28:57

مختصراً یہ کہ جس کے پاس بھی اقتدار و اختیار ہے وہ کبھی بھی نہیں چاہتا کہ اُس کا سورج غروب ہو کیونکہ اس سے اُن کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ دعوت کو قبول کرنے سے اُنہیں یہ خدشہ ہوتا ہے کہ اُن کی پیشوائی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اُن کی جمعیت منتشر ہو جائے گی اور اُن کی ہوا اُکھڑ جائے گی۔

خود آزمائی

1۔ دعوت انبیاء کے مقاصد بیان کریں۔

2۔ دعوت انبیاء کے مشترکہ نکات بیان کریں۔

3۔ دعوت ابنیاء کے اولیں مخاطبین کون لوگ ہوتے ہیں؟ بیان کریں۔

4۔ انبیائے کرام کے طریق دعوت کے اہم نکات تحریر کریں۔

5۔ انبیائے کرام کی دعوت قبول نہ کرنے والوں کی عادات کیا ہیں؟ بیان کریں۔

ماٰخذ و مصادر

ا۔	دعوت دین اور اس کا طریقہ کار	مولانا امین احسن اصلاحی
۲۔	منہاج دعوت	ڈاکٹر خالد علوی

---

1 اصلاحی، امین احسن، تدبرِ قرآن، ج 5 ص 692

یونٹ نمبر 5

داعی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت (مکی و مدنی)

تالیف:

ڈاکٹر محمد سجاد

فہرست

	صفحہ نمبر
یونٹ کا تعارف	175
یونٹ کے مقاصد	176
1۔دعوت نبوی: مکی دور و مرحلہ دعوت	177
1۔بعثت نبوی اور دعوت کا آغاز	177
2۔پس پردہ تین سال دعوت: پہلا مرحلہ	179
3۔دعوت ذوالعشیرہ: دعوت نبوی کا دوسرا مرحلہ	181
4۔اعلانیہ دعوت: دعوت کا تیسرا مرحلہ	184
5۔بیرون کہ دعوت: دعوت کا چوتھا مرحلہ	186
6۔قبائل اور افراد کو اسلام کی دعوت	189
7۔بیرونِ مکہ اسلامی دعوت کی کامیابی	192
8۔دعوتِ نبوی: مدنی دور و مرحلہ	199
9۔ صلح حدیبیہ کے بعد عالمی دعوت	208
10۔خود آزمائی	228

یونٹ کا تعارف

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت راہنمائی کے لئے انبیاء ورسل کو مبعوث فرمایا۔ سلسلہ رسالت و نبوت کی آخری کڑی آقائے دوجہاں خاتم الانبیاء والرسل حضرت محمد ﷺ ہیں۔آپ ﷺ کی زندگی کو ہمارے لئے اسوہ و نمونہ قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں جہاں ہمارے لئے ہر اعتبار اسوہ موجود ہے وہیں آپ ﷺ کی سیرت میں دعوتی پہلوؤں سے بھی مکمل اسوہ و نمونہ موجود ہے۔ سیرتِ نبوی ﷺ کے مطالعہ سے دعوت نبوی کے تمام مراحل، پس پردہ وسری دعوت، اعلانیہ و جہری دعوت، اجتماعی وانفرادی دعوت، اسلوبِ دعوت، مبادیات و ترجیحات دعوت، وسائل دعوت، مخالف و معاند فضاء میں دعوت اور سازگار و موافق ماحول میں دعوت، یہ تمام پہلو بہت نمایاں اور واضح ہو جاتے ہیں۔ مکی عہد نبوت کے تیرہ سالوں میں مرحلہ وار دعوت حق کو آپ ﷺ نے پیش فرمایا۔اولیں مرحلہ دعوت میں آپ ﷺ نے اپنے قریبی ساتھیوں کو ایمان واسلام کی دعوت دی۔ پس پردہ دعوت کے تین سالوں میں ایک اچھی خاصی تعداد ایمان لے آئی۔ دعوت کے دوسرے مرحلہ میں آپ ﷺ نے رشتہ داروں کو دعوت دی۔ مکی دور میں دعوت کے اہم مراکز میں آپ ﷺ کا گھر، دار ارقم، حضرت ابو بکر کا گھر، حضرت فاطمہ بن خطاب کا گھر، صحن حرم، مکہ مکرمہ کی گھاٹیاں، ام القری اور اس کے ارد گرد کے تمام قبائل، حج کے موقع پر آنے والے قبائلی وفود جو منی میں قیام کرتے، مکی عہد میں ہی مدینہ تک دعوت اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔

مکی دور میں صحابہ کرامؓ کی دعوتی سرگرمیوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ کارِ نبوت کی انجام دہی میں صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کی بھرپور معاونت کی اور حق کی تبلیغ میں انہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کی طرح ہر تکلیف اور مصیبت کا بڑی خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ مکی دور کے ابتدائی سالوں میں اشاعتِ اسلام کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ نبوی ہدایت کے مطابق صحابہ کرامؓ اپنے اپنے خاندان اور اہل خانہ کو اسلام کی دعوت دیتے تھے جس کے نتیجہ میں کئی لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ چنانچہ حضرت عمارؓ بن یاسر اسلام لائے تو تمام گھر والوں کو بھی اسلام کی دعوت دی جس کے نتیجے میں ان کے تمام اہل خانہ نے اسلام قبول کر لیا۔اسی طرح حضرت طلیبؓ بن عمیر کی دعوت پر ان کی والدہ ارویؓ بنت عبدالمطلب نے اسلام قبول کیا اور حضرت ابو بکرؓ کی والدہ بھی ان کی کوششوں سے ہی مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کو اپنے ذاتی کردار اور محاسن سے متاثر کر کے اسلام کی طرف بلایا جائے۔ حضرت ابو بکرؓ کی شخصی خوبیوں کی وجہ سے لوگ ان کی مجلس میں آتے تو آپ ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے۔ مکی عہدِ نبوت میں تبلیغ اسلام کا

ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام سرزمین مکہ تک محدود نہ رہا بلکہ بہت جلد جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں میں اسلام کی گونج سنائی دینے لگی۔ صحابہ کرامؓ کی کوششوں سے قبیلہ غفار، قبیلہ ازدشنوءۃ، قبیلہ دوس اور یثربی قبائل اوس وخزرج کے علاوہ کئی دیگر قبائل میں بھی اسلام پھیل گیا، بلکہ ہجرتِ حبشہ کی بدولت اب اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی ذات اہل حبشہ کے لئے بھی کسی تعارف کی محتاج نہ رہی تھی۔ مکہ مکرمہ کی طرح مدینہ میں بھی ہجرت سے قبل چند دعوتی وتبلیغی مراکز کا سراغ ملتا ہے۔ قبا، مسجدِ بنی زریق اور نقیع الخضمات کی درسگاہیں قبل از ہجرتِ مدینہ، اہم دعوتی وتبلیغی مراکز تھے، جہاں پر سالم مولی ابی حذیفہؓ اور مصعبؓ بن عمیر جیسے معلّمین، انصار کی تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔

مدینہ میں اسلام کی ہمہ گیر اشاعت اور فروغ میں ان انصار صحابہ کرامؓ کا کردار بھی بڑا اہم ہے جن کو رسول اللہ ﷺ نے بیعتِ عقبہ ثانیہ کے بعد اپنے اپنے قبیلے اور خاندان کا نقیب مقرر فرمایا تھا۔ چنانچہ ان صحابہ میں سے حضرت اسعدؓ بن زرارہ، رافعؓ بن مالک، اُسیدؓ بن حضیر، عبادہؓ بن صامت اور سعدؓ بن معاذ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنہوں نے اسلام کے فروغ میں اپنے علم اور اثر ورسوخ کو پوری طرح استعمال کیا۔ اس یونٹ میں دعوت نبوی ﷺ کے دونوں ادوار مکی ومدنی کا تاریخی مطالعہ پیش کریں گے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ دعوت نبوی ﷺ کے مختلف مراحل کے متعلق وضاحت کر سکیں۔

2۔ دعوت نبوی کے مکی دور کے اہم واقعات بیان کر سکیں۔

3۔ مکی عہد نبوت میں اہم دعوتی مراکز کی تاریخی اہمیت جان سکیں۔

4۔ نبی اکرم ﷺ کی دعوتی حکمت عملی کی وضاحت کر سکیں۔

5۔ مدنی دور میں دعوتی سرگرمیوں کے متعلق آگاہی حاصل کر سکیں۔

1۔دعوت نبوی: مکی دور و مرحلہ دعوت

1۔بعثت نبوی اور دعوت کا آغاز

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لیے اپنے آخری نبی سیدنا محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ خاتم النبیین ﷺ بنا کر بھیجا۔ آپ ﷺ پر وحی کا سلسلہ کا آغاز رؤیا صادقہ کے ذریعے ہوا۔ سیدہ عائشہ صدیقہؓ، فرماتی ہیں:

((عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ أَنَّهَا قَالَتْ: أَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ، فَكَانَ لاَ يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ، ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الخَلاَءُ))[1]

ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ بیان کرتی ہیں کہ وحی کی ابتداء نبی اکرم ﷺ پر جو ہوئی وہ سچے خواب تھے جو نیند میں آتے، آپ جو بھی خواب دیکھتے وہ صبح روشن کی طرح سچا ہوتا، پھر آپ کو علیحدگی پسند آگئی۔

آپ ﷺ نے مکہ شہر سے دو تین کلو میٹر دور غارِ حرا میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت میں اور غور و فکر اور تدبر میں مصروف ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔ صحیح بخاری میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

((وَكَانَ يَخْلُو بِغَارِ حِرَاءٍ فَيَتَحَنَّثُ فِيهِ - وَهُوَ التَّعَبُّدُ - اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ العَدَدِ قَبْلَ أَنْ يَنْزِعَ إِلَى أَهْلِهِ، وَيَتَزَوَّدُ لِذَلِكَ، ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى خَدِيجَةَ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا، حَتَّى جَاءَهُ الحَقُّ وَهُوَ فِي غَارِ حِرَاءٍ، فَجَاءَهُ المَلَكُ فَقَالَ: اقْرَأْ، قَالَ: «مَا أَنَا بِقَارِئٍ»، قَالَ: "فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الجَهْدَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي، فَقَالَ: اقْرَأْ، قُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الجَهْدَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي، فَقَالَ: اقْرَأْ، فَقُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي، فَقَالَ: {اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ. خَلَقَ الإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اقْرَأْ وَرَبُّكَ الأَكْرَمُ))[2]

اور آپ غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور وہاں پر کئی کئی راتوں تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور واپس گھر نہ آتے اور کھانے پینے کا سامان بھی اپنے ساتھ لے جاتے جب چیزیں ختم ہو جاتیں تو پھر سیدہ خدیجہ کے پاس آتے اور اپنا زادِ راہ لے کر واپس غار میں چلے جاتے۔ حتیٰ کہ آپ کے پاس حق آگیا اور آپ غارِ ہی میں تھے۔ فرشتہ آیا اس نے کہا: ''پڑھ'' میں

---

1 البخاری، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ

2 السھیلی، الاروض الانف فی شرح سیرۃ النبویۃ لابن ہشام، ج ۲، ص، ۲۵۰۔ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۱۹۴، ۱۹۵

نے کہا: ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' پھر اس فرشتہ نے مجھے پکڑا اور خوب زور سے دبایا اور چھوڑ کر کہا: ''پڑھو۔'' تو میں نے پھر کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر اس نے دوسری بار مجھے پکڑا اور خوب زور سے دبایا، جس سے مجھے تکلیف ہوئی اور چھوڑ کر کہا: ''پڑھو'' تو میں نے پھر جواب دیا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا، پھر اس نے تیسری بار پکڑا اور خوب زور سے دبایا جس سے مجھے تکلیف ہوئی اور چھوڑ کر کہا، پڑھو:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ﴾[1]

''اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا ہے۔ جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھ اور تیرا پروردگار بڑی عزت والا ہے۔''

اب تیسری بار کے بعد اللہ رب العزت نے اپنے نبی کی زبان پر وحی کے الفاظ کو جاری فرمادیا اور یہ قرآن مجید کی صورت میں پہلی وحی ہے جو آپ کے قلب منور پر نازل کی گئی۔

اس پہلی وحی کے نزول کے بعد آپ سیدہ خدیجہؓ کی طرف واپس پلٹے حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں:

((فَرَجَعَ بِهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْجُفُ فُؤَادُهُ، فَدَخَلَ عَلَى خَدِيجَةَ بِنْتِ خُوَيْلِدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، فَقَالَ: «زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي» فَزَمَّلُوهُ حَتَّى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ، فَقَالَ لِخَدِيجَةَ وَأَخْبَرَهَا الخَبَرَ: «لَقَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي))[2]

''نبی ﷺ (غارِ حراء) سے واپس لوٹے اور آپ کا جسم کانپ رہا تھا آپ خدیجہ بنت خویلد کے پاس آئے اور کہہ رہے تھے کہ مجھ پر چادر ڈالو، مجھ پر چادر ڈالو، تو انھوں نے آپ پر چادر ڈال دی حتیٰ کہ آپ سے کچھ خوف دور ہوا، تو آپ نے حضرت خدیجہ کو تمام واقعہ سنایا، اور آپ فرماتے ہیں کہ مجھے میری جان کا خطرہ ہے۔''

سیدہ خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دی اور اطمینان دلایا، اور فرمایا۔

((فَقَالَتْ خَدِيجَةُ: كَلَّا وَاللَّهِ مَا يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَحْمِلُ الكَلَّ، وَتَكْسِبُ المَعْدُومَ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الحَقِّ))[3]

---

1 سورۃ العلق ۹۶: ۱، ۲، ۳

2 ابن قیم، محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد شمس الدین الجوزی (م ۷۵۱ھ)، زاد المعاد فی ہدیہ خیر العباد، مؤسسہ الرسالہ، بیروت، ط ۱۹۹۴، ج ۱، ص ۸۵

3 البخاری، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ۔ صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم، ص ۹۴۔

"ہر گز نہیں ! اللہ کی قسم ! اللہ کبھی آپ کو رسوا نہیں کرے گا (ضائع نہیں کرے گا) اس لیے کہ اپ اپنے قریبیوں کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں اور کمزوروں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں اور ناداروں کی خدمت کرتے ہیں اور مہمان کی عزت کرتے ہیں، اور آپ حق کا ساتھ دیتے ہیں۔"

پہلی وحی کے کچھ عرصہ بعد ہی دوسری وحی نازل ہوئی جس میں آپ ﷺ کو دعوت و تبلیغ کا حکم دیا گیا۔ ارشاد الٰہی ہوا۔

﴿يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَأَنْذِرْ. وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ. وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ. وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾[1]

اے چادر اوڑھنے والے، اٹھ اور لوگوں کو خبردار کر۔ اپنے رب کی بڑائی بیان کر، اپنے دامن کو پاک رکھ اور ناپاکی سے دور رہ۔

2۔ پس پردہ تین سال دعوت: پہلا مرحلہ

رسول اللہ ﷺ نے حکمِ الٰہی کے مطابق دعوت کے کام کا آغاز نہایت حکمت، تدبر اور تدریج کے ساتھ فرمایا۔ آپ ﷺ نے ابتداً اُن لوگوں کے سامنے دعوت پیش کی جو آپ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہو چکے تھے اور آپ ﷺ کے اخلاق اور چالیس سالہ زندگی کے شب و روز سے آگاہ تھے۔ انہوں نے بلا تامل اس دعوت کو قبول کر لیا چنانچہ عورتوں میں حضرت خدیجہؓ، مردوں میں حضرت ابو بکرؓ، غلاموں میں حضرت زیدؓ بن حارثہ اور بچوں میں حضرت علیؓ نے سب سے پہلے قبولیتِ اسلام کا شرف حاصل کیا۔ تیرہ سالہ مکی دور کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دعوتِ دین کے لئے صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کی بھرپور معاونت کی اور اس ضمن میں پیش آنے والی ہر اذیت، تکلیف اور دکھ کو بڑی خندہ پیشانی سے برداشت۔ مکی دور میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے ہر فرد تک انفرادی سطح پر دعوت پہنچانے کا اسلوب اختیار کیا اور یہ حقیقت ہے کہ اگر افراد تک ذاتی سطح پر بات پہنچائی جائے تو اس کا یقیناً اثر ہوتا ہے۔ اس لئے اسوۂ رسول ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے صحابہ کرامؓ نے بھی اس اندازِ دعوت کو بڑے مؤثر طریقۂ تبلیغ کے طور پر اپنایا۔ چنانچہ مکی دور کے ابتدائی سالوں میں کئی لوگوں کا صحابہ کرامؓ کی دعوت پر اسلام قبول کرنا اس طریقۂ تبلیغ کی کامیابی کی روشن دلیل ہے۔ علامہ ابن الاثیر حضرت ابو بکر صدیقؓ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

واسلم على يده جماعة لمحبتهم له وميلهم اليه حتىٰ انه اسلم على يده خمسة من العشر

"ان (ابو بکرؓ) کے ہاتھ پر ایک جماعت جن کو ان کے ساتھ محبت و تعلق تھا، اسلام لائی۔ یہاں تک کہ عشرہ مبشرہ میں

ابن قیم، زاد المعاد فی ھدیۃ خیر العباد، ج ۱، ص ۸۵، ۸۶

[1] سورۃ المدثر ۷۴: ۱، ۲

سے پانچ بزرگ بھی ان کے ہاتھ پر اسلام لائے''۔

حضرت عثمان بن عفانؓ کے تذکرہ میں ان بعض ناموں کی تفصیل بھی ہے جنھوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں یہ کامیابی انفرادی سطح پر خفیہ دعوت کی بدولت حاصل ہوئی۔

''کان رجال قریش یأتونه و یألفونه لغیر واحد من الامر لعلمه وتجاربه وحسن مجالسه فجعل یدعو الی الاسلام من وثق به من قومه ممن یغشاه و یجلس الیه فاسلم علی یده فیما بلغنی الزبیر بن العوام رضی اللہ عنہ وعثمان رضی اللہ عنہ بن عفان وطلحة رضی اللہ عنہ بن عبیداللہ''

''قریش کے لوگ حضرت ابو بکرؓ کے پاس آتے تھے اور متعدد وجوہ مثلاً علم، تجربہ اور حسنِ مجالست کی بناء پر ان سے محبت کرتے تھے۔ چنانچہ آنے والوں اور ساتھ بیٹھنے والوں میں سے جن لوگوں پر ان کو اعتماد تھا ان کو انہوں نے دعوتِ اسلام دی اور جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے ان کے ہاتھ پر زبیر بن عوامؓ، عثمانؓ بن عفان اور طلحہؓ بن عبید اللہ اسلام لائے''۔

حضرت ابو بکرؓ کو قریش میں جو مقام و مرتبہ حاصل تھا، جس کی بناء پر وہ قریش میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہے، ان کی اس حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے ابن ہشام لکھتے ہیں:

''وکان ابوبکر رجلا مألفاً لقومه،محبّباً سهلاً ،وکان أنسب قریش لقریش ،وأعلم قریش بها،وبما کان فیها من خیر وشر،وکان رجلاً تاجرًا،ذا خلق ومعروف ،وکان رجال قومه یأتونه،ویألفونه لغیر واحد من الأمر ، لعلمه وتجارته وحسن مجالسته. فجعل یدعو إلی الله وإلی الاسلام من وثق به من قومه، ممن یغشاه ویجلس الیه''[1]

''ابو بکرؓ اپنی قوم میں بہت تعلقات رکھنے والے، محبوب، نرم اخلاق، قریش میں بہترین نسب والے تھے، قریش کے انساب کا انہیں تمام قریش سے زیادہ علم تھا اور ان کی اچھائی برائی کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ تجارت کرتے تھے، خوش مزاج تھے، ہر ایک سے نیک سلوک کرتے تھے۔ علم، تجارت اور حسنِ معاملات کے سبب قوم کے تمام افراد آپ کے پاس آتے تھے اور آپ سے تعلقات رکھتے تھے، آپ نے قوم کے ان تمام افراد کو اسلام کی جانب بلانا شروع کر دیا، جن پر آپ کو بھروسا تھا اور جو کہ آپ کے پاس آتے جاتے تھے اور اٹھتے بیٹھتے تھے''۔ جن لوگوں نے حضرت

---

1 طبری، تاریخ الرسل والملوک، ج ۲، ۳۱۸۔ السھیلی، الروض الانف فی شرح السیرۃ النبویۃ لابن ہشام، ج ۲، ص ۲۵۰

ابو بکرؓ کی تبلیغ اور کوششوں سے اسلام قبول کیا ابنِ ہشام نے ان کے نام ذکر کئے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

عثمانؓ بن عفان، زبیرؓ بن عوام، عبدالرحمنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص، طلحہؓ بن عبید اللہ، ابو عبیدہؓ بن الجراح، ابو سلمہؓ، ارقمؓ بن ابی الارقم، عثمانؓ بن مظعون نیز ان کے دونوں بھائی قدامہؓ اور عبداللہؓ، عبیدہؓ بن الحارث، سعیدؓ بن زید نیز ان کی بیوی فاطمہ بنت الخطابؓ، اسماء بنت ابی بکرؓ، عائشہ بنت ابی بکرؓ، خبابؓ بن الارت، عمیرؓ بن ابی وقاص، عبداللہؓ بن مسعود، مسعودؓ بن القاری، مسعودؓ بن ربیعہ، سلیطؓ بن عمرو اور ان کے بھائی حاطبؓ، عیاشؓ بن ربیعہ اور ان کی بیوی اسماءؓ بنت سلامہ، عامرؓ بن ربیعہ، عبداللہؓ بن جحش اور ان کے بھائی احمدؓ، جعفرؓ بن ابی طالب اور ان کی زوجہ اسماءؓ بنت عمیس، حاطبؓ بن الحارث اور ان کی بیوی فاطمہ بنت المجلل، خطابؓ بن الحارث اور ان کی بیوی فکیہہؓ بنت یسار، معمرؓ بن الحارث، السائبؓ بن عثمانؓ بن مظعون، المطلبؓ بن ازھر اور ان کی بیوی رملہؓ بنت ابی عوف، نعیمؓ بن عبداللہ *، عامرؓ بن فھیرہ مولی ابی بکرؓ، خالدؓ بن سعید اور ان کی بیوی امینہؓ بنت خلف بن اسد، حاطبؓ بن عمرو، ابو حذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ، واقدؓ بن عبداللہ، خالدؓ، عامرؓ، عاقلؓ اور ایاسؓ بنو البکیر بن عبد یالیل میں سے، عمار بن یاسرؓ اور صہیبؓ بن سنان۔

ائمہ سیرت نے مختلف روایات کو جمع کر کے چالیس کے قریب صحابہ کرام کی فہرست دی ہے جو خفیہ دعوت کے ابتدائی تین سال میں مسلمان ہوئے۔ یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اس کے بعد مرد اور عورتیں جماعت در جماعت اسلام میں داخل ہوئے یہاں تک کہ مکہ میں اسلام کا ذکر پھیل گیا اور لوگوں میں اس کا چرچا ہو گیا۔ تین سال تک دعوت کا کام خفیہ اور انفرادی رہا اور اس دوران اہل ایمان کی ایک جماعت تیار ہو گئی۔ جو اخوت اور تعاون پر قائم تھی، اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا رہی تھی اور اس پیغام کو اس کا مقام دلانے کے لیے کوشاں تھی۔

3۔ دعوت ذوالعشیرہ: دعوت نبوی کا دوسرا مرحلہ

سورہ الشعراء میں حکم ہوا:

﴿ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ﴾[1]

''اور ڈرا اپنے قریبی رشتہ داروں کو۔''

ابتدائی خفیہ دعوت کے تین سال کے دوران نبی ﷺ کو سیدنا صدیق اکبر، علی المرتضیٰ، فاروق اعظم، سعد بن ابی وقاص جیسے مخلص اور بہادر، ذہین و فطین لوگ مل چکے تھے۔ اب وہ وقت آ چکا تھا کہ اس دعوت کا کھلے عام اعلان کر دیا جائے اس

---

[1] سورۃ الشعراء ۲۶: ۲۱۴

کے نتیجے میں اگر کوئی اندرونی اور بیرونی دباؤ آئے بھی تو اب یہ قابل برداشت تھا۔اس لیے آپ نے انتہائی مناسب وقت پر دعوت عام کا اعلان ضروری سمجھا۔اللہ تعالیٰ کی حکمت اور منشا بھی یہی تھی۔ تبھی اللہ نے حکم دیا کہ:

﴿وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ﴾ [1]

یہ سورہ شعراء کی آیت ہے اس آیت کے آگے پیچھے سیدنا موسیٰ علیہ اسلام کی قوم بنی اسرائیل کا تذکرہ ہے کہ جب انھوں نے اپنی قوم کو دعوت دی اور بنی اسرائیل کو نجات دلائی دعوت کے نتیجے میں جو بھی ردعمل سامنے آیا موسیٰ علیہ اسلام کی دعوت کے اتار چڑھاؤ کی تمام تفصیل اس سورہ مبارکہ میں ذکر ہے۔اس تذکرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو دعوت عام پیش کرنے کا حکم دیا ہے،اس میں کیا حکمت ہے؟مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ ''الرحیق المختوم''میں اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''میرا خیال ہے جب رسول اللہ ﷺ کو اپنی قوم کے اندر کھل کر تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ اسلام کے واقعے کی یہ تفصیل اس لیے بیان کر دی گئی تاکہ کھلم کھلا دعوت دینے کے بعد جس طرح کی تکذیب ظلم و زیادتی سے سابقہ پیش آنے والا تھا اس کا ایک نمونہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام علیہ اسلام کے سامنے موجود ہو۔''[2]

دوسری طرف اس سورت میں پیغمبروں کو جھٹلانے والی قوم مثلاً: فرعون اور قوم فرعون کے علاوہ قوم نوح علیہ اسلام، عاد و ثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط اور اصحاب الایکہ کے انجام کا بھی ذکر ہے۔اس کا مقصد غالباً یہ ہے کہ جو لوگ آپ کو جھٹلائیں انھیں معلوم ہو جائے کہ تکذیب پر اصرار کی صورت میں ان کا انجام کیا ہونے والا ہے اور وہ اللہ کی طرف سے کس طرح کے مواخذے اور عذاب سے دوچار ہوں گے۔ نیز اہل ایمان کو معلوم ہو جائے کہ فلاح و کامیابی انھیں کو ملے گی۔ جھٹلانے والوں کو نہیں۔

ایک روایت حسن بن ابی الحسن سے مروی ہے کہ جب ﴿وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ﴾ نازل ہوئی، آپ نے ''ابطح''میں کھڑے ہو کر کہا: اے بنی عبد المطلب! اے بنی عبد مناف، اے بنی قصی، پھر آپ نے قریش کے تمام قبائل کے نام اور خاندانوں کے نام فرداً فرداً نام لے کر مخاطب کر کے کہا: ''میں تم کو اللہ کی جانب بلاتا ہوں اور اس کے عذاب سے ڈراتا ہوں۔''[3]

---

1 سورۃ الشعراء ۲۶: ۲۱۴

2 صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم، ص ۱۱۲

3 البخاری، کتاب التفسیر، باب وانذر عشیرتک الاقربین، صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم، ص ۱۱۶۔

عبدالرحمن بن قاسم نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ جو پیام اللہ کی جانب سے آپ کو ملا ہے کہ اس کا اعلان کریں، لوگوں کو اپنی تعلیم دیں اور اللہ کی طرف دعوت دیں، نبی ہونے کے بعد تین سال تک آپ خفیہ اپنی تعلیم دیتے تھے۔ اس کے بعد آپ کو اعلانیہ تبلیغ کا حکم ہوا۔

''الرحیق المختوم'' اور دیگر کتب سیرت میں یہ روایات موجود ہیں کہ اعلانیہ دعوت کے حکم پر جب آپ نے قبائل عرب کو بلایا ان کے سامنے دعوت پیش کی تو ابو لہب نے فوراً بات لپک لی اور بولا: ''یہ تمھارا چچا اور چچیرے بھائی ہیں، بات کرو لیکن نادانی چھوڑ دو۔'' اور یہ سمجھ لو کہ تمھارا خاندان سارے عرب سے مقابلے کی تاب نہیں رکھتا اور میں سب سے زیادہ حق دار ہوں۔ کہ تمھیں پکڑ لوں پس تمہارے لیے تمہارے باپ کا خانوادہ کافی ہے۔ اور اگر تم اپنی بات پر قائم رہے تو یہ بہت آسان ہو گا کہ قریش کے سارے قبائل تم پر ٹوٹ پڑیں اور بقیہ عرب بھی ان کی مدد کریں پھر میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص اپنے باپ کے خانوادے کے لیے تم سے بڑھ کر شر اور تباہی کا باعث ہو گا اس پر نبی اکرم ﷺ نے خاموشی اختیار کر لی اور اس مجلس میں گفتگو نہ کی۔ اس کے بعد آپ نے انھیں دوبارہ جمع کیا اور ارشاد فرمایا:

''ساری حمد اللہ کے لیے ہے میں اس کی حمد کرتا ہوں، اور اس سے مدد چاہتا ہوں اس پر ایمان رکھتا ہوں، اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں پھر آپ نے فرمایا: راہنما اپنے گھر کے افراد سے جھوٹ نہیں بول سکتا، اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں تمھاری طرف بالخصوص اور عامۃالناس کی طرف بالعموم اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔ بخدا تم لوگ اس طرح موت سے دوچار ہوں گے جیسے سو جاتے ہو اور اسی طرح اُٹھائے جاؤ گے جیسے سو کر جاگتے ہو۔ پھر جو کچھ تم کرتے ہو اس کا حساب لیا جائے گا اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لیے جنت ہے یا ہمیشہ کے لیے جہنم۔''

اس پر ابو طالب نے کہا نہ پوچھو ہمیں تمھاری معاونت کس قدر پسند ہے، تمھاری نصیحت کس قدر قابل قبول ہے اور ہمیں تمہاری بات پر کس حد تک یقین ہے، یہ تمہارے باپ کا خانوادہ جمع ہے میں بھی اس کا ایک فرد ہوں میں تمہاری پسند میں پیش پیش ہوں لہٰذا جس بات کا آپ کو حکم ملا ہے آپ اسے انجام دیں میں تمہاری مسلسل حفاظت و مدد کرتا

حضرت علیؑ کے اس فرمان ''کہ ان میں سے ہر شخص اس کو کھا جاتا'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ کھانا جو اُن تمام لوگوں کے لیے تیار کیا گیا تھا وہ اتنا کم تھا کہ اگر اُس کو اکیلا آدمی بھی کھانا چاہتا تو آسانی سے کھا سکتا تھا لیکن یہ اعجازِ نبوت تھا کہ اللہ نے اس کھانے میں اور دودھ میں اتنی برکت ڈال دی کہ تمام مدعوین نے خوب سیر ہو کر کھایا لیکن وہ تب بھی ختم نہ ہوا۔

رہوں گا، البتہ میری طبیعت عبد المطلب کا دامن و دین چھوڑنے پر تیار و راضی نہیں۔ اس پر ابو لہب نے کہا خدا کی قسم تم خود اس کو پکڑ لو بجائے اس کے کہ لوگ اسے کچھ کہیں۔ ابو طالب نے کہا خدا کی قسم جب تک جان میں جان ہے ہم اس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔[1]

کتب سیرت کی ان تمام روایات کو جمع کرکے اگر نبی ﷺ کے اسلوبِ دعوت، طریق دعوت، اندازِ دعوت کا تحلیلی تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ کتنے باہمت اور عمیق منصوبہ ساز تھے کہ قریش کی تمام شرور سے بھی بچے رہے اور بڑے خلوص اور پر حکمت انداز میں اپنی دعوت کو ان تک پہنچایا ہے ان تمام روایات میں آپ کی دعوت کے نمونے جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔

4۔ اعلانیہ دعوت: دعوت کا تیسرا مرحلہ

جب خفیہ دعوت کے نتیجے میں نبی اکرم ﷺ کو مخلص اور قیمتی لوگ میسر آگئے جن کی بدولت آپ کا حوصلہ بڑھ گیا اور آپ کا عزم مزید پختہ ہوا، دوسری طرف جب نبی اکرم ﷺ نے اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ دین کی تبلیغ کے دوران ابو طالب ان کی حمایت کریں گے، تو ایک روز آپ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر آواز لگائی! یا صباحاہُ (ہائے صبح) عرب خطرے سے خبردار کرنے کے لیے اس طرح کی آواز لگاتے تھے۔ یہ آواز سن کر عرب کے قبائل آپ کے گرد جمع ہو گئے تب آپ نے انھیں اللہ کی توحید اور اپنی رسالت کی دعوت پیش کی۔[2]

حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ جب ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ نازل ہوئی تو نبی ﷺ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر آواز لگانی شروع کی: "اے بنی فہر، اے بنی عدی، یہاں تک کہ سب کے سب اکٹھے ہو گئے حتیٰ کہ اگر کوئی آدمی خود نہ آسکا تو اس نے اپنا آدمی بھیج دیا کہ دیکھے معاملہ کیا ہے؟ غرض قریش آگئے، ابو لہب بھی آگیا، اس کے بعد آپ نے فرمایا: تم لوگ یہ بتاؤ کہ اگر میں خبر دوں کہ اس پہاڑ کی پچھلی جانب سے ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم مجھے سچا مانو گے؟

---

1 الطبری، التاریخ الرسل والملوک، ج ۲، ص ۳۲۴۔ صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم، ص ۱۱۳

2 البخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ (واندر عشیرتک الاقربین) ابن سعد، طبقات الکبری، ج ۱، ص ۱۹۴

لوگوں نے کہا: ہاں!

((مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ إِلاَّ صِدْقًا))

''ہم نے ہمیشہ آپ کو سچا ہی پایا ہے۔''

آپ نے فرمایا: اچھا تو میں تمہیں سخت عذاب سے پہلے خبر دار کرنے کے لیے آیا ہوں۔ تو اس پر ابولہب آگ بگولہ ہو کر بولا: تو سارے دن غارت ہو، تو نے ہمیں اس لیے جمع کیا تھا؟ اس پر سورہ ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِيْ لَهَبٍ﴾ نازل ہوئی۔ ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ تباہ و برباد ہو۔ اس واقع کا ایک ٹکڑا امام مسلم نے اپنی صحیح میں ابوہریرہ کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے بطون قریش کو آواز لگائی یہ پکار عام بھی تھی اور خاص بھی تھی۔ آپ نے کہا اے جماعت! قریش اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ، اے بنی کعب! اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ۔ اے محمد کی بیٹی فاطمہ اپنے آپ کو جہنم سے بچا۔ کیونکہ میں تم لوگوں کو اللہ کے عذاب سے بچانے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا۔ البتہ تم لوگوں سے نسب و قرابت کے تعلقات ہیں جن کو میں باقی اور تروتازہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔

یہ آپ کی دعوت کا عمدہ ترین نمونہ ہے۔ عرب کے دستور اور سماجی روایت کے مطابق آپ نے مناسب موقعہ اور مناسب وقت کا انتخاب کیا اور بلند پہاڑی پر چڑھ کر بطون مکہ کی جانب رُخ کر کے زوردار آواز لگائی جب لوگ جمع ہو گئے تو پہلے اپنی ذات مقدسہ اور حیاتِ مبارکہ کی سچائی کی تصدیق مانگی جب عوام الناس کی جانب سے مہر تصدیق ثبت ہو گئی تو آپ نے فرمایا۔

اے قریش کے لوگو! لا الٰہ الا اللہ پڑھ لو اور کامیاب ہو جاؤ گے۔ فلاح پا جاؤ گے عرب و عجم کے مالک بن جاؤ گے۔ آپ فرماتے ہیں: میرے اور تمہارے نسب و قرابت کے تعلقات ہیں جن کو میں تروتازہ رکھنے کی کوشش کروں گا، یعنی میں دل و جان سے تمہارے ساتھ مخلص محبت رکھتا ہوں تم سے تعلقات توڑنا نہیں چاہتا ہوں لیکن تمھاری بھلائی کا طلب گار ہوں کہ تمہیں کہیں اللہ کا عذاب نہ پکڑ لے۔

اس صدائے حق کی گونج ابھی مکے کی اطراف میں سنائی ہی دے رہی تھی کہ اللہ تعالی کا ایک اور حکم نازل ہوا:

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [1]

---

[1] سورۃ الحجر ۱۵: ۹۴

"آپ کو جو حکم ملا ہے اسے کھول کر بیان کیجیے اور مشرکین سے رُخ پھیر لیجیے۔"

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کی خرافات واباطیل کا پردہ چاک کرنا اور بتوں کی حقیقت اور قدر و قیمت کو واشگاف کرنا شروع کر دیا۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق قریش کے چند بڑے بڑے سردار ابو طالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ اے ابو طالب تمہارے بھتیجے نے ہمارے بتوں کو گالیاں دیں ہیں اور ان کو برا بھلا کہتا ہے۔ ہماری عیب چینی کی ہے اور ہماری فکر کو گمراہ قرار دیا ہے اور ہمارے باپ دادا کو گمراہ قرار دیتا ہے۔ لہٰذا آپ انھیں اس بات سے روکیں یا پھر ہمارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جائیں ہم خود اس کا علاج کر لیں گے۔ ان کے مقابلے میں ابو طالب نے نرم بات کی اور رازدارانہ لہجہ اختیار کیا، چنانچہ وہ واپس چلے گئے اور نبی پاک اپنے کام پر لگے رہے۔[1]

قریش مکہ ظلم و ستم اور محاذ آرائی پر اُتر آئے لیکن ان کا ظلم اور تشدد صحابہ کرام کے مضبوط قدموں کو ہلا نہ سکا۔ مسلمان وقتی طور پر ان کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے پھر واپس آئے تو پہلے کی طرح ہی ستم کیے گئے پھر دوبارہ ہجرت کر گئے، جب اس سے بھی کام نہ بنا تو قریش دوبارہ جناب ابو طالب کو دھمکی لگاتے ہیں لیکن ان کی دھمکیاں بھی کسی کام نہیں آتی ہیں جناب ابو طالب ان کو لاجواب کر کے واپس لٹا دیتے ہیں اس کے بعد آپ کے قتل کا منصوبہ بناتے ہیں وہ بھی ناکام ہوتا ہے۔[2]

اسی دوران بڑے بڑے قبائل کے افراد مسلمان ہو جاتے ہیں، قریش خود نبی ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر مختلف لالچ دیتے ہیں لیکن آپ نے ان سب کو نامراد واپس لٹا دیا جس کے بعد وہ آپ کا سوشل بائیکاٹ کرتے ہیں۔ یہ بھی ناکام ہوتا ہے تو آخری بار پھر ابو طالب کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں لیکن آخری بار بھی مایوسی اور ناکامی ملتی ہے۔ مسلمان کفار کی ہر تدبیر کو اپنے مضبوط ایمان سے ناکام کرتے چلے جاتے ہیں اور کافر دن بدن مایوس اور ناامید ہوتے چلے گئے۔

5۔ بیرون مکہ دعوت: دعوت کا چوتھا مرحلہ

قبائل عرب پر دعوت پیش کرتے وقت آپ نے اپنی سیرت و کردار کو بطورِ دلیل و برہان پیش کیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ

[1] ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ا، ص ۲۰۲

[2] ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ا، ص ۲۰۳

فِيۡهِ فَرِيۡقٌ فِي الۡجَنَّةِ وَفَرِيۡقٌ فِي السَّعِيۡرِ ﴿﴾[1]

''اور اسی طرح ہم نے تیری طرف عربی قرآن وحی کیا، تاکہ تو بستیوں کے مرکز (مکہ) کو ڈرائے اور ان لوگوں کو بھی جو اس کے ارد گرد ہیں اور تو اکٹھا کرنے کے دن سے ڈرائے جس میں کوئی شک نہیں، ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ بھڑکتی ہوئی آگ میں۔''

''ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ ابو طالب کی وفات کے بعد رسول اللہ ﷺ کو قریش نے اس قدر شدید اذیتیں پہنچائیں کہ جن کے متعلق وہ ابو طالب کی زندگی میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ طائف میں ''ثقیف قبیلہ'' سے نصرت وحمایت کے حصول اور قریش کی ایذار سانی سے بچنے کے لیے ان کی طرف تشریف لے گئے اور ان سے اسلام قبول کرنے کے بھی امیدوار تھے۔

جب طائف پہنچے تو قبیلہ ثقیف کے تین سرداروں کے پاس تشریف لے گئے جو آپس میں بھائی بھائی تھے جن کے نام یہ تھے: عبد یالیل، مسعود اور حبیب ان کے والد کا نام عمرو بن عمیر ثقفی تھا۔ آپ نے ان کے پاس بیٹھنے کے بعد انھیں اللہ کی اطاعت اور اسلام کی مدد کی دعوت دی اور اپنی آمد کی وجہ بتائی کہ میں آپ سے اسلام کے معاملہ میں تعاون چاہتا ہوں، قریش کے مقابلہ میں آپ میری مدد کریں اور اس دعوت میں میرا ساتھ دیں اور لوگوں سے میرا تحفظ کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے طائف میں دس دن قیام فرمایا۔[2] اس دوران آپ ان کے ایک ایک سردار کے پاس گئے اور ہر ایک سے گفتگو کی لیکن سب کا ایک ہی جواب تھا کہ تم یہاں سے نکل جاؤ، بلکہ انھوں نے اپنے اوباشوں کو شہ دی، چنانچہ جب آپ نے واپسی کا قصد فرمایا تو یہ اوباش گالیاں دیتے مذاق اُڑاتے شور مچاتے ہوئے آپ کے پیچھے لگ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کتنا بڑا ازدحام آپ کے گرد جمع ہوگیا، گالم گلوچ کے ساتھ پھر پتھر برسنے بھی شروع ہوگئے، جس سے آپ کو اتنے زخم آئے کہ آپ کی ٹانگیں لہولہان ہو کر آپ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں، ادھر حضرت زید بن حارثہؓ ڈھال بن کر چلتے ہوئے پتھروں کو روک رہے تھے، جس سے ان کے سر میں بھی کئی چوٹیں آگئیں۔ بد معاشوں نے یہ سلسلہ مسلسل جاری رکھا، یہاں تک کہ آپ کو عتبہ اور شیبہ ابنائے ربیعہ کے ایک باغ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ باغ طائف سے تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

---

1 سورۃ الشوریٰ ۴۲: ۷

2 ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۲۱۲۔

یہاں تک یہ بھیڑ آپ کو دھکیل کر لے آئی جب آپ نے باغ میں پناہ لے لی تو تب یہ لوگ واپس چلے گئے۔ اور آپ ﷺ ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر انگور کی بیل کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ جب قدرے اطمینان ہوا۔ تو آپ نے اہل طائف کے لیے دعا فرمائی۔

اس واقعہ کی تفصیل حضرت عائشہؓ کی حدیث میں صحیح بخاری میں مذکور ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے ایک دن نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا آپ پر کوئی ایسا دن بھی آیا ہے جو اُحد کے دن سے زیادہ سنگین رہا ہو؟ آپ نے فرمایا: ہاں! تمھاری قوم سے جن جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان میں سب سے سنگین مصیبت وہ تھی جس میں میں گھاٹی کے دن دو چار ہوا۔ جس دن میں نے اپنی بات کو عبد یالیل کے سامنے بیان کیا۔ مگر اس نے میری بات نہ سنی میں غم والم میں نڈھال اپنے رُخ پر چل پڑا۔ اور مجھے قرن ثعالب پہنچ کر ہوش آیا۔ وہاں میں نے سر اُٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بادل کا ایک ٹکڑا مجھ پر سایہ فگن ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو اس میں جبریل علیہ اسلام تھے۔ انھوں نے مجھے پکار کر کہا: آپ کی قوم نے جو آپ کے ساتھ کیا اللہ نے اسے سن لیا ہے۔ اب اس نے آپ کے پاس پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے۔ آپ اسے جو بھی حکم دیں وہ کرے گا۔ اس کے بعد پہاڑوں کا فرشتہ مجھ سے مخاطب ہوا اس نے سلام عرض کیا اور مجھے کہا کہ بات یہی ہے آپ جو مجھے حکم دیتے ہیں میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر اپ چاہیں کہ میں انھیں کچل دوں تو ایسا ہی ہو گا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: نہیں مجھے امید ہے کہ ان کی نسل سے اللہ تعالیٰ ایسی مخلوق پیدا کرے گا جو ایک اللہ کی عبادت کرے گی۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے گی۔

وہاں سے فارغ ہونے کے بعد واپسی پر آپ نے وادئ نخلہ میں قیام فرمایا آپ کا یہ قیام چند دن کا تھا۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس جنوں کی ایک جماعت بھیجی جس کا ذکر قرآن مجید میں دو مرتبہ آیا ہے ایک بار سورہ احقاف میں اور دوسری مرتبہ سورہ جن میں۔ سورۂ احقاف کی آیات یہ ہیں:

﴿وَ اِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَ لَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ۲۹ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ۳۰ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾[1]

---

[1] سورۃ الاحقاف ۴۶: ۲۹، ۳۰، ۳۱

’’اور جب ہم نے جنات کے ایک گروہ کو آپ کی خدمت میں حاضر کیا جنھوں نے قرآن سنا، جب وہ وہاں (وادئ نخلہ) میں پہنچے انھوں نے کہا خاموش ہو جاؤ، جب وحی کا نزول (یا تلاوت) پوری ہو گئی تو وہ اپنی قوم کی طرف داعی بن کر لوٹ گئے۔ انھوں نے واپس جا کر کہا اے ہماری قوم بے شک ہم نے ایک ایسی کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، حق کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور صراطِ مستقیم بتاتی ہے۔ اے ہماری قوم تم بھی اس اللہ کے داعی (محمد ﷺ) کو مان لو، اور اس پر ایمان لے آؤ، وہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے بچا لے گا۔‘‘ سورۂ جن کی آیات یہ ہیں:

﴿قُلۡ اُوۡحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسۡتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الۡجِنِّ فَقَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا۞ يَّهۡدِيۡۤ اِلَى الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنۡ نُّشۡرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا﴾[1]

’’کہہ دو کہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے مجھ سے قرآن سنا ہے اور انھوں نے آپس میں کہا ہے کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے، جو ہدایت کی طرف راہنمائی کرتا ہے، ہم تو اس پر ایمان لے آئے اور ہرگز نہیں ہم اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرائیں گے۔‘‘

ان آیات کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ جنوں کی آمد بھی نصرت الٰہی تھی جو کہ آپ کے غم والم کو کم کرنے کے لیے اور آپ کو تسلی دینے کے لیے تھی۔

6۔ قبائل اور افراد کو اسلام کی دعوت

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی ﷺ طائف سے مکہ واپس تشریف لے آئے تو قریش پہلے سے بھی زیادہ آپ کے دشمن ہو گئے۔ اور بڑی تیزی کے ساتھ آپ کی مخالفت شروع کر دی، سوائے ان کمزور لوگوں کے جو آپ پر ایمان لا چکے تھے۔ ایام صبح میں آپ اپنے آپ کو قبائل عرب پر پیش کرتے۔ ان کو اللہ کی طرف بلاتے اور ان کو بتاتے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اور آپ انھیں کہتے کہ وہ اسلام قبول کر لیں اور آپ کی حفاظت و ضیافت کا بندوبست کریں تاکہ جس مقصد کے لیے آپ مبعوث ہوئے ہیں اس کو پورا کر سکیں، ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک ثقہ راوی نے زید بن اسلم دؤلی کو ابو الزناد نے بتایا۔[2]

---

1 سورۃ الجن ۷۲: ۱، ۲۔ السھیلی، الروض الأنف، ج ۴، ص ۳۲

2 السھیلی، الروض الأنف، ج ۴، ص ۳۲۔

حسن بن عبید اللہ بن عبید اللہ بیان کرتے ہیں کہ ان کو حضرت عبادؓ نے بتایا میں اس وقت جوان لڑکا تھا منیٰ میں اپنے باپ کے ساتھ کھڑا تھا، رسول اللہ ﷺ عرب قبائل کے ٹھکانوں پر جا کر فرماتے اے بنی فلاں میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اللہ کے علاوہ تمام بتوں کو چھوڑ دو اور مجھ پر ایمان لاؤ اور میری تصدیق کرو اور تم میری حفاظت کرو تاکہ میں اللہ کا پیغام پہنچا سکوں جو اس نے مجھے دے کر مبعوث کیا ہے۔[1]

آپ جہاں بھی تبلیغ کے لیے جاتے پیچھے پیچھے ابو لہب ہوتا تھا آپ اپنی بات سنا کے آجاتے تو لوگوں کو آپ کے بارے میں بد ظن کرتا اور کہتا کہ یہ شخص ہمیں لات و عزیٰ سے ہٹانے کی بات کرتا ہے یہ گمراہ ہے آبائی دین کا منکر ہے اے لوگو! تم ہر گز اس کی بات نہ ماننا۔ حضرت عباد کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے خوبصورت آنکھوں اور زلفوں والا عدنی لباس پہنے ہوئے جو آپ کی بات کی نفی کرتا ہے تو انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ آپ کا چچا ابو لہب ہے۔ حافظ ابو بکر بیہقی نے بھی یہ روایت محمد بن عبد اللہ انصاری الدولی سے ذی المجاز کے میلے کے متعلق بیان کی ہے کہ جب آپ ذی المجاز کے میلے میں لوگوں کو تبلیغ کرتے تو ابو لہب آپ کی دعوت کی تردید کرتا تھا۔ باوجود اتنی مخالفت کے اور دشمن کے آپ ﷺ نے ایک دن کے لیے بھی دعوت کے کام کو موقوف نہیں کیا بلکہ ہر روز نئے جذبے اور نئی امید کے ساتھ اپنے کام کو ترتیب دیا۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نے ترمذی کے حوالے سے امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے جس میں امام زہری فرماتے ہیں کہ سفر طائف سے واپسی پر مختلف اوقات میں جن کو آپ نے اسلام کی دعوت دی ان میں مندرجہ ذیل ہیں:

بنو عامر بن صَعْصَعَہ، مہارب بن خَصْفَہ، فزارہ، غسّان، مرہ، حنیفہ، سُلیم، عبس، بنو نصر، بنوا لبکا، کلب، حارث بن کعب، عذرہ، حضارمہ یہ چودہ قبائل بنتے ہیں جن کے پاس آپ دعوت لے کر حاضر ہوئے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اسلام قبول نہیں کیا۔ نبی ﷺ کی یہ دعوت نبوت کے چوتھے سال سے لے کر ہجرت کے آخری سال تک آخری موسم حج تک تھی، جس کی مدت تقریباً دس سال بنتی ہے۔[2]

آپ نے ان قبائل کو دعوت دینے میں انتہائی شفقت ہمدردی اور خلوص کا مظاہرہ کیا آپ نے کسی کے ساتھ بھی الجھاؤ اور

---

1 السھیلی، روض الانف، ج ۴، ص ۳۳

2 صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم: ۱۸۷، ۱۸۸

ترشی کی بات نہیں کی لوگوں کے دعوت کورد کردینے کے نتیجے میں آپ نے کسی کو بددعا نہیں دی کسی کے بارے میں سخت لفظ استعمال نہیں کیا، اپنے عمل سے مایوسی اور نااُمیدی کا اظہار تک نہیں ہونے دیا جو کہ ایک حقیقی داعی کی صفات ہوتی ہیں۔

قبیلہ بنو کلب کو دعوت اسلام

نبی ﷺ اس قبیلے کی ایک شاخ بنو عبداللہ کے پاس تشریف لے گئے، انھیں اللہ کی طرف بلایا اور اپنے آپ کو ان پر پیش کیا دوران گفتگو آپ نے یہ بھی فرمایا اے بنو عبداللہ، اللہ تعالیٰ نے تمہارے باپ جداعلیٰ کا نام بہت خوبصورت اور اچھا رکھا۔ لیکن ان لوگوں نے آپ کی دعوت قبول نہ کی۔[1]

کندہ قبیلہ کو تبلیغ

ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ آپ کندہ قبیلہ کے پاس تشریف لے گئے اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کیا ان کو اسلام کی دعوت دی لیکن انھوں نے آپ کی دعوت کو قبول نہ کیا۔

بنو حنیفہ میں تبلیغ اسلام

ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ مجھے کسی نے عبداللہ بن کعب کے حوالے سے بیان کیا کہ نبی ﷺ بنی حنیفہ کے پاس ان کے ڈیروں پر گئے ان کو دین اسلام کی دعوت دی اور اپنی ذاتِ گرامی کو بھی اس کام کے لیے پیش کیا انھوں نے دعوت بھی قبول نہ کی اور سب سے زیادہ تلخ جواب بھی دیا۔[2]

بنو عامر میں تبلیغ اسلام

ابن اسحاق امام زہری کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عامر بن صَعْصَعَہ کے پاس تشریف لے گئے ان کو اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا اور اپنی ذاتِ گرامی کو بھی پیش کیا تو بحیرہ بن فراس عامری نے کہا: واللہ! اگر میں اس قریشی کو اپنے ہاتھ میں کرلوں تو سارا عرب تسخیر کرلوں۔ پھر اس نے کہا بتایئے! اگر ہم آپ ﷺ کے تابع ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ مخالفین پر غالب کردے تو آپ ﷺ کے بعد حکومت ہماری ہو گی؟ آپ نے فرمایا حکومت تو اللہ کی ہے۔ جس کو چاہے

1 السہیلی، الروض الاُنف، ج ۴، ص ۳۵

2 السہیلی، الروض الاُنف، ج ۴، ص ۳۵

عطاء کر دے۔ تو اس نے کہا: کیا ہم اپنا سینہ عرب کے سامنے نشانہ اور آماجگاہ بنائیں اور جب اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب کر دے تو حکومت غیروں کے ہاتھ آئے ہم کو آپ کی دعوت سے کوئی غرض نہیں انھوں نے آپ کو جواب دے دیا۔ لیکن جب بنی عامر حج کے بعد اپنے ایک عمر رسیدہ بزرگ کے پاس گئے جو کبر سنی کی وجہ سے حج پر نہ جا سکا تھا اس کو انھوں نے یہ واقعہ سنایا کیونکہ ان کا دستور تھا کہ جب وہ حج سے واپس جاتے تو حج کی روئیداد جا کر بیان کرتے جیسے آج کل ہمارے بھی یہاں ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حج کے موقعہ پر ہمارے پاس ایک قریش مطلبی نوجوان آیا جو اپنے آپ کو نبی کہتا تھا، اس نے یہ پیشکش کی کہ ہم اس کی حفاظت کریں اور اس کے ساتھ تعاون کریں اور اپنے علاقے میں لے چلیں یہ سن کر اس بوڑھے نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اے بنی عامر! کیا اس کی تلافی ہو سکتی ہے؟ خدا کی قسم کسی اسماعیلی نے اس طرح کی بات کبھی نہیں کی، بے شک وہ بہتر اور سچا ہے تمھاری عقل کہاں کھو گئی؟[1]

آپ ﷺ کی تبلیغ کا یہ اسلوب تھا کہ آپ کسی پر اپنی بات کو ٹھونستے نہیں تھے بلکہ قبیلے کے سردار کو ملتے اپنی بات سناتے اپنی حفاظت کے لیے تعاون مانگتے اپنے علاقے میں لے جانے کو کہتے تاکہ آپ اپنی بات لوگوں تک پہنچا سکیں۔

7۔ بیرونِ مکہ اسلامی دعوت کی کامیابی

جس طرح رسول اللہ ﷺ نے موسم حج میں اور اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً دیگر اوقات میں قبائل اور وفود پر اسلام پیش کیا اسی طرح افراد اور اشخاص کو بھی دعوت دی اور ان میں سے بعض نے اچھا اور تسلی بخش جواب بھی دیا اور اس دعوت میں اپنی رغبت اور پسندیدگی بھی ظاہر کی اور اس کے بعد جلد ہی اسلام قبول بھی کر لیا ان میں سے کچھ روداد پیش کی جاتی ہے۔

حضرت سوید بن صامتؓ

یہ شاعر تھے گہری سوجھ بوجھ کے حامل تھے۔ یثرب کے لوگ ان کی پختگی شعر گوئی حسب ونسب کی وجہ سے ان کی قوم نے ان کو "کامل" کا خطاب دیا ہوا تھا۔ یہ حج یا عمرہ کے لیے مکہ تشریف لائے رسول اللہ ﷺ نے انھیں اسلام کی دعوت دی۔ کہنے لگے:

"غالباً آپ ﷺ کے پاس جو کچھ ہے وہ ایسا ہی ہے جو کچھ میرے پاس ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تمہارے

---

1 الطبری، التاریخ الرسل والملوک، ج ۲، ص ۳۵۳۔ صفی الرحمن، الرحیق المختوم، ص ۱۸۸

پاس کیا ہے؟'' سوید نے کہا:

''حکمت لقمان۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''پیش کرو۔'' انھوں نے پیش کیا، آپ ﷺ نے فرمایا:

''یقیناً یہ کلام اچھا ہے۔'' لیکن میرے پاس جو ہے وہ اس سے بھی اچھا ہے، وہ قرآن ہے جو مجھ پر اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ ''وہ ہدایت اور نور ہے۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کو قرآن پڑھ کر سنایا اور اسلام کی دعوت دی۔[1] انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور وہ بولے:

''یہ تو بہت ہی اچھا کلام ہے۔'' اس کے بعد وہ مدینہ پلٹ کر آئے ہی تھے کہ جنگ بعاث چھڑ گئی اور اس میں قتل کر دیے گئے۔ انھوں نے نبوت کے گیارھویں سال اسلام قبول کیا تھا۔''[2]

ایاس بن معاذ

یہ بھی یثرب کے باشندے تھے اور نوخیز جوان تھے۔ نبوت میں جنگ بعاث سے کچھ پہلے اوس کا ایک وفد خزرج کے خلاف قریش سے مدد و تعاون کی تلاش میں مکہ آیا تھا۔ ایاس بھی اسی وفد کے ساتھ مکہ آئے تھے۔ اس وقت ان دونوں قبیلوں کے درمیان نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اور اوس کی تعداد خزرج سے کم تھی رسول اللہ ﷺ کو وفد کی آمد کا علم ہوا تو آپ ان کے پاس تشریف لے گئے۔ اور ان کے درمیان بیٹھ کر یوں خطاب فرمایا:

''آپ لوگ جس مقصد کے لیے تشریف لائے ہیں، کیا آپ اس سے بہتر چیز قبول کر سکتے ہیں؟ ان سب نے کہا وہ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا:

''میں اللہ کا رسول ہوں۔'' اللہ نے مجھے اپنے بندوں کے پاس یہ دعوت دینے کے لیے بھیجا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اللہ نے مجھ پر کتاب بھی اُتاری ہے۔'' پھر آپ نے اسلام کا ذکر کیا اور قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔

ایاس بن معاذ بولے خدا کی قسم! اے قوم! یہ چیز اس چیز سے بہتر ہے جس کے لیے تم یہاں آئے ہو۔'' لیکن وفد کے

---

1 تاریخ اسلام، نجیب آبادی، ج ۱ ص ۱۲۵

2 الطبری، تاریخ الرسل والملوک، ج ۴، ص ۳۵۳۔

ایک رکن ابوالجسر انس بن رافع نے ایک مٹھی مٹی اُٹھا کر ایاس کے منہ پر دے ماری اور بولا:

"یہ بات چھوڑو۔ میری عمر کی قسم! یہاں ہم اس مقصد کی بجائے دوسرے ہی مقصد کے لیے آئے ہیں۔"

ایاس نے خاموشی اختیار کر لی اور رسول اللہ ﷺ بھی اُٹھ گئے۔ وفد قریش کے ساتھ معاہدہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور یوں ہی مدینہ ناکام واپس ہو گیا۔

مدینہ پلٹنے کے بعد ایاس تھوڑی دیر بعد انتقال کر گئے۔ وہ اپنی وفات کے وقت تہلیل و تکبیر اور تسبیح کر رہے تھے۔ اس لیے لوگوں کو یقین ہے کہ ان کی وفات اسلام پر ہوئی۔[1]

ابوذر غفاری

یہ یثرب کی طراف میں رہائش پذیر تھے۔ جب سوید بن صامت اور ایاس بن معاذ کے ذریعے یثرب میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی خبر پہنچی تو حضرت ابوذر کے کان سے بھی ٹکرائی اور یہی ان کے اسلام لانے کا سبب بنی۔

ان کے اسلام لانے کا واقعہ صحیح بخاری میں تفصیلاً موجود ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ ابوذر نے فرمایا: میں قبیلہ غفار کا ایک آدمی تھا، مجھے معلوم ہوا کہ مکے میں ایک آدمی نمودار ہوا ہے جو اپنے آپ کو نبی کہتا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے کہا: تم اس آدمی کے پاس جاؤں۔ اس سے بات کرو اور مجھے واپس آکر اس کے متعلق بتاؤ۔ وہ گیا اور ملاقات کی اور واپس آیا، پوچھا کیا خبر لائے ہو؟ بولا: خدا کی قسم ایسا آدمی دیکھا ہے جو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے۔ میں نے کہا تم نے تسلی بخش خبر نہیں دی۔ آخر میں نے خود توشہ دان اور اپنا ڈنڈا اُٹھایا اور مکہ کی راہ لی۔ وہاں پہنچ تو گیا لیکن اپ کو پہچانتا نہ تھا۔ اور یہ بھی گوارہ نہ تھا کہ آپ ﷺ کے متعلق کسی سے پوچھوں چنانچہ میں زم زم کا پانی پیتا اور مسجد احرام میں پڑا رہتا۔ آخر میرے پاس سے علیؓ کا گزر ہوا۔ کہنے لگے آدمی اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے کہا: جی ہاں! تو انھوں نے کہا تو اچھا پھر گھر چلو۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ نہ وہ مجھ سے کچھ پوچھ رہے تھے نہ میں ان سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ ہم دونوں کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔[2]

---

1 الطبری، تاریخ الرسل والملوک، ج ۲، ص ۳۵۴

2 البخاری، باب بنیان الکعبۃ، باب اسلام ابی ذرؓ۔ البیہقی، ابو بکر احمد بن حسین، الخراسانی (م ۴۵۸ھ)، الدلائل النبوۃ، ن، دار الکتب علمیہ، دار الریان للتراث، ج ۲ ص ۲۰۸۔ ابن اثیر، اسد الغابہ۔ حرف، الف، ابن عبد البر، الاستعاب فی معرفۃ الاصحاب، حرف، الف۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ج ۳، ص ۳۴۔

صبح ہوئی تو میں پھر اس ارادے سے مسجد حرام گیا کہ آپ کے متعلق دریافت کروں۔ لیکن کوئی نہ تھا جو مجھے آپ کے متعلق بتاتا، آخر میرے پاس سے پھر حضرت علی کا گزر ہوا۔ دیکھ کر بولے: اس آدمی کو ابھی تک اپنا ٹھکانہ معلوم نہ ہو سکا؟ میں نے کہا: نہیں۔ اور تم اس شہر میں کیوں آئے ہو؟ میں نے کہ اگر آپ ﷺ رازداری سے کام لیں تو بتاؤں؟ انھوں نے کہا: ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔ میں نے کہا مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں ایک ایسا آدمی نمودار ہوا ہے جو اپنے اپ کو اللہ کا نبی بتاتا ہے۔ میں نے اپنے بھائی کو بھیجا تھا لیکن اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا اس لیے میں نے سوچا کہ خود ملاقات کر لیتا ہوں۔ حضرت علی نے کہا بھائی تم صحیح جگہ پہنچے ہو۔ دیکھو میرا رُخ انھیں کی طرف ہے۔ دیکھو جہاں میں گھسوں وہاں تم نے بھی گھس جانا۔ اگر میں کسی ایسے شخص کو دیکھوں جس سے تمہارے لیے خطرہ ہے تو دیوار کی طرف اس طرح جا رہوں گا گویا اپنا جوتا ٹھیک کر رہا ہوں۔ لیکن تم راستے پر چلتے رہنا۔ اس کے بعد حضرت علی چل پڑے اور میں بھی آپ کے ساتھ چل پڑا یہاں تک کہ وہ نبی پاک ﷺ کے پاس داخل ہوئے اور میں بھی ان کے ساتھ داخل ہو گیا۔ میں نے آپ ﷺ سے عرض کی کہ آپ ﷺ مجھ پر اسلام پیش کریں، آپ ﷺ نے اسلام پیش کیا اور میں مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! اس معاملے کو ابھی پس پردہ رکھو اور اپنے علاقے میں واپس چلے جاؤ۔ جب ہمارے ظہور کی خبر ملے تو آ جانا۔ میں نے کہا اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق دے کر معبوث فرمایا ہے۔ میں تو بانگ دہل ان میں اس کا اعلان کروں گا۔ اس کے بعد میں مسجد حرام آیا اور میں نے کہا: اے قریش کے لوگو!

((أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ))

”میں گواہی دیتا ہوں کے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔“

لوگوں نے کہا اُٹھو اور اس بے دین کی خبر لو۔ لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے اس قدر مارا کہ میں مرنے والا ہو گیا۔ لیکن ابن عباس نے مجھے آ کر بچایا۔ انھوں نے مجھے جھک کر دیکھا اور پھر قریش کی طرف پلٹ کر بولے: ”تمھاری بربادی ہو تم غفار کے ایک فرد کو مار رہے ہو؟ حالانکہ تمھاری تجارت کا راستہ بنی غفار سے گزرتا ہے۔ اس پر لوگ مجھے چھوڑ کر ہٹ گئے۔ دوسرے دن صبح ہوئی تو میں پھر وہاں گیا اور جو کچھ کل کہا تھا پھر وہی کہا۔ پھر میرے ساتھ وہی کچھ ہوا جو کل ہوا تھا۔ اور پھر مجھے حضرت ابن عباس نے آ کر چھڑایا اور مجھ پر جھک گئے۔ اور وہی بات کہی جو کل کہی تھی۔[1]

---

1 البخاری، باب بنیان الکعبۃ، باب اسلام ابی ذرؓ

طفیل بن عمرو دوسی

یہ ایک شریف اور عقل مند، دانا آدمی تھے قبیلہ دوس کے سردار تھے۔ ان کے کچھ لوگ یمن کے نواح میں آباد تھے، یہ نبوت کے گیارھویں سال مکہ تشریف لائے وہاں پہنچنے پر مکے والوں نے ان کا زبردست استقبال کیا اور نہایت عزت و احترام سے پیش آئے۔ پھر آپ سے عرض پرداز ہوئے کہ اے طفیل تم مکہ شہر میں تشریف لائے ہو تو ہم تمہیں اس آدمی سے خبردار کرتے ہیں جو ہمارے درمیان ہے جس نے ہمارا خاندانی شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا ہے اور خاندانوں میں فساد ڈال دیا ہے ہمیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں اپ اس کے دامن فریب میں نہ آجانا، کہیں ایسا نہ ہو کہ جو آفت ہمیں دامن گیر ہے وہی آپ کو بھی دامن گیر ہو جائے۔ آپ نے ہرگز اس کی بات نہیں سننا۔ اور نہ ہی اس کے قریب جانا۔

حضرت طفیل کا ارشاد ہے کہ یہ لوگ مجھے برابر یہی تلقین کرتے رہے جس کی وجہ سے میں نے تہیہ کرلیا کہ میں نے اس کی بات بالکل نہیں سننی ہے۔ میں جب صبح مسجد حرام میں گیا تو اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی۔ تاکہ آپ کی آواز میرے کانوں میں نہ پڑے لیکن اس کے باوجود بھی کچھ آوازیں میرے کانوں میں پڑ گئیں۔ جو مجھے بہت پسند آئیں میں نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے بہت اچھا کلام سنا ہے۔ پھر میں نے اپنے جی میں کہا مجھ پر میری ماں کی آہ و بقا۔ میں تو ایک سوجھ بُوجھ رکھنے والا شاعر آدمی ہوں، اچھائی برائی میں میں تمیز کر سکتا ہوں پھر کیوں نہ میں اس شخص کی بات سنوں۔ اگر اچھی لگی تو قبول کرلوں گا اگر اچھی نہ لگی تو چھوڑ دوں گا۔ یہ سوچ کر میں رُک گیا۔ جب آپ اپنے گھر کو پلٹے تو میں بھی آپ کے پیچھے ہو گیا۔ آپ اندر داخل ہوئے تو میں بھی اندر داخل ہو گیا۔ اور آپ کو اپنی آمد کا واقعہ اور لوگوں کے خوف دلانے کی کیفیت اور پھر کان میں روئی ٹھونسنے کی اور اس کے باجود آپ کی باتیں سن لینے کی تفصیلات آپ کو بتائیں پھر عرض کیا کہ آپ اپنی بات پیش کیجیے۔

آپ نے مجھ پر اسلام پیش کیا اور قرآن مجید کی تلاوت سنائی۔ اللہ گواہ ہے میں نے اس سے عمدہ قول اور اس سے زیادہ انصاف کی بات کبھی نہ سنی تھی چنانچہ میں نے وہیں اسلام قبول کرلیا اور حق کی شہادت دے دی۔ اس کے بعد اپ نے عرض کیا کہ میری قوم میں میری بات مانی جاتی ہے میں ان کے پاس پلٹ کر جاؤں گا اور انھیں اسلام کی دعوت دوں گا[1]

---

1 ابن اثیر، ابوالحسن، علی بن محمد بن عبد الکریم الشیبانی، (م ۶۳۰ھ) اسد الغابۃ، احیاء التراث العربی بیروت، لبنان، حرف، طا، ج ا، ص ۳۳۔ ابن عبد البر، الاستعاب فی معرفۃ الاصحاب، حرف، طا، ج ا، ص ۲۲۸۔ ابن حجر، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، الاصابۃ فی تمیز صحابہ، ن دار جیل، بیروت، حرف الطاء۔

ضماد ازدی

یہ یمن کے باشندے اور قبیلہ ازد کے فرد تھے جھاڑ پھونک کرنا آسیب اتارنا ان کا کام تھا مکہ آئے تو وہاں کے احمقوں سے سنا کہ محمد پاگل ہیں سوچا کہ کیوں نہ اس کے پاس چلا جاؤں ہو سکتا ہے کہ اللہ میرے ہاتھوں اُسے شفا دے دیں۔ چنانچہ میں آپ کے پاس گیا اور کہا کہ اے محمد! میں آسیب اُتارنے کے لیے جھاڑ پھونک کرتا ہوں کیا آپ کو بھی اس کی ضرورت ہے ؟آپ نے جواب میں فرمایا:

إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ، نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ، مَنْ يَهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَمَّا بَعْدُ!![1]

ضماد نے کہا ذرا مجھے اپنے کلمات دوبارہ سنا دیجیے۔ آپ ﷺ نے تین بار دہرایا اس کے بعد ضماد نے کہا میں کاہنوں، جادو گروں اور شاعروں کی بات سن چکا ہوں لیکن میں نے اس جیسا کلام نہیں سنا یہ تو سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کو پہنچا ہوا ہے لائیے اپنا ہاتھ آگے کیجیے میں بیعت کرتا ہوں اس کے بعد انھوں نے اپ کی بیعت کر لی اور اسلام قبول کر کے مسلمان ہو گئے۔

یثرب کے چھ سعادت مندوں کا قبول اسلام

اعلان نبوت کے گیارھویں سال حج کے موسم میں آپ حضرت ابو بکر اور حضرت علیؓ کو لے کر باہر نکلے بنو ذیل اور بنو شعبان بن ثعلبہ کے ڈیروں سے گزرے تو ان سے اسلام کے بارے میں گفتگو کی انھوں نے جواب تو بڑا پُر امید دیا لیکن اسلام قبول کرنے کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ کیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ منیٰ کی گھاٹی سے گزرے تو کچھ لوگوں کو باہم گفتگو کرتے ہوئے سنا آپ نے سیدھے ان کا رُخ کیا اور ان کے پاس جا پہنچے۔ یہ یثرب کے چھ جوان تھے اور سب کے سب قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اہل یثرب کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اپنے حلیف یہود مدینہ سے سنا کرتے تھے کہ اس زمانے میں ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے اور اب جلد ہی وہ ظاہر ہو گا، ہم اس کی پیروی کر کے اس کی نگرانی میں تمہیں عادِ ارم کی طرح قتل کر ڈالیں گے۔[2]

---

1 ابن اثیر، اسد الغابۃ، حرف، الضاد۔ البیہقی، الدلائل نبوۃ، ج ۲ ص ۲۲۳۔ ابن عبد البر، الاستعاب فی معرفۃ الاصحاب، حرف، الضاد

2 الطبری، التاریخ الرسل والملوک، ج ۲، ۳۵۵

رسول اللہ ﷺ نے ان کے پاس پہنچ کر دریافت کیا کہ آپ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا ہم قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا یعنی یہود کے حلیف؟ بولے ہاں، فرمایا پھر کیوں نہ آپ حضرات بیٹھیں کچھ بات چیت کی جائے وہ لوگ بیٹھ گئے آپ نے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی۔ انھیں اللہ کی طرف دعوت دی اور قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔ انھوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا بھئی دیکھو! یہ تو وہی نبی معلوم ہوتے ہیں، جن کا حوالہ دے کر یہود تمہیں دھمکیاں دیا کرتے تھے۔ لہٰذا یہود تم پر سبقت نہ لے جائیں اس کے بعد فوراً انھوں نے آپ کی دعوت قبول کر لی۔

اس کے بعد جب یہ لوگ مدینہ واپس ہوئے تو اپنے ساتھ اسلام کا پیغام بھی لے گئے، چنانچہ ان کے ذریعے گھر گھر رسول اللہ ﷺ کا چرچا پھیل گیا اور آپ کے متعلق دلچسپی بڑھتی چلی گئی اور لوگ دن بدن آپ کی شخصیت و کردار کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔[1] اگلے سال جب موسم حج آیا تو بارہ آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان لوگوں نے منیٰ کے پاس عقبہ کی گھاٹی میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور آپ کے ہاتھ پر چند باتوں پر بیعت کی۔

حضرت عبادہ بن صامت بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ:

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروگے۔ چوری نہ کروگے۔ زنا نہ کروگے۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کروگے۔ کسی پر کوئی الزام نہ لگاؤ گے۔ کسی نیکی کی بات پر میری نافرمانی نہ کروگے۔ جو شخص یہ ساری باتیں پوری کرے گا اس کا اجر اللہ پر ہے۔ اگر کوئی ان چیزوں کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کو اس کی سزا دنیا میں ہی دے دی جائے گی جو اس کے لیے کفارہ ہوگی، اگر اللہ نے کسی کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے چاہے تو سزا دے چاہے تو معاف کر دے۔ عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ ہم نے ان باتوں پر رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی۔[2]

اس بیعت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مدینہ والوں کی فرمائش پر حضرت مصعب بن عمیرؓ کو اپنی طرف داعی بنا کر مدینہ کی طرف جانے کا حکم صادر فرمایا۔ حکم نبوی کے مطابق حضرت مصعب بن عمیر مدینہ طیبہ پہنچ کر حضرت اسعد بن زرارہ کے گھر نازل ہوئے اور اسی کو اپنا مسکن بنایا" اور بغیر کسی تاخیر کے جوش و خروش کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ حضرت مصعب کی دعوتی کاوشوں سے مدینے میں انصار کا کوئی گھر بھی ایسا نہیں بچا تھا جس میں لوگ مسلمان نہ ہوں۔

---

1 ابن ہشام: ا، ۴۲۸

2 بخاری، باب بعد باب حلاوۃ الایمان، باب اذا جاءک المؤمنات، باب الحدود

8۔دعوت نبوی: مدنی دور و مرحلہ

ہجرت کے بعد مدینہ میں آ کر نبی ﷺ کی شخصی اور دعوتی سرگرمیوں میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینے کے حالات مکے کے حالات سے قطعی طور پر مختلف تھے۔مکے میں اگرچہ مسلمانوں کا کلمہ ایک تھا اور ان کے مقاصد بھی ایک تھے۔مگر وہ خود مختلف گھرانوں میں بکھرے ہوئے تھے۔مجبور و مقہور اور کمزور تھے۔ان کے ہاتھوں میں کسی طرح کا بھی کوئی اختیار نہ تھا۔تمام تر اختیارات قریش مکہ اور دشمنانِ دین کے ہاتھوں میں تھے اور دنیا کا کوئی بھی انسانی معاشرہ جن اجزاء اور لوازمات سے قائم ہوتا ہے۔مکہ کے مسلمانوں کے پاس وہ اجزاء سرے سے تھے ہی نہیں کہ ان کی بنیاد پر کسی نئے اسلامی معاشرے کی تشکیل کر سکیں۔اس لیے یہ چیز دیکھنے میں آ رہی ہے کہ مکی سورتوں میں صرف اسلامی مبادیات کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور صرف ایسے احکامات نازل کیے گئے ہیں جن پر ہر آدمی تنہا عمل کر سکتا ہے۔اس کے علاوہ نیکی بھلائی اور مکارم اخلاق کی ترغیب دی گئی ہے۔اور رذیل و ذلیل کاموں سے بچنے کی ترغیب دی گئی ہے اور ان سے منع کیا گیا ہے۔

"اس کے برعکس مدینے میں مسلمانوں کی زمام کار پہلے دن سے ہی مسلمانوں کے اپنے ہاتھوں میں تھی ان پر کسی دوسرے کا تسلط نہ تھا۔اس لیے اب وقت آ گیا تھا کہ مسلمان تہذیب و عمرانیات، معاشیات و اقتصادیات، سیاست و حکومت صلح اور جنگ کے مسائل کا سامنا کریں اور ان کے لیے حلال و حرام اور عبادات و اخلاق وغیرہ جیسے مسائل زندگی کی بھرپور تنقیح اور وضاحت کی جائے۔" آزاد ماحول میں رہ کر اپنے مذہب اور تہذیب و ثقافت کے مطابق اپنی زندگیاں گزار سکیں۔اور دنیا کے اندر ایک آئیڈیل اسلامی معاشرے کا عملی تصور پیش کر سکیں۔جو کہ رہتی دنیا تک آنے والے انسانوں کے لیے ایک ماڈل اور نمونہ بن سکے اور انسان اس سے روشنی حاصل کر سکیں۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری فرماتے ہیں: "اب وقت آ گیا تھا کہ مسلمان ایک نیا معاشرہ یعنی اسلامی معاشرہ تشکیل دیں جو زندگی کے تمام مرحلوں میں جاہلی معاشرے سے مختلف اور عالم انسانی کے اندر موجود کسی بھی دوسرے معاشرے سے ممتاز ہو اور اس دعوتِ اسلامی کا نمائندہ ہو جس کی راہ میں مسلمانوں نے تیرہ سال تک طرح طرح کی مصیبتیں اور مشقتیں برداشت کی تھیں۔"[1]

---

1 صفی الرحمٰن، مولانا، مبارک پوری، الرحیق المختوم، ن، المکتبۃ السّلفیہ، لاہور، ط اکتوبر ۱۹۹۵ء، ص ۲۴۵

ظاہر ہے کہ اس طرح کے کسی معاشرے کی تشکیل ایک دن ایک مہینہ یا ایک سال میں نہیں ہو سکتی تھی بلکہ اس کے لیے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے تاکہ اس میں آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ احکام صادر کیے جائیں۔ اور قانون سازی کا کام ایک منظم و تربیت کے ساتھ مکمل کیا جائے۔

اب جہاں تک احکام و قوانین کے صادر اور فراہم کرنے کا معاملہ ہے تو اللہ تعالیٰ خود اس کا کفیل ہے اور جہاں تک ان احکام کے نفاذ اور مسلمانوں کی تربیت اور راہنمائی کا معاملہ ہے تو اس پر رسول اللہ ﷺ مامور تھے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ) [1]

”وہ ذات جس نے اَن پڑھوں میں رسول مبعوث فرمایا جو کہ انھیں میں سے ہے، جو ان پر اس کی آیات پڑھتا ہے اور ان کا تزکیۂ نفس کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی پر میں تھے۔“

ادھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ حالت تھی کہ وہ ہمہ وقت آپ کی طرف متوجہ رہتے اور جو بھی حکم صادر ہوتا، اس سے اپنے آپ کو آراستہ کر کے خوشی محسوس کرتے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا﴾ [2]

”جب ان پر اس کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔“

یہی سب سے عظیم مسئلہ تھا جو رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں کے تعلق سے درپیش تھا اور دعوت اسلامیہ اور رسالت محمدیہ ﷺ کا مطلوب و مقصود بھی یہی تھا کہ اس دعوت کے نتیجے میں ایک صالح معاشرہ وجود میں آئے۔ جس کی فضاؤں اور زیر نگرانی لوگ آزادی سے ایک اللہ کی بندگی اور عبادت کر سکیں۔

مدینہ میں مخصوص مقاصد کے تحت دعوتی اسلوب اور ترجیحات میں تبدیلی

مسلمانوں اور نبی ﷺ کی ہجرت کا مقصد صرف مصائب و آلام سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی نہ تھا، بلکہ اس کا ایک عظیم اور

---

[1] سورۃ الجمعہ ۶۲ : ۲

[2] سورۃ الانفال ۸ : ۲

بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ ایک پر امن علاقے کے اندر ایک نئے معاشرے کی تشکیل کے لیے تعاون کیا جائے۔ اسی لیے ہر صاحب استطاعت مسلمان پر فرض قرار پایا تھا کہ اس وطن جدید کی تعمیر میں حصہ لے کر اس کی پختگی، حفاظت، رفعت شان، تعمیر و ترقی میں اپنی کوشش صرف کرے اور یہ کوشش ہر طریقے سے کی جائے، تاکہ مسلمانوں کو اپنی ایک آزاد ریاست کے قیام کا جو موقع ملا ہے اس سے بھرپور فائدہ اُٹھایا جائے اور ایک آئیڈیل اور صالح معاشرہ تشکیل دیا جا سکے۔

یہ بات تو قطعی طور پر معلوم اور ثابت شدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہی اس معاشرے کی تشکیل کے امام، قائد اور رہنما تھے اور کسی نزاع کے بغیر سارے معاملات کی باگ ڈور آپ ﷺ ہی کے ہاتھ میں تھی۔

ہجرت سے قبل مدینے میں تین قسم کی اقوام آباد تھیں جن سے رسول اللہ ﷺ کو سابقہ تھا اور یہ تین اقوام ہیں ہی ایک دوسرے سے مختلف تھیں اور ان میں سے ہر قوم کے اپنے اپنے مسائل اور حالات تھے۔ یہ تینوں اقوام حسب ذیل تھیں:

۱۔ مسلمان صحابہ کرام کی پاک اور ممتاز جماعت۔

۲۔ مدینے کے قدیم اور اصلی قبائل جو مشرکین بھی تھے۔

۳۔ یہود[1]

نبی ﷺ نے بوقت ہجرت ۱۲ ربیع الاول بروز جمعۃ المبارک سن ۱ھ بمطابق ۲۷ ستمبر ۶۲۲ء کو حضرت ابو ایوب انصاری کے گھر کے سامنے نزول فرمایا اور ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ ''ان شاء اللہ اب یہی منزل ہو گی۔'' پھر اس کے بعد آپ حضرت ایوب انصاریؓ کے گھر منتقل ہو گئے۔[2]

یہاں قیام پذیر ہونے کے بعد بغیر کسی تاخیر کے آپ نے مہاجرین کے مسائل کے حل کے لیے مدینہ والوں کے ساتھ معاہدۂ اخوت طے کروایا۔ جب مسلمانوں کی معاشی اور اقتصادی فکر سے فارغ ہوئے تو فوراً دیگر قبائل کے ساتھ معاہدے کیے جو امن و سلامتی پر مشتمل تھے۔ تاکہ آپ اندرونی اور بیرونی سازشوں سے محفوظ رہ کر دعوت کے کام پر پوری توجہ دے سکیں اور اپنے مقاصد نبوت کی تکمیل کر سکیں۔ لیکن مشرکین مکہ کو جب آپ کی ان کامیابیوں کا علم ہوا تو وہ فوراً نارِ حسد سے آگ بگولہ ہو گئے اور انھوں نے یہاں بھی اسلامی دعوت کے راستوں کو روکنے کی منصوبہ بندی شروع

1 صفی الرحمن، الرحیق المختوم، ص ۲۴۴

2 الطبری، تاریخ الرسل والملوک، ج ۲، ص ۳۹۶

کر دی اور قبائلِ عرب کو اپنی سازشوں کا شکار کرنا شروع کر دیا، یہ بات ان کے لیے کسی بھی طرح ناقابل برداشت تھی کہ وہ مدینہ کی صورت میں ایک اسلامی ریاست کے وجود کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔
نبی ﷺ ان کی چالوں سے آگاہ تھے لیکن آپ کی کوشش تھی کہ لڑائی جھگڑے سے حتی الوسع اجتناب ہی بہتر ہے۔ لیکن جب مشرکین مکہ اپنے تمرّد، ہٹ دھرمی اور ضد سے باز نہ آئے تو ایسے لوگوں کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے دعوت اسلامی کا اسلوب تبدیل کر دیا اور اعلان فرمادیا:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ﴾[1]

(جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے ان کو بھی جنگ کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے۔)

پھر اسی ضمن میں مزید چند آیات کا نزول ہوا جن کا مقصود باطل کا خاتمہ اور شعائر اللہ کا قیام تھا، ارشاد ربّانی ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [2]

"ان لوگوں کو اگر ہم زمین میں حکومت واقتدار سونپ دیں تو یہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ ادا کریں گے۔ نیکی کا حکم کریں گے اور برائی سے منع کریں گے۔"

ان آیات کے زمانہ نزول کا قطعی فیصلہ کرنا تو مشکل ہے لیکن یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ ان آیات کی عملی تفسیر ہجرت کے بعد ہی سامنے آئی جب مسلمانوں نے تمام تر مصالحتی کوششوں کے باوجود اسلامی دعوت کی مضبوطی اور حفاظت کے لیے جہاد کا راستہ اختیار کیا، یہی جہاد کی اجازت کفار مکہ کی تمرّد، سرکشی، کبر وغرور کا اعلاج کیمیا ثابت ہوا اور معرکہ بدر میں کفار مکہ کی ذلت آمیز شکست نے ان کے غرور کو خاک میں ملا دیا اور اسلامی دعوت کے راستوں کی تمام رکاوٹوں کو راستے سے ہٹا دیا۔

یہی وہ مخصوص مقاصد تھے جن کی بنیاد پر مدینہ میں نبی کریم ﷺ نے اپنے دعوتی منہج اور اسلوب میں بڑی نمایاں تبدیلیاں کیں اور دعوت اسلامی کو منت وسماجت کی پوزیشن سے آزادی دلا کر جہاد فی سبیل اللہ کی قوت سے آزادانہ

---

[1] سورۃ الحج ۲۲: ۳۹

[2] سورۃ الحج ۲۲: ۴۱

آبرومندانہ مقام پر کھڑا کردیا اور عرش بریں سے نقارہ بجادیا:

﴿وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾[1]

(کہہ دو (اعلان کردو) کہ حق آگیا اور جھوٹ بھاگیا، جھوٹ کو آخرکار بھاگنا ہی تھا۔)

ایسے جدید اور قدیم "داعینِ و مفکرین دعوت" کی یہ فکری کوتاہی نظر آتی ہے، جو اپنے کام میں دعوت کو جہاد سے بچانے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ ﷺ کی مدنی زندگی کی مصروفیات اور مہمات کو دیکھا جائے تو دعوتی سر گرمیوں کی نسبت جہادی سر گرمیوں میں آپ ﷺ کا رجحان غالب نظر آتا ہے کیونکہ مدنی زندگی میں جہادی سر گرمیاں زیادہ ہیں۔ اسی لیے بعض مفکرین اسلام کا کہنا ہے کہ ! وہ دعوت "دعوت" ہی نہیں ہے جو جہاد کو کھڑا نہ کرے اور وہ جہاد "جہاد" ہی نہیں جو دعوت کے راستوں کو بند کرے۔ لہٰذا اگر مدنی دور میں دیکھا جائے تو آپ نے مدینہ میں آ کر دعوتی اسلوب کو ضرور تبدیل کیا ہے اور یہ تبدیلی آپ کی ذاتی سوچ اور فکر کا نتیجہ نظر نہیں آتی بلکہ یہ منشاءِ الٰہی نظر آتی ہے اور اس کی دلیل یہی آیات ہیں جو پیچھے ذکر کی گئی ہیں۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام نے جہاد کا راستہ صرف اپنے دفاع میں اختیار کیا ہے جہاد ظلم کے خاتمے اور امن کا ضامن ہے اور دعوت اسلامی کا محافظ ہے۔ یہ ان لوگوں کا حسد پر مبنی پراپیگنڈہ ہے جو کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا ہے۔ اسلام نے تلوار ہمیشہ اپنے دفاع اور مظلوموں کی مدد میں اٹھائی ہے جبر کے ساتھ کسی کو مسلمان کرنا اسلامی تعلیمات میں شامل ہی نہیں ہے اور نہ آج تک یہ بات ثابت کی جاسکی ہے کہ فلاں جگہ پر مسلمانوں نے کسی قوم کو تلوار کے زور پر مسلمان کیا تھا۔ اسلام ہمیشہ اپنی دلیل کی قوت اور سچائی کی بنیاد پر قبول کیا گیا ہے اور دعوت اس کی اصل قوت ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ آپ جمعۃ المبارک کے دن مدینہ میں داخل ہوئے اور آپ نے بطن وادی میں داخل ہو کر جمعہ پڑھا جس میں تقریباً سو کے قریب آدمی تھے۔ آپ نے قباء میں قیام کے دوران مدینہ میں داخلے کے وقت جو خطبات ارشاد فرمائے وہ آپ کی مدنی دعوت کے بڑے حسین نمونے ہیں۔ جو ہدیہ قارئین کیے جاتے ہیں۔ مسجد نبوی اور قباء میں "مسجد قباء" کا قیام یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ نے ہجرت کے فوراً بعد جو کام کیا ہے وہ اسلامی دعوت کی غرض سے مساجد کا قیام تھا تاکہ مسلمانوں میں بلاتاخیر دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کا عمل جاری کیا جاسکے۔

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل ۱۷: ۸۱

مسجد قباء اور مسجد نبوی کا قیام اور خطباتِ دعوت

نبی ﷺ کے خطبات کے یہ نادر نمونے جو آپ نے ہجرت کے بعد مدینہ میں تشریف فرما ہونے کے بعد ارشاد فرمائے تھے۔ یہ خطبات ''ابن ہشام'' اور ''تاریخ طبری'' کے حوالے سے درج کیے جا رہے ہیں۔ ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کے حوالے سے ان خطبات کے تمام تر متن کو درج کیا ہے جو کہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ان خطبات کے متن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ کا مدینہ طیبہ میں ہجرت کے بعد کیا اسلوب دعوت تھا؟

ابن ہشام کہتے ہیں کہ راوی نے کہا کہ پہلا خطبہ رسول اللہ ﷺ نے دیا اور جو مجھے ابو سلمی بن عبد الرحمن سے پہنچا ہے اور ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہم آپ کے متعلق ایسی بات بیان کریں جو آپ نے نہ کہی ہو۔ یہ ہے کہ آپ ان لوگوں میں کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء ایسے الفاظ سے بیان فرمائی، جن کا وہ مستحق ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

((أَمَّا بَعْدُ، أَيُّهَا النَّاسُ، فَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ. تَعَلَّمُنَّ وَاللَّهِ لَيُصْعَقَنَّ أَحَدُكُمْ، ثُمَّ لَيَدَعَنَّ غَنَمَهُ لَيْسَ لَهَا رَاعٍ، ثُمَّ لَيَقُولَنَّ لَهُ رَبُّهُ، وَلَيْسَ لَهُ تَرْجُمَانٌ وَلَا حَاجِبٌ يَحْجُبُهُ دُونَهُ: أَلَمْ يَأْتِكَ رَسُولِي فَبَلَّغَكَ، وَآتَيْتُكَ مَالًا وَأَفْضَلْتُ عَلَيْكَ؟ فَمَا قَدَّمْتَ لِنَفْسِكَ؟ فَلَيَنْظُرَنَّ يَمِينًا وَشِمَالًا فَلَا يَرَى شَيْئًا، ثُمَّ لَيَنْظُرَنَّ قُدَّامَهُ فَلَا يَرَى غَيْرَ جَهَنَّمَ. فَمَنِ اسْتَطَاعَ أَنْ يَقِيَ وَجْهَهُ مِنَ النَّارِ وَلَوْ بِشِقٍّ مِنْ تَمْرَةٍ فَلْيَفْعَلْ، وَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ، فَإِنَّ بِهَا تُجْزَى الْحَسَنَةُ عَشْرَ أَمْثَالِهَا، إِلَى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ، وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ))[1]

''حمد و ثنا کے بعد فرمایا: اے لوگو! اپنی جانوں کے لیے کچھ آگے بھیجو، تمھیں یہ بات ضرور جان لینی چاہیے، اللہ کی قسم! تم میں سے ہر کوئی بے ہوش ہو جائے گا، پھر وہ اپنی بکریوں کو یوں ہی چھوڑ جائے گا کہ ان کا کوئی چرواہا نہیں ہو گا، پھر اس کا رب اس سے پوچھے گا اور ان دونوں کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہو گا اور نہ ہی کوئی پردہ حائل ہو گا جو اس کو ڈھانپ لے، پھر اللہ فرمائے گا کیا تیرے پاس میرا رسول نہیں آیا تھا؟ کیا اس نے تجھے تبلیغ نہیں کی تھی؟ اور میں نے تمھیں مال دیا تھا اور وہ بھی تیری ضرورت سے زائد پھر تو نے کیا آگے بھیجا اپنے لیے؟ پھر آدمی دائیں بائیں دیکھے گا تو اسے کوئی چیز نظر نہیں ائے گی پھر وہ اپنے آگے دیکھے گا تو سوائے جہنم کے اس کو کوئی چیز دکھائی نہ دے گی۔ پس جو کوئی تم میں طاقت رکھتا ہے اپنے آپ کو اس جہنم کی آگ سے بچالے خواہ وہ کھجور کا ایک ٹکڑا دے کر ہی ایسا کر لے، پس اگر کسی کے پاس وہ بھی

---

1 السھیلی، الروض الانف فی شرح السیرۃ النبویۃ لابن ہشام، ج ۷، ص ۱۶۸، ۱۶۹۔ ابن جریر، التاریخ الرسل والملوک، ج ۲، ص ۳۹۶

نہیں ہے تو پھر اچھی بات کے ساتھ ہی ایسا کر لے، پس ایک نیکی والے کو دس نیکیوں کے ساتھ جزادی جائے گی جو کہ سات سو گنا تک بڑھادی جائیں گی۔ اور تم پر اسلام ہو اور اللہ کے رسول پر بھی اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں۔"

آپ ﷺ کے اس خطبہ مبارکہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے مدینہ میں آکر اپنے اسلوب دعوت کو کافی حد تک تبدیل کر دیا۔ مدینہ میں آپ کی بات چیت کا انداز مکہ کی نسبت آزادانہ اور خوف و حراس سے مبرّا ہے اور آپ بڑے پُر زور طریقے سے لوگوں کو عمل صالح کی طرف راغب کرتے ہیں۔ اور اس کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اے لوگو! اپنے لیے نیک اعمال کی صورت میں ذخیرۂ آخرت کر لو، کیونکہ قیامت کا مرحلہ بڑا سخت ہے، جس کی سختی سے تم بے ہوش ہو جاؤ گے اور تم دنیا کو اس چرواہے کی طرح چھوڑ جاؤ گے جس طرح وہ اپنی محنت اور مشقت سے پالی ہوئی بکریوں کو بغیر کسی حفاظت کے چھوڑ جائے۔ اسی طرح تم بھی محنت اور مشقت سے کمائی ہوئی دنیا کو بے یار و مددگار چھوڑ کر مر جاؤ گے۔ پھر تم اپنے اللہ کے سامنے اس حالت میں کھڑے ہو گے کہ تمھارے اور اللہ کے درمیان نہ کوئی پردہ حائل ہو گا اور نہ کوئی ترجمان ہو گا۔

کتنا باکمال ہے آپ ﷺ کا اسلوب؟ کہ آپ ﷺ نے مدینہ والوں کو کس قدر ڈرایا ہے؟ کہ انسان یہ منظر اپنے سامنے لانے کے بعد کبھی سستی اور بدعملی کا ارتکاب نہیں کر سکتا ہے۔

پھر آپ ﷺ نے وہاں کے حالات کے مطابق لوگوں کی کیفیت دیکھ کر خرچ کرنے کی ترغیب کتنے شاندار طریقے سے دی ہے؟ کہ تم قیامت کے دن کس قدر ان نیک اعمال کے محتاج ہو گے؟ اور خرچ نہ کرنے والے اور نیک اعمال نہ کرنے والے رسولوں پر ایمان نہ لانے والے کس قدر پھنس جائیں گے کہ باوجود اِدھر اُدھر چارہ کار کے آخر اپنے سامنے جہنم کو دیکھیں گے۔ تو تب ان کی حالت کیا ہو گی؟ آپ ﷺ فرماتے ہیں: لوگو! اس دن کی پریشانی سے بچنے کے لیے جس قدر بھی ممکن ہو سکے اللہ کی راہ میں خرچ کر لو یہاں سے چلے جانے کے بعد نیکی کا موقع نہیں ملے گا۔

مکہ میں نہ مسلمان خرچ کرنے کی پوزیشن میں تھے اور نہ ہی حالات ایسے تھے کہ لوگوں کو اس بات کی دعوت دی جاتی اب چونکہ مدینہ میں اس چیز کی ضرورت بھی تھی کیونکہ کوئی بھی ریاست روپے پیسے کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اب مدینہ میں آتے ہی آپ نے اسلامی ریاست کے قیام کا انتظام انصرام شروع کر دیا اور جن چیزوں کی اس کو ضرورت تھی آپ نے روزِ اوّل سے ہی اس کی ترغیب دینا شروع کر دی، آپ نے مزید ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

جو کوئی نیکی کرے گا اس کے لیے وہ نیکی سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑھادی جائے گی۔ اب دیکھیں کہ مدینہ

میں آپ ﷺ کا اسلوب دعوت کس قدر مختلف ہے کیونکہ اب حالات اس کی اجازت دے رہے ہیں اس کا تقاضا کر رہے ہیں، آپ نے کس قدر عمدہ طریقے سے لوگوں کو عمل پر راغب کیا ہے؟ آپ مہاجرین اور انصار میں "معاہدۂ اخوت" کروانے کا انتظام کر رہے ہیں تاکہ اس کے ذریعے مہاجرین کے جو مسائل و مشکلات ہیں ان کا سدِّباب کیا جا سکے اور جو نئی ریاست کے سامنے آنے والے مسائل ہیں ان کا حل نکالا جائے۔ لوگوں کو عملی طور پر اس قدر تیار کر دیا جائے کہ ہر آدمی اپنی جگہ پر کام کرے۔

پھر آپ ﷺ اپنی بات کا خاتمہ دعا کے ساتھ کر رہے ہیں اور دعا بھی بڑی باکمال کہ اے لوگو! تم پر اللہ کی طرف سے سلامتی ہو لوگوں کو دعا دینے کے بعد فرمایا کہ یہ سلامتی اور رحمت و برکت اللہ کے رسول پر بھی ہو۔ اب کون سے سامعین ایسے ہیں کہ جو اس طرح کا وعظ سن کر عمل پر راغب نہ ہوں؟ ابن سعد کے بیان کے مطابق سامعین کی تعداد ایک سو کے قریب بتائی جاتی ہے۔ یہ خطبہ مبارک اسلام کا مدینہ طیبہ میں سب سے پہلا خطبہ جمعۃ المبارک ہے جو ایک اسلامی ریاست کی اجتماعیت کی بنیاد ڈالتا ہے اور آپ کی سیاسی اور انتظامی منصوبہ بندی کو واضح کرتا ہے۔ آپ نے مدینہ آتے ہی بڑی حکمت عملی اور منصوبہ بندی سے اپنی دعوتی حکمت عملی کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ جو کہ آپ کے شخصی کردار اور قابلیت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

ہجرت کے بعد مدینۃ النبی میں آپ کے دوسرے خطبے کا نایاب نمونہ

ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کے طریق سے نبی ﷺ کا دوسرا خطبہ بھی نقل کیا ہے جو کہ آپ کی شخصیت و کردار اور اسلوبِ دعوت کا آئینہ دار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((إن الحمد لله أحمده وأستعينه نعوذ بالله من شرور أنفسنا وسيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادي له وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له إن أحسن الحديث كتاب الله تبارك وتعالى قد أفلح من زينه الله في قلبه وأدخله في الإسلام بعد الكفر واختاره على ما سواه من أحاديث الناس إنه أحسن الحديث وأبلغه أحبوا ما أحب الله أحبوا الله من كل قلوبكم ولا تملوا كلام الله وذكره ولا تقس عنه قلوبكم فإنه من كل ما يخلق الله مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ . سَلَامٌ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى ، أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ الإِسْلَامِ ، أَسْلِمْ تَسْلَمْ ،

يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ، فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الأَرِيسِيِّينَ وَ (يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَنْ لاَ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّٰهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ له يختار ويصطفى وقد سماه الله خيرته من الأعمال ومصطفاه من العباد والصالح من الحديث ومن كل ما أوتي الناس الحلال والحرام فاعبدوا الله ولا تشركوا به شيئا واتقوه حق تقاته وأصدقوا الله صالح ما تقولون بأفواهكم وتحابوا بروح الله بينكم إن الله يغضب أن ينكس عهده والسلام عليكم)) [1]

"بے شک تمام تعریف اللہ کے لیے ہے، میں اس کی حمد بیان کرتا ہوں اور اُسی سے مدد مانگتا ہوں اور ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں اپنے نفس کی شرارتوں سے اور برے اعمال سے۔ جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے دیں، اُسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ بے شک سب سے اچھا کلام اللہ کی کتاب ہے۔ تحقیق وہ شخص فلاح پا گیا جس کے دل میں اللہ نے اس کلام کو سجا دیا اور اس کو اسلام میں داخل کر دیا کفر کے بعد۔ اور پھر اس نے اس کلام کو فوقیت دی لوگوں کی باتوں پر۔ بے شک وہ بہترین کلام ہے اور نہایت بلیغ کلام ہے جس چیز سے اللہ کو محبت ہے، تم بھی اس سے محبت رکھو، اپنے پورے دل سے اللہ کو چاہو اور اللہ کے کلام اور اس کے ذکر سے غافل نہ ہو جاؤ۔ کہیں تمھارے دل اس سے سخت نہ ہو جائیں۔ کیوں کہ وہ جن جن چیزوں کو پیدا کرتا ہے ان میں سے بعض کو برگزیدہ اور منتخب فرما لیتا ہے۔ اس نے اس کا نام "اعمال میں سے برگزیدہ اور" بندوں میں سے اپنا منتخب بنالیتا ہے اور کلام میں سے اچھا رکھا ہے ان چیزوں میں سے جو لوگوں کو دی گئی ہیں حلال و حرام بھی ہے۔ اس لیے اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اس سے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے۔ اور اللہ کے بارے میں سچ کہو کہ یہ جو کچھ تم اپنے منہ سے کہتے ہو اس میں بہترین ہے۔ اللہ کی رحمت کے سبب تم آپس میں محبت رکھو۔ اللہ کے عہد کو توڑنے سے اللہ غضب ناک ہوتا ہے۔ اور تم پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔"

یہ خطبہ بھی آپ ﷺ کے اسلوبِ دعوت کا نادر نمونہ ہے جس کی ابتدا میں آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی ہے، پھر

---

[1] الروض الانف فی شرح السیرۃ النبویۃ لابن ہشام، ج ۴، ص ۱۶۹

انسانی نفس کی شر اور برے اعمال سے پناہ مانگی ہے پھر توحید و رسالت کا اقرار کیا ہے۔ اس کے بعد کلام اللہ یعنی قرآن مجید کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ سب سے بہترین کلام کتاب اللہ قرآن مجید ہے کیوں کہ دعوت دین کی اصل یہی کتاب ہدایت ہے۔ اس سے محبت کرنے کی تلقین بیان فرمائی ہے۔ تاکہ لوگ دل و جان سے بڑھ کر اس کو اہمیت دیں اور کسی لمحہ بھی اس سے غفلت اور صرف نظر نہ کریں۔ پھر حلال و حرام کا تصور اُجاگر کیا ہے تاکہ اسلامی معاشرے میں مدینہ کے لوگ ان چیزوں میں فرق کریں جو مکہ میں ممکن نہ تھیں۔ اور پھر لوگوں کو اللہ تعالی کی ذاتِ گرامی سے ڈرنے کا حکم صادر فرمایا اور لوگوں کو مسلمانوں کو باہم مل جُل آپس میں پیار و محبت سے رہنے کا حکم دیا ہے جو کہ ایک اسلامی معاشرے میں انسانی آبادیوں کے لیے ضروری ہوتا ہے جو کہ معاشرتی فلاح کا باعث بنتا ہے اور لوگوں کو اللہ کا عہد توڑنے سے ڈرایا گیا ہے تاکہ لوگوں میں تقویٰ اور خوفِ خدا پیدا ہو۔ اور لوگ ہمہ وقت صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں اور دنیا و آخرت کی حقیقی کامیابی سے ہمکنار ہوں۔

آپ نے بڑے اچھوتے انداز میں لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرنے کی کوشش کی ہے اور لوگوں کے سوئے ہوئے جذبے کو بیدار کیا ہے۔ تاکہ اسلامی معاشرے کا ہر فرد اپنے اپنے فرائض منصبی اچھے طریقے سے سرانجام دے۔ آپ کی یہ دعوت مستقل مزاجی پیدا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔

9۔ صلح حدیبیہ کے بعد عالمی دعوت

مدینہ میں ہجرت کے بعد سن دو ہجری میں لڑی جانے والی جنگ بدر نے قریش اور قبائل عرب کے غرور کو خاک میں ملا دیا اور مسلمانوں اور اسلامی دعوت کے بارے میں عالمی سوچ میں تبدیلی پیدا کر دی اور مسلمانوں کو ایک مستقل قوت تسلیم کیا جانے لگا۔ آپ ﷺ نے معرکہ بدر کی کامیابی کے بعد اپنی قوت کو مزید منظم کیا اور مسلمانوں کا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے اسلامی دعوت کی نئے سرے سے حکمت عملی وضع کی اور مسلسل کئی فوجی اور عسکری کارروائیاں جاری رکھیں تاکہ کفارِ مکہ اور دیگر قبائل عرب پر دباؤ جاری رہے اور اسلامی دعوت کو پھیلنے کا موقع ملتا رہے۔

ذیعقدہ سن چھ ہجری ٦ھ میں نبی ﷺ جب عمرہ کی نیت سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے[1] تو قریش کو جب اس بات کا علم ہوا تو ان کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی اور وہ جنگ کی تیاری اور آپ کو عمرے کی ادائیگی سے روکنے کے لیے تیار ہو

1 صفی الرحمن، الرحیق المختوم، ص ۴۷۵

گئے۔ جب آپ کو اس چیز کا علم ہوا تو آپ نے بھی لڑائی سے بچنے کو ہی ترجیح دی۔ جب کفارِ مکہ کو جنگ بدر کی تباہی یاد آئی تو انھوں نے بھی صلح ہی میں بہتری سمجھی۔ دونوں فریقین میں جو صلح ہوئی تاریخ میں ''صلح حدیبیہ'' کے نام سے معروف ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس کو ''فتح مبین''[1] کا نام دیا ہے۔ اس کی بظاہر شرائط تو مسلمانوں کے خلاف تھیں لیکن نبی ﷺ کی دُور اندیشی اور اس کے مابعد اسلامی دعوت پر اثرات کی وجوہات کی بنیاد پر ہی اللہ نے اسے فتح مبین قرار دیا ہے۔

صلح حدیبیہ در حقیقت اسلام اور مسلمانوں کی زندگی میں ایک نئی تبدیلی کا آغاز تھا۔ چونکہ اسلام کی عداوت اور دشمنی میں قریش مکہ سب سے زیادہ مضبوط، ہٹ دھرم، اور لڑاکا قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن جب وہ صلح کی طرف پلٹے تو اس کا صاف مطلب تھا کہ انھوں نے اسلام کی قوت کو تسلیم کر لیا ہے اور برابری کی سطح پر صلح کی ہے۔ اس سے دعوت اسلامی کو خوب پھیلنے پھولنے کا موقع میسر آ گیا جو کہ آپ کی حکمت عملی کا ایک بڑا با کمال مظاہرہ تھا۔

اس دوران مسلمانوں نے اپنی دعوتی سرگرمیوں کو مزید تیز کر دیا۔ ماہرین سیرت نے اس کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، شاہانِ عرب کو خطوط اور ان کو دعوتِ اسلام اور دوسرا حصہ ہے ''جنگی سرگرمیاں'' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دوران جنگی سرگرمیوں کی نسبت دعوتی سرگرمیوں کو فوقیت حاصل ہے کیونکہ آپ کی بعثت کا مقصد بھی یہی دعوت تھی، آپ نے تمام شاہان عرب کو پہلے بذریعہ خطوط دعوت اسلام پیش کی، ان کے جواب کے انتظار کے بعد ان کی سرگرمیوں اور اسلام کے بارے میں ان کا رویہ دیکھ کر آپ نے اُن میں عسکری مہمات روانہ کی ہیں۔

فوراً ہی ان پر حملے شروع نہیں کر دیے گئے۔ کیونکہ مسلمانوں نے جو مصائب و مشکلات کا سامنا کیا ہے تو فقط ان کا مقصد دعوت اسلامی کی کامیابی تھی۔ لوگوں کو جہنم سے بچانا مقصد تھا رسالت کی تبلیغ کرنا مقصود تھا نا کہ ان کو جبراً فتح کرنا مقصود تھا۔

صلح حدیبیہ کے بعد حالات بڑی تیزی کے ساتھ مسلمانوں کے حق میں ہو گئے۔ جب قریش نے صلح میں عافیت سمجھی تو پھر باقی لوگوں کو بھی ٹھنڈا ہونا پڑا۔

بادشاہوں اور امراء کو بذریعہ خطوط دعوت

صلح حدیبیہ کے بعد جو اسلام اور مسلمانوں کا مقام و مرتبہ بلند ہوا قریش اور دیگر قبائل عرب کی سوچ میں تبدیلی آئی

[1] سورۃ الفتح ۴۸:۱

آپ ﷺ نے اس صورتحال سے فوراً فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ٦ ھ کے آخر پر جب حدیبیہ سے واپس آئے تو آپ نے مختلف بادشاہوں کے نام خط لکھ کر انھیں دعوت اسلام دینے کا پروگرام ترتیب دیا۔ اس ضمن میں جب آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا اور مختلف قاصدوں اور سفیروں کا انتخاب فرمایا تو آپ سے کہا گیا کہ بادشاہ خط اسی صورت قبول کریں گے جب ان پر مہر ہو گی۔ اس لیے نبی ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس پر محمد رسول اللہ نقش تھا۔ یہ نقش تین سطروں پر مشتمل تھا۔ محمد ایک سطر میں، رسول ایک سطر میں اور لفظ اللہ ایک سطر میں جس کی صورت یوں بنتی ہے۔
(اللہ، محمد رسول)[1]

سفیروں اور قاصدوں کے لیے آپ نے تجربہ کار لوگوں کا انتخاب کیا۔ اور انھیں بادشاہوں کے پاس خطوط دے کر روانہ کیا۔ علامہ سید سلیمان منصور پوری نے اپنی تصنیف "رحمت للعالمین" میں بڑے وثوق کے ساتھ یہ بات لکھی ہے کہ آپ نے یہ قاصد اپنی خیبر روانگی سے چند دن پہلے یکم محرم ۷ ھ کو روانہ فرمائے تھے۔[2]

بذریعہ خطوط نبی ﷺ کی دعوت کا اسلوب بذاتِ خود ایک مستقل مقالے کا عنوان بنتا ہے علماء سیرت نے اس پر مستقل کتب تحریر فرمائی ہیں جن میں ان خطوط کی تمام تر تفاصیل دیکھی جاسکتی ہیں مثال کے طور پر: "مولانا حفظ الرحمن سوہاردی" کی "البلاغ المبین" اس سلسلہ میں بڑی اہم کتاب ہے۔ ابن قیم، کی "زاد المعاد فی ہدیۃ خیر العباد" میں ان خطوط کے متعلق بڑی وضاحت سے لکھا گیا ہے۔ "رحمۃ اللعالمین" میں سید سلیمان منصور پوری، متقدمین میں سے، ابن ہشام، ابن جریر، ابن سعد، ابن اسحاق، البیہقی، رحمہم اللہ علیہم نے ان خطوط کو نقل کیا ہے اور حال ہی میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے بھی جدید تحقیق کی بنیاد پر ان خطوط کے متعلق بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں "الرحیق المختوم" میں مولانا صفی الرحمن مبارک پوری نے ان خطوط کی تاریخی حیثیت اور تقدیم و تاخیر کا بڑا شاندار طریقے سے تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔

ہم یہاں نبی ﷺ کے کچھ خطوط کا ذکر کریں گے جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ آپ کا شاہان عرب کو دعوت دینے کا اسلوب و انداز کیا تھا۔ تمام خطوط کو ذکر کرنا ضروری نہیں ہے۔ البتہ ان خطوط کی فہرست اور جن جن بادشاہوں کو لکھے گئے ان کے ناموں کی فہرست یہاں پے درج کر دی جاتی ہے۔

---

1 السہیلی، الروض الانف فی شرح السیرۃ النبویۃ، ج ۷، ۵۱۲

2 محمد سلیمان سلمان، قاضی، رحمۃ اللعالمین، ن مکتبہ اسلامیہ اردو بازار لاہور، ص ۱۵۳ تا ۱۶۵، ط ۲۰۱۳ء

بادشاہ کا نام		ملک کا نام	سفیر کا نام
۱۔	اصحمہ بن ابجر المعروف نجاشی	حبشہ کا بادشاہ (اتھوپیا)	عمرو بن امیہ ضمری
۲۔	جریج بن متی۔ مقوقس	شاہِ مصر	حاطب بن ابی بلتعہ
۳۔	کسریٰ (خسرو پرویز)	شاہِ فارس (ایران)	عبد اللہ بن حذافہ سہمی
۴۔	ہرقل قیصر روم	شاہِ روم	دحیہ کلبی
۵۔	منذر بن ساویٰ	حاکم بحرین	علاء بن حضرمی
۶۔	ہوذہ بن علی	حاکم یمامہ	سلیط بن عمرو
۷۔	حارث بن ابی شمر غسانی	حاکم دمشق	شجاع بن وہب الاسدی
۸۔	جیفر بن جلندی	شاہِ عمان	عمرو بن عاص[1]

اصحمہ بن ابجر نجاشی شاہِ حبش کے نام خط میں اسلوبِ دعوت اور شخصیت نبوی ﷺ کا انداز تخاطب

یہ خط ہے محمد نبی کی طرف سے نجاشی اصحمہ کے نام جو شاہِ حبش ہے۔

اس پر اسلام جو ہدایت کی پیروی کرلے۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، نہ اس کی بیوی ہے اور نہ ہی اس کی کوئی اولاد اور میں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور رسول ہے اور میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں کیونکہ میں اس کا رسول ہوں لہذا تم اسلام لاؤ سلامت رہو گے۔ اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک بھی نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے بعض بعض کو رب نہ بنائے۔ پس اگر وہ منہ موڑیں تو کہہ دو کہ ہم مسلمان ہیں: "اگر تم نے یہ دعوت قبول نہ کی تو تم پر تمھاری قوم نصاریٰ کا گناہ بھی ہے۔"

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے ایک خط کی عبارت نقل فرمائی ہے جو ماضی قریب میں دستیاب ہوا ہے۔ اور صرف ایک لفظ کے اختلاف کے ساتھ یہ خط علامہ ابن قیم کی "زاد المعاد" میں بھی موجود ہے۔

اس خط میں نبی ﷺ نے اپنے مخاطب کے آداب کو بالکل ملحوظ خاطر رکھا ہے اور بڑے عمدہ آداب کے ساتھ مخاطب کیا

---

[1] السھیلی، الروض الانف، فی شرح سیرۃ النبویۃ لابن ہشام، ج ۷، ص ۵۱۲۔ حمید اللہ، ڈاکٹر، حضور اکرم کی سیاسی زندگی، ص ۱۰۸ تا ۱۳۵

ہے۔اس کے بعد آپ نے پہلے اپنا عقیدہ بیان کیا ہے اور توحید الٰہی کو بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے اور عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث پر تنقید کی بجائے خود اپنا عقیدۂ توحید صاف صاف بیان کر دیا ہے اور اس صاف شفاف عقیدے کی اہمیت اُجاگر کرنے کے بعد عیسائیوں کو اس طرف بلایا ہے۔ اور ساتھ ہی احساس بھی دلایا ہے کہ ”تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ“ کہ ایک ایسے کلمے کی طرف آؤ جو تمہارے اور ہمارے درمیان برابر ہے۔“عقیدہ کی اہمت کا حساس دلایا ہے بات ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی ہے اور بادشاہ کو یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر تم اس عمدہ دعوت کو قبول نہیں کروگے تو تمھاری قوم کا گناہ بھی تمھارے سر ہی ہوگا۔ اور پھر خود اپنے بارے میں دوبارہ اعلان کر دیا ہے کہ اگر تم ہماری اس دعوت کو قبول نہیں کروگے تو بھائی ہم تو مسلمان ہیں۔

یہ کتنا باکمال اسلوبِ دعوت ہے ؟ کہ بات کو دل کی گہرائی میں اتارا جارہاہے اور سوئے ہوئے ضمیر کو جگایا جارہا ہے کہ قیامت کے دن کوئی عذر باقی نہ رہے۔ آپ نے بادشاہ کو بحیثیت نبی مخاطب کیا ہے اس میں آپ نے سیاستدانوں کا طریقہ اختیار نہیں کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ خط ہے۔ اور میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں اگر تم مسلمان ہو جاؤگے تو دنیا و آخرت کی کامیابی مل جائے گی اور حکومت بھی تمہاری تمہارے پاس ہی رہے گی۔ میں تم سے حکومت بھی نہیں چھینوں گا تاکہ بادشاہ کے دل میں کہیں حکومت کا لالچ اسلام قبول کرنے میں رکاوٹ نہ بن جائے؟ یہ ہے آپ کے شخصی کردار کی تاثیر۔

قیصر شاہِ روم کے نام خط میں آپ کا سلوبِ دعوت اور شخصیت نبوی کی جھلک

ہرقل قیصر روم کے نام یہ خط حضرت دِحیہ بن خلیفہ کلبی لے کر گئے۔ بخاری میں اس خط کا متن موجود ہے۔ جس سے آپ کے اسلوبِ دعوت کا پتہ چلتا ہے۔ خط کا متن یوں ہے:

((مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ إِلَى هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ . سَلاَمٌ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى، أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ الإِسْلاَمِ، أَسْلِمْ تَسْلَمْ، يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ، فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الأَرِيسِيِّينَ وَ (يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَنْ لاَ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّٰهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ)) [1]

---

[1] بخاری، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ۔ آل عمران ۳: ۱۴

"اللہ کے بندے اوراس کے رسول محمد کی جانب سے ہر قل عظیم روم کی طرف:
اس شخص پر اسلام جو ہدایت کی پیروی کرے۔ تم اسلام قبول کرلو سلامت رہو گے۔ اسلام لاؤ اللہ تمہیں تمہارا اجر دوبارہ دے گا اور اگر تم نے روگردانی کی تو تم پر تمہاری رعایا کا بھی گناہ ہو گا۔ اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہاے درمیان برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی اور چیز کو شریک ٹھہرائیں اور اللہ کے سوا ہم ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں۔ پس اگر وہ اس بات کو نہ مانیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ بے شک ہم تو مسلمان ہیں۔"

حضرت دحیہ کلبیؓ جب نبی ﷺ کا نامہ مبارک لے کر حاکم بصرہ کے پاس گئے کہ وہ یہ خط قیصر روم کو پہنچادے، جب ہر قل قیصر روم کو آپ کا نام مبارک موصول ہوا تو وہ اس وقت ایلیاء بیت المقدس میں تھا۔ اس نے کہا کہ اُن لوگوں کو بلایا جائے جو اس علاقے میں ائے ہوئے ہیں تاکہ ان سے آپ کے بارے میں پوچھا جائے، حضرت ابوسفیان بن حرب ابھی اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے یہ بھی قریش کی تجارتی جماعت میں شامل تھے۔ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں وہاں بیت المقدس میں بلایا گیا اور آپ ﷺ کے بارے میں ہمارے اور اس کے درمیان بذریعہ ترجمان بات ہوئی۔ اس گفتگو کو یہاں نقل کرنے کا مقصد ہے۔ منہج دعوت میں شخصی کردار اور اسلوبِ دعوت کو بیان کرنا۔ کہ آپ کے سخت ترین مخالف بھی آپ کے متعلق کس طرح کا ذہن رکھتے تھے اور ان کی کیا سوچ تھی؟ ابوسفیان بیان کرتے ہیں کہ ہر قل نے جو پہلا سوا کیا وہ یہ تھا:

لوگوں میں اس کا نسب کیسا ہے؟

میں نے کہا وہ اونچے نسب والا ہے

ہر قل نے کہا: کیا یہ بات اس سے پہلے بھی تم میں سے کسی نے کہی تھی؟

میں نے کہا: "نہیں۔"

ہر قل نے کہا: اس کے باپ دادا میں سے کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

میں نے کہا: "نہیں۔"

ہر قل نے کہا: بڑے لوگ اس کی پیروی کررہے ہیں یا کہ چھوٹے؟

میں نے کہا: "کمزور لوگ۔"

ہر قل نے کہا: ''کیا یہ لوگ بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں ؟''

میں نے کہا: ''بڑھ رہے ہیں۔''

ہر قل نے کہا: کیا اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص مرتد بھی ہوا ہے ؟

میں نے کہا: ''نہیں۔''

ہر قل نے کہا: ''اس کے دعویٰ نبوت سے پہلے جھوٹا تھا؟''

میں نے کہا: ''نہیں۔''

ہر قل نے کہا: ''کیا وہ بد عہدی کرتا ہے ؟''

میں نے کہا: ''نہیں البتہ ہمارا جو اس کے ساتھ معاہدہ صلح ہے پتہ نہیں وہ اس کے متعلق کیا کرتا ہے ؟''

ابو سفیان کہتے ہیں کہ ایک جملہ میں اپنی طرف سے اس میں شامل کر سکا۔

ہر قل نے کہا: ''کیا تم نے اس سے جنگ کی ہے ؟''

میں نے کہا: ''جی ہاں''

ہر قل نے کہا: ''تمہاری جنگ اس کے ساتھ کیسی رہی ؟''

میں نے کہا: ''جنگ ہمارے اور اس کے درمیان برابر کی ہے کبھی ہم جیت جاتے ہیں کبھی وہ جیت جاتا ہے۔

ہر قل نے کہا: ''وہ تمہیں کن باتوں کا حکم دیتا ہے ؟''

میں نے کہا: ''وہ کہتا ہے کہ تم صرف ایک اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ تمھارے باپ دادا جو کہتے تھے اسے چھوڑ دو۔ وہ ہمیں نماز، سچائی، پرہیز گاری، پاک دامنی اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتا ہے۔

اس کے بعد ہر قل نے اپنے ترجمان سے کہا کہ تم ابو سفیان سے کہو کہ میں نے اس کے نسب کا سوال کیا ہے تو آپ نے جواب دیا ہے کہ وہ اعلیٰ نسب کا ہے تو پیغمبر ہمیشہ اعلیٰ نسب سے ہی آتے ہیں۔

میں نے آپ سے دریافت کیا کہ اس سے پہلے بھی آپ کے کسی آدمی نے اس طرح کی بات کی ہے تو آپ نے کہا کہ نہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ بات کسی اور نے اس سے پہلے کہی ہوتی تو میں کہتا کہ یہ اس کی نقالی کر رہا ہے۔

المختصر: ہر قل نے ابو سفیان سے تمام سوالات کی وضاحت کے بعد فرمایا: اگر یہ تمام باتیں درست ہیں جو تم نے بتائی ہیں تو

یہ شخص بہت جلد میرے ان دونوں قدموں کی جگہ کا مالک ہوگا۔ میں جانتا تھا کہ یہ نبی آنے والا ہے۔ لیکن میرا یہ گمان نہ تھا کہ وہ تم میں سے ہوگا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ میں اس کے پاس پہنچ سکوں گا تو اس سے ملاقات کی زحمت اُٹھاتا اور اگر اس کے پاس ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا۔

اس خط اور دعوت کا یہ اثر ہوا کہ ہرقل نے آپ ﷺ کے سفیر حضرت دحیہ کلبی کو تحفے تحائف دے کر واپس عزت و شرف کے ساتھ روانہ کیا۔[1]

جب ابو سفیان کو اس سارے معاملے کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تو وہ اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ ابو کبشہ کے بیٹے کا معاملہ زور پکڑ گیا۔ اس سے تو رومیوں کا بادشاہ بھی ڈرتا ہے۔ اس کے بعد مجھے برابر اس بات کا یقین رہا کہ آپ کا دین غالب آکر رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام کی سمجھ عطا فرمادی۔[2]

اب دیکھیں اس خط کے فنی محاسن کی طرف کہ یہ خط بڑا مختصر اور جامع ہے۔ اس میں آدابِ سفارت کو بالکل پورے احتیاط کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بادشاہ کو "الی ھرقل عظیم الروم" کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے جس سے ایک بہت بڑا دعوتی اصول وضع ہوتا ہے۔ آپ نے اس کی حکومت چھیننے کی بات نہیں کی ہے بلکہ دعوت کو ہی فوکس کیا ہے اور اسلام قبول کرنے کی طرف ہی رغبت دلائی ہے اور اس کے لیے "الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم" کہہ کر ایک بہت بڑا نفسیاتی اور سچائی پر مبنی اصول کا استعمال کیا ہے۔ جس سے اعراض کرنا ایک اصول پسند آدمی کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ داعی ہمیشہ اپنی دعوت میں ان اصولوں کو اپنے لیے کار آمد ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

فتح مکہ کے موقع دعوت

فتح مکہ تاریخ اسلامی کا ایک انتہائی اہم واقعہ ہے۔ جس نے کفار کی جڑ کاٹ دی اور قریش کے غرور کو خاک میں ملا دیا اور جزیرہ عرب میں مسلمانوں کی شان و شوکت کی دھاک بٹھادی۔ اور پوری دنیا کا کفر لرزہ براندام ہو گیا۔ اور اپنے مستقبل کے بارے میں مایوس و ناامید ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ اپنے پیغمبر کو بڑی شان و عظمت کے ساتھ دس ہزار فاتح لشکر کے ساتھ مکہ میں داخل فرمایا کہ جہاں سے آٹھ سال قبل آپ کو ہجرت پر مجبور کیا گیا تھا۔ اب اس بار آپ فاتح بن کر

---

1 بخاری، کتاب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ

2 بخاری، کتاب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ

مکہ میں داخل ہوئے۔

مکے والوں کو اپنی ایک ایک زیادتی یاد آئی جو انہوں نے مجبور و مقہور مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے تھے۔ آج اُن کو خوف کھائے جارہا تھا کہ لشکر اسلام آج ہماری کیا حالت کرے گا۔ ہمارے ایک ایک ظلم کا بدلہ لے گا۔ لیکن قربان جائیں آقا کی عظمت پر کہ انسانی تاریخ نے رحم و کرم، بخشش و غفران کا وہ منظر دیکھا کہ جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ آپ نے غزوہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد بیت اللہ میں داخلہ فرمایا طواف کیا اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور خانہ کعبہ کے دروازے کے دونوں بازوؤں کو پکڑ کر قریش کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ قریش آپ کے قدموں تلے تھے آپ بلند جگہ پر تھے وہ اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ اس موقع پر آپ نے اُن سے خطاب فرمایا۔

محمد بن اسحاق کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا:

((لا الٰه الا الله وحده لا شريك له صدق وعده و نصر عبدهٗ و حزم الاحزاب وحده))

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور اپنے بندے کی مدد فرمائی اور اکیلے نے ہی تمام جماعتوں کو شکست دے دی۔"

سنو! بیت اللہ کی کلید برداری اور حاجیوں کو پانی پلانے کے علاوہ سارا اعزاز یا کمال یا خون میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہے۔ یاد رکھو! قتل خطاء، شبہ عمد میں جو کوڑے اور ڈنڈے سے ہو مغلظ دیت ہے یعنی سو اُونٹ جن میں سے چالیس اونٹنیاں حاملہ ہوں، اے قریش کے لوگو! اللہ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا پر فخر کا خاتمہ کر دیا ہے سارے لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے ہے اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾ [1]

"اے لوگو! بے شک ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہاری ذاتیں اور قبیلے بنائے ہیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم میں سے عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو پرہیزگار ہے، بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔"

---

[1] سورۃ الحجرات ۴۹ : ۱۳

اس کے بعد آپ نے فرمایا اے قریش کے لوگو ! ''تمہارا کیا خیال ہے ؟ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں ؟'' انہوں نے کہا: ''اچھا۔'' آپ کریم بھائی ہیں اور کریم بھائی کے صاحبزادے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''تو میں تم سے وہی بات کرنے والا ہوں جو یوسف علیہ اسلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی کہ :

﴿لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾

''آج تم پر کوئی سرزنش نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔''[1]

نبی اور بادشاہ میں یہی فرق ہوتا ہے۔ کہ بادشاہ کو موقع ملے تو ظلم کے پہاڑ توڑ دیتا ہے اور جبر و تشدد کی تاریخ رقم کرتا ہے۔ لیکن اگر اللہ کسی نبی کو موقع دے تو وہ عاجزی وانکساری اپناتا ہے۔ یہ خطبہ شرف انسانیت کا علمبردار ہے اور وحدت انسانی کا چارٹر ہے جس نے برادری عزم کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اس جیسی مثال دنیا کے کسی بھی مذہب میں موجود نہیں ہے۔ اسلام کی تیزی کے ساتھ اشاعت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام بلا تمیز رنگ و نسل سب کو اپنے اندر ضم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے سایہ عاطفت میں ہر کوئی امن و سکون پاتا ہے۔ اس فلسفے کے پیچھے آپ کا یہی خطبہ اور دعوت کارفرما ہے۔

جس طرح ماہرین سیرت نے نبی ﷺ کی مکی زندگی کو دعوتی نقطہ نظر سے تین مراحل میں تقسیم کیا ہے اسی طرح مدنی دور کو بھی وہ تین مراحل میں تقسیم کرتے ہیں۔

پہلا مرحلہ ہجرت سے لے کر صلح حدیبیہ تک۔

دوسر مرحلہ صلح حدیبیہ کے بعد سے لے کر فتح مکہ تک اور

تیسرا مرحلہ فتح مکہ کے بعد سے لے کر آخری حیاتِ مبارکہ تک۔

تیسرا مرحلہ یہ نبی ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی کا آخری مرحلہ ہے۔ جو آپ کی اسلامی دعوت کے نتائج اور شخصی کردار کی کامیابی کی نشان دہی کرتا ہے۔ جنہیں آپ نے تقریباً سال کی طویل جد و جہد، مشکلات و مصائب، ہنگاموں، فسادات اور جنگوں اور خونریز معرکوں کے بعد حاصل کیا۔

ان طویل برسوں میں ''فتح مکہ ''ایک عظیم کامیابی تھی جو آپ ﷺ نے حاصل کی اس کی وجہ سے حالات کا دھارا بدل گیا۔ اور عرب کی فضاء میں تغیّر آگیا۔ یہ فتح درحقیقت اپنے ماقبل اور مابعد کے دونوں زمانوں کے درمیان حد فاصل کی حیثیت

---

1 السھیلی، الروض الانف فی شرح السیرۃ النبویۃ لابن ہشام، ج ۷ ص ۲۳۲۔

رکھتی ہے۔ چونکہ قریش اہل عرب کی نظر میں دین کے محافظ اور انصار تصور کیے جاتے تھے۔ اور پورا عرب اس وجہ سے ان کی تعظیم کرتا تھا۔ اس لیے قریش کی شکست کا یہ مطلب تھا کہ پورے عرب میں بت پرستانہ دین کا خاتمہ ہو گیا۔[1]

یہ آخری مرحلہ دو حصوں میں تقسیم ہے:

۱۔ جہاد و قتال

۲۔ قبول اسلام کے لیے قوموں اور قبیلوں کی دوڑ

﴿وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾[2]

یہ دونوں صورتیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں اور اس مرحلے میں آگے پیچھے بھی اور ایک دوسرے کے دوران بھی پیش آتی رہی ہیں۔ ہماری تحقیق کا موضوع چونکہ دعوت کے متعلق ہے اس لیے ہم اس مرحلے میں آپ کی حیاتِ مبارکہ کے دعوتی پہلو پر ہی بات کریں گے۔

اسلامی دعوت کامیابیوں کے اُفق پر

آپ ﷺ کے درست منہج اور شخصی تاثیر کی بنا پر اسلامی دعوت اتنے بڑے پیمانے پر کامیاب ہوئی کہ عقلیں حیران رہ گئیں۔ سارا جزیرۃ العرب آپ کے تابع فرمان ہو گیا۔ اس کے اُفق سے جاہلیت کا غبار چھٹ گیا۔ بیمار عقلیں تندرست ہو گئیں۔ یہاں تک کہ بتوں کو چھوڑا نہیں گیا بلکہ توڑ دیا گیا۔ بت پرستی کا جزیرۃ العرب سے ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا گیا۔ نغمہ توحید سے فضا گونجنے لگی۔ ایمان جدید سے حیات پائے ہوئے صحراء کا شبستانِ وجود اذانوں سے لرزنے لگا۔ اور اس کی پہنائیوں کو اللہ اکبر کی صدائیں چیرنے لگیں۔ قرّاء قرآن کی آیتیں تلاوت کرتے ہوئے اور دین الٰہی کو قائم کرتے ہوئے روئے زمین پر پھیل گئے۔ بکھری ہوئی قومیں اور قبیلے ایک ہو گئے۔ انسان بندوں کی بندگی سے آزاد ہو کر اللہ کی بندگی میں داخل ہو گئے۔

اب نہ کوئی قاہر ہے نہ مقہور، نہ کوئی مالک ہے نہ مملوک، نہ حاکم ہے نہ محکوم نہ ظالم ہے نہ مظلوم بلکہ سارے لوگ ایک اللہ کے بندے اور آپس میں دین اسلام کی بنیاد پر بھائی بھائی بن گئے۔ ''المسلم اخو المسلم'' کی عملی تصویر پیش کی جانے لگی۔

---

1 صفی الرحمٰن، مولانا، الرحیق المختوم، ص ۵۶۰

2 سورۃ النصر ۱۱۰: ۲

لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام بجالاتے ہیں۔ اللہ نے ان سے جاہلیت کا غرور و نخوت اور باپ دادا پر فخر کا خاتمہ کر دیا اب کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، برتری کا معیار صرف تقویٰ قرار پا رہا ہے اور تمام لوگ اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ سارے لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے ہے۔

غرض اس دعوت کی بدولت عربی وحدت، انسانی وحدت اور اجتماعی عدل وجود میں آیا۔ نوعِ انسانی کو دنیاوی مسائل اور اخروی معاملات میں سعادت کی راہ مل گئی۔ باالفاظ دیگر، زمانے کی رفتار بدل گئی زمین پر ایک بڑی تبدیلی آگئی۔ تاریخ کا دھارا بدل گیا اور سوچنے کے انداز بدل گئے۔ اس دعوت سے پہلے جاہلیت کی کارفرمائی تھی، اس کا ضمیر متعفن تھا اور روح بدبودار تھی۔ قدریں اور پیمانے مختلف تھے۔ زندگی اور غلامی کا دور دورہ تھا۔ فاجرانہ اور سیکولر خوشحالی اور تباہ کن محرومی کی موج نے دنیا کو تہہ و بالا کر رکھا تھا۔ اس پر کفر و گمراہی کے تاریک اور دبیز بادل چھائے ہوئے تھے۔ حالانکہ آسمانی مذاہب و ادیان موجود تھے، مگر ان میں تحریف نے جگہ پالی تھی۔ اور ضعف سرایت کر گیا تھا ان کی گرفت ختم ہو چکی تھی، اور وہ محض بے جان اور بے روح قسم کے جامد رسم و رواج کا مجموعہ بن کر رہ گئے تھے۔

جب آپ ﷺ نے اپنی شخصیت کی تاثیر دکھائی انسانوں کے سامنے اپنا کردار پیش کیا۔ دعوت کو درست منہج پر استوار کیا تو انسانی روح کو وہم و خرافات بندگی و غلامی، فساد و تعفن، گندگی و انارکی سے نجات دلائی۔ اور انسانوں کو طبقاتی امتیازات، کاہنوں کے رسوا کن تسلط سے چھٹکارا دلایا۔ اور دنیا کو عفت و عظمت، ایجادات و تعمیر، آزادی و تجدّد، معرفت و یقین، وثوق و ایمان، عدالت و کرامت اور عمل کی بنیادوں پر زندگی کی بالیدگی حیات کی ترقی اور حقدار کی حق رسائی کے لیے تیار کیا۔

ان تبدیلیوں کی بدولت جزیرۃ العرب نے ایک ایسی بابرکت اٹھان کا مشاہدہ کیا جس کی نظیر انسانی تاریخ میں کہیں نہیں دیکھی گئی اور یہ قرۃ ارض نورِ توحید سے اس طرح منور ہوا کہ جس کی روشنی نے پوری دنیا کو منور کر دیا۔

خطبہ حجۃ الوداع اسلامی دعوت

اللہ تعالیٰ نے آپ کو دعوت و تبلیغ اور انسانی رشد و ہدایت کی خاطر مبعوث فرمایا، جب آپ نے اس ذمہ داری کو کماحقہ ادا کر لیا۔ جس کے نتیجے میں توحید و رسالت کی بنیاد پر ایک نئے معاشرے کی تشکیل عمل میں آگئی جو کہ اللہ تعالیٰ کی منشا تھی، تو آپ کو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ اب میں زیادہ دیر دنیا میں نہیں رہ سکوں گا۔ لہٰذا آپ نے پہلے سے بھی زیادہ محتاط

انداز زندگی اختیار کر لیا اور اپنی تمام تر توجہ اپنے دینی منہج پر مرکوز کر دی اور اپنے کام کو جلدی سے نپٹانے میں لگ گئے۔
آپ نے سن ۱۰ ھ کو حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو آپ نے کھلے لفظوں میں فرمادیا:
"اے معاذ! شاید تم مجھے اس سال کے بعد نہ مل سکو گے۔ بلکہ تم میری اس مسجد اور قبر کے پاس سے گزرو گے۔"
حضرت معاذ آپ ﷺ کی اس بات کو سن کر رونے لگے۔
در حقیقت اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ اپنے پیغمبر کو اس دعوت کے ثمرات دکھا دے، جس کی راہ میں آپ نے بیس سال تک مصائب و مشکلات کو برداشت کیا تھا۔ اس کا طریق کار یہی ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی قوم اور قبائل عرب کو آپ کی امامت میں جمع کرتا اور وہ آپ سے احکام شریعت حاصل کرتے اور آپ ان سے گواہی لیتے کہ کیا میں نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی ہے؟ پیغام رب کی تبلیغ فرمادی ہے؟ اور امت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا ہے؟

اس مشیت ایزدی کے مطابق آپ نے حج مبرور کا اعلان فرمایا تو مسلمانانِ عرب جوق در جوق بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس قافلے کے راہی بنے۔ آپ نے اپنے ان جانثاروں کے ہمراہ فریضہ حج ادا فرمایا اور امت کو مناسک حج کی عملی تعلیم دی اور احکام شریعت سکھائے۔ اس موقع پر آپ نے حجاجِ کرام کو خطبہ حج سنایا جو کہ آپ کی دعوت، منہج دعوت، آپ ﷺ کی شخصی تاثیر کا بہترین نمونہ ہے اور اپنی جامعیت کے اعتبار سے عالمی امن و سلامتی کا ضامن ہے۔ اس خطبہ کا ایک ایک لفظ پوری انسانیت کے لیے ابرِ رحمت ہے۔ ابن اسحاق نے آپ کے اس خطبہ حجۃ الوداع کے متن کو یوں بیان کیا ہے:

((أيها الناس اسمعوا قولى فإني لا أدرى لعلى لا ألقاكم بعد عامى هذا بهذا الموقف أبدا أيها الناس إن دماءكم وأموالكم عليكم حرام الى ان تلقوا ربكم كحرمة يومكم هذا وكحرمة شهركم هذا وإنكم ستلقون ربكم فيسألكم عن أعمالكم وقد بلغت فمن كانت عنده أمانة فليؤدها الى من ائتمنه عليها وإن كل ربا موضوع ولكن لكم رءوس أموالكم لا تظلمون ولا تظلمون قضى الله أنه لا ربا وإن ربا عباس بن عبد المطلب موضوع كله وإن كل دم كان فى الجاهلية موضوع وإن أول دمائكم أضع دم ابن ربيعة بن الحارث بن عبد المطلب وكان مسترضعا فى بنى ليث فقتلته هذيل فهو اول ما أبدأ به من دماء الجاهلية أما بعد أيها الناس فإن الشيطان قد يئس من أن يعبد بأرضكم هذه أبدا ولكنه ان يطع فيما سوى ذلك فقد رضى به مما تحقرون من أعمالكم فاحذروه على دينكم أيها الناس إن النسىء زيادة فى الكفر يضل به

الذين كفروا يحلونه عاما ويحرمونه عاما ليواطئوا عدة ما حرم الله فيحلوا ما حرم الله ويحرموا ما أحل الله وإن الزمان قد استدار كهيئته يوم خلق الله السموات والأرض وإن عدة الشهور عند الله اثنا عشر شهرا منها أربعة حرم ثلاثة متوالية ورجب مضر الذى بين جمادى وشعبان أما بعد أيها الناس فإن لكم على نسائكم حقا ولهن عليكم حقا لكم عليهن أن لا يوطئن فرشكم احدا تكرهونه وعليهن ان لا يأتين بفاحشة مبينة فإن فعلن فإن الله قد أذن لكم أن تهجروهن فى المضاجع وتضربوهن ضربا غير مبرح فإن انتهين فلهن رزقهن وكسوتهن بالمعروف واستوصوا بالنساء خيرا فإنهن عندكم عوان لا يملكن لأنفسهن شيئا وإنكم إنما أخذتموهن بأمانة الله واستحللتم فروجهن بكلمات الله فاعقلوا أيها الناس قولى فإنى قد بلغت وقد تركت فيكم ما إن اعتصمتم به فلن تضلوا أبدا أمرا بينا كتاب الله وسنة نبيه أيها الناس اسمعوا قولى واعقلوه تعلمن أن كل مسلم أخ للمسلم وأن المسلمين إخوة فلا يحل لامرىء من أخيه إلا ما أعطاه عن طيب نفس منه فلا تظلمن أنفسكم اللهم هل بلغت فذكر لى أن الناس قالوا اللهم نعم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم اللهم اشهد)) [1]

''لوگو میری بات سنو! کیونکہ میں نہیں جانتا، شاید اس سال کے بعد اس مقام پر میں تم سے کبھی نہ مل سکوں۔ تمہارا خون اور تمہارا مال ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہے جس طرح تمہارے آج کے دن کی رواں مہینے کی اور موجودہ شہر کی حرمت ہے۔ سن لو! جاہلیت کی ہر چیز میرے پاؤں تلے روندی گئی، جاہلیت کے خون بھی ختم کر دیے گئے اور ہمارے خون میں سے پہلا خون جسے میں ختم کر رہا ہوں وہ ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون ہے۔ یہ بچہ بنو سعد میں دودھ پی رہا تھا کہ انہیں ایام میں قبیلہ ہذیل نے اسے قتل کر دیا تھا۔ اور جاہلیت کا سود ختم کر دیا گیا اور ہمارے سود میں سے پہلا سود جسے میں ختم کر رہا ہوں وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے اب یہ تمام کا تمام سود ختم ہے۔

ہاں! عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کیوں کہ تم نے انہیں اللہ کی امانت کے ساتھ لیا ہے اور اللہ کے کلمے کے ذریعے حلال کیا ہے۔ ان پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جو تمہیں گوارہ نہیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو تم انہیں مار سکتے ہو۔ لیکن سخت مار نہ مارنا۔ اور تم پر ان کا حق یہ ہے کہ تم انہیں معروف کے ساتھ کھلاؤ اور پہناؤ۔

[1] بخاری، کتاب المناسک، باب الخطبۃ ایام منی

اور میں تم میں ایسی چیزیں چھوڑے جارہاہوں اگر تم نے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھاتواس کے بعد تم ہر گز گمراہ نہ ہو گے۔اور وہ ہے اللہ کی کتاب۔اوراس کے نبی کی سنت۔

اور تم سے میرے متعلق پوچھاجانے والاہے۔توتم لوگ کیا کہوگے ؟صحابہ نے کہاہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے تبلیغ کر دی پیغام پہنچادیااور خیر خواہی کاحق اداکر دیا۔

یہ سن کر آپ ﷺ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھائی اورلوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا:

''اے اللہ گواہ رہنا۔''

آپ کے اس خطبہ مبارکہ کو حضرت ربیعہ بن امیہ بن خلف اپنی بلند آواز سے لوگوں تک پہنچارہے تھے۔جب آپ خطبہ سے فارغ ہوئے تویہ آیت نازل ہوئی:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾[1]

(آج میں نے تمہارے لیے تمہارادین مکمل کر دیااور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو بطورِ دین تمہارے لیے پسند کر لیا۔)

حضرت عمر یہ آیت سن کر رونے لگے لوگوں نے وجہ پوچھی توفرمانے لگے کہ کمال کے بعد زوال ہی توہے۔

خطبہ حجۃ الوداع انسانی تاریخ میں حقوقِ انسانیت، حقوق نسواں اور تحفظ عالم انسانیت کاسب سے بڑاایکٹ اورسب سے بڑا ابل اور چارٹ ہے۔ جس کی تمام دفعات عالمی امن کی ضمانت فراہم کرتی ہیں۔اور نبی ﷺ کی دعوت کی ایک روشن اور زندہ مثال ہیں۔نبی ﷺ نے یہ خطبہ ایک بڑے اہم موقع پراور بڑی اہم جگہ اور بڑے اہم لوگوں کے ایک جم غفیر کے اندرارشاد فرمایا اس کاایک ایک لفظ انتہائی قیمتی اور آب زر کے ساتھ لکھنے کے قابل ہے۔

اس کی پہلی دفعہ کے اندر انسان کے جان ومال عزت وآبرو کی حفاظت پراس قدر زور دیا گیاہے اس کو تین حرمت والی چیزوں کے برابر قرار دے کر قیامت تک کے لیے اس کی حرمت واہمیت کا بندوبست کر دیا گیاہے۔انسانوں کے لیے جس طرح خانہ کعبہ کی حرمت، مکہ شہر کی حرمت، ذوالحجہ کے مہینے کی حرمت اور تعظیم لازم ہے اسی طرح مسلمان کے خون اورمال کی حرمت لازم ہے۔ سودی معیشت اور کاروبار انسانوں پر بہت بڑا ظلم ہے آپ نے ہمیشہ کے لیے اس کو حرام قرار دے کر انسانوں پر

---

1 سورۃ المائدۃ ۵: ۳

مہربانی فرمائی ہے۔

قدرتی، فطرتی، اسلامی، انسانی کیلنڈر کی حفاظت کا مکمل تحفظ کر دیا گیا ہے۔ تحفظ حقوق نسواں ایکٹ میں عورتوں کے تمام حقوق کی حفاظت کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

کتاب و سنت کے تمسک پر زور دے کر قیامت تک کے لیے ہدایت کا بندوبست اور گمراہی سے بچنے کا راستہ اور فرقہ واریت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ **المسلم اخو المسلم** فرما کر اسلامی بھائی چارے کے فروغ پر زور دیا گیا ہے۔ آپ نے ساٹھ ہزار افراد سے اپنے منہج و دعوت کی کامیابی کے ساتھ تبلیغ پر شہادت لے کر اللہ کو اس پر گواہ بنا کر اپنے فریضے کی تکمیل فرما کر اپنے آپ کو سرخرو کیا ہے۔ جو کہ ایک کامیاب داعی کی نشانی ہے۔

دنیا بھر کے تمام مذاہب اور انسان اس جیسی تعلیم پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ جو کہ اسلام کی سچائی کی ایک معجزانہ دلیل ہے۔

داعی اعظم، مبلغ اعظم، خطیب اعظم، نبی محترم، ختم المرسلین، سید الاوّلین والآخرین، ایسے جمال خلق اور کمال خُلق سے متصف تھے جو حیطۂ بیان سے باہر ہے اس جمال و کمال کی تاثیر یہ تھی کہ دل آپ کی تعظیم و قدر و منزلت کے جذبات سے خود بخود لبریز ہو جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کی حفاظت اور جلال و تکریم میں لوگوں نے ایسی ایسی فداکاری و جانثاری کا ثبوت دیا جس کی نظیر کسی دنیا کی اور شخصیت کے لیے پیش نہیں کی جاسکتی۔ آپ کے رفقاء اور ہم نشین ایک جنون و مستی کی حد تک آپ سے محبت کرتے تھے۔ انہیں گوارہ نہ تھا کہ انہیں خراش تک آجائے۔ خواہ اس کے لیے ان کی گردنیں ہی کیوں نہ کاٹ دی جائیں۔ اس طرح کی محبت کی وجہ یہی تھی کہ عادتاً جن کمالات پر جان چھڑکی جاتی ہے، ان کمالات سے جس قدر حصہ وافر آپ کو عطاء ہوا تھا کسی اور انسان کو نہ ملا۔ ذیل میں ان روایات کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔ جن کا تعلق آپ کے جمال و کمال سے ہے۔ [1]

"زاد المعاد" میں علامہ ابن قیم الجوزی "ام معبد خزاعیہ" کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے جب ہجرت کے وقت آپ ﷺ اور حضرت ابو بکر (دوران سفر ام معبد کے خیمے سے گزرے تھے۔ کتب سیرت میں اس سے بڑھ کر اور کوئی روایت نہیں جو آپ کے حلیہ مبارک کو اتنی تفصیل اور گہرائی کے ساتھ بیان کرتی ہو)

ام معبد کا خاوند اس وقت گھر پر نہیں تھا جب آپ ﷺ کا وہاں پر ظہور ہوا۔ جب وہ گھر آیا اس نے گھر میں ایک عجیب تسکین اور خوشبو محسوس کی تو اس نے ام معبد سے پوچھا کہ اے ام معبد! آج مجھے گھر کا منظر کچھ پہلے سے مختلف دکھائی دے رہا ہے اس

1 بخاری، باب مرض النبی ﷺ و باب آخر ما تکلم النبی ﷺ۔

کی کیا وجہ ہے؟ام معبد آپ ﷺ کے متعلق بتاتی ہیں کہ ایک مسافر آیا تھا:

"چودھویں کے چاند کی طرح چمکتا ہوا روشن چہرہ دیکھنے کو انتہائی خوبصورت، نہ توندے پن کا عیب نہ گنجے پن کی خامی، جمال جہاں، تاب کے ساتھ ڈھلا ہوا پیکر، سرمگیں آنکھیں، لمبی پلکیں، بھاری آواز، لمبی گردن، سفید وسیاہ آنکھیں، پلکیں۔ باریک اور باہم ملے ہوئے ابرو، چمکدار گھنگریالے کالے بال، خاموش ہوں تو باوقار، گفتگو کریں تو پرکشش، دور سے دیکھنے میں سب سے زیادہ تابناک و پر جمال، قریب سے سب سے خوبصورت، اور شیریں، گفتگو میں مٹھاس، بات واضح اور دوٹوک، نہ مختصر نہ فضول، انداز ایسا کہ گویا لڑی سے موتی جھڑ رہے ہیں، درمیانہ قد، نہ اتنا زیادہ پست کہ نگاہ میں نہ جچے نہ لمبا کہ ناگوار لگے دو شاخوں کے درمیان ایسی شاخ کی طرح ہیں جو سب سے زیادہ تازہ وخوش منظر ہو۔ رفقاء آپ کے گرد حلقہ بنائے ہوئے کچھ فرمائیں تو توجہ سے سُنیں۔ کوئی حکم دیں تو لپک کر بجالاتے ہیں۔ مطاع ومکرم، ترش رو، نہ لغو گو۔[1]

حضرت جابر بن سمرہ بیان کرتے ہیں آپ نے میرے رخسار پر ہاتھ پھیرا تو میں نے آپ کے ہاتھ میں ایسی ٹھنڈک اور خوشبو دیکھی گویا آپ نے اسے عطار کے عطر دان سے نکالا ہے۔ حضرت انس کا بیان ہے کہ آپ کا پسینہ گویا کہ کستوری ہوتا تھا اور حضرت ام سلیم کہتی ہیں کہ آپ کا پسینہ ہی سب سے عمدہ خوشبو ہوا کرتی تھی۔

حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک بار چاندنی رات میں آپ کو دیکھا آپ پر سرخ جوڑا تھا میں کبھی رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا کبھی چاند کو دیکھتا آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ آپ زیادہ خوبصورت ہیں۔[2]

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز نہیں دیکھی لگتا تھا، سورج آپ کے چہرے میں رواں دواں ہے۔[3]

نبی ﷺ فصاحت و بلاغت میں ممتاز تھے آپ ﷺ طبیعت کی روانی لفظ کے نکھار فقروں کی جزالت معانی کی صحت اور تکلف سے دوری کے ساتھ ساتھ جوامع الکلم سے نوازے گئے تھے۔ آپ ﷺ کو نادر حکمتوں اور عرب کی تمام زبانوں کا علم عطاء ہوا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ ہر قبیلے سے اسی کی زبان اور محاوروں میں گفتگو فرماتے تھے اور آپ ﷺ میں بدویوں کا زور بیان اور قوت تخاطب اور شہریوں کی شستگی الفاظ اور شفتگی وشائستگی جمع تھی، اور وحی پر مبنی تائید ونصرت الگ سے آپ ﷺ

---

1 ابن قیم، زاد المعاد فی ہدیۃ خیر العباد، ج ۲، ص ۵۴۱، التبریزی، مشکاۃ المصابیح باب مناقب سید المرسلین

2 الترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن (م ۲۷۹ھ)، مختصر الشمائل محمدیہ، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ ﷺ

3 الترمذی، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ ﷺ

کے ساتھ تھی۔

بردباری، قوت برداشت، قدرت کے باوجود درگزر اور مشکلات پر صبر ایسے اوصاف تھے جن کے ساتھ اللہ نے آپ ﷺ کی تربیت کی ہوئی تھی، نبی ﷺ کی بلندئ کردار کا عالم یہ تھا کہ آپ کے خلاف دشمنوں کی ایذارسانی اور بدمعاشوں کی بدمعاشی جس قدر بڑھتی گئی آپ کے صبر و حلم میں اسی قدر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب بھی دو کاموں کے درمیان اختیار دیا گیا تو آپ نے ہمیشہ آسانی کو اختیار فرمایا جبکہ اس میں گناہ نہ ہوتا۔ آپ ﷺ نے کبھی اپنے نفس کے لیے کسی سے انتقام نہ لیا۔ البتہ اگر اللہ کی حد توڑی جاتی تو آپ اس کا انتقام ضرور لیتے۔[1]

آپ ﷺ سب سے زیادہ بڑھ کر غیظ و غضب سے دور تھے۔ اور سب سے جلدی راضی ہو جاتے تھے۔ جود و کرم کا وصف ایسا تھا کہ اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا، آپ اس شخص کی طرح بخشیش و نوازش فرماتے جسے فقر کا اندیشہ ہی نہ رہے۔ حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ نبی ﷺ سب سے بڑھ کر پیکر جود و سخا تھے۔ اور آپ ﷺ کا دریا جود و سخا رمضان المبارک میں اس قدر زیادہ پرجوش ہوتا کہ حضرت جبریل آپ ﷺ سے ملاقات فرماتے۔ حضرت جبریل رمضان میں ہر رات آپ سے ملاقات فرماتے، آپ ﷺ سے قرآن مجید کا دور کرتے۔ رمضان میں آپ ﷺ تیز ترین آندھی سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ سخاوت کرتے، جابرؓ فرماتے ہیں ایسا کبھی نہ ہوا کہ آپ ﷺ سے کسی نے مانگا ہو اور آپ ﷺ نے نہیں دیا ہو۔

شجاعت بہادری اور دلیری میں بھی آپ ﷺ کا مقام سب سے زیادہ بلند اور معروف تھا، آپ ﷺ سب سے زیادہ دلیر تھے۔ نہایت کٹھن اور مشکل حالات میں جب اچھے اچھے اور بڑے بڑے بہادروں کے قدم اُکھڑ جاتے۔ آپ ﷺ اپنی جگہ برقرار رہتے۔ اور پسپا ہونے کی بجائے آگے ہی بڑھتے چلے جاتے۔ پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آتی۔ بڑے بڑے بہادر کئی دفعہ بھاگے۔ اور پسپا ہوئے۔ مگر آپ ﷺ میں یہ بات کبھی نہیں پائی گئی۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ جب زور کا رن پڑتا اور جنگ کے شعلے خوب بڑھک اُٹھتے تو ہم رسول اللہ ﷺ کی آڑ لیا کرتے تھے، آپ ﷺ سے بڑھ کر کوئی شخص زیادہ دشمن کے قریب نہ ہوتا، حضرت انس کا بیان ہے ایک رات مدینہ کو خطرہ محسوس ہوا لوگ شور کی طرف دوڑے تو راستے میں رسول اللہ واپس آتے ہوئے ملے آپ ﷺ لوگوں سے پہلے ہی خطرے کا جائزہ لے چکے تھے، آپ ﷺ گھوڑے کے زین پر سوار تھے اور تلوار گردن میں حمائل کیے ہوئے تھے۔ آپ لوگوں کو تسلی دے رہے تھے ڈرو نہیں کوئی خطرہ نہیں۔

---

1 البخاری، کتاب الحدود، باب کم التعزیر والادب، رقم الحدیث : ۶۸۵۳

آپ ﷺ سب سے زیادہ حیادار اور پست نگاہ تھے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ پردہ نشین کنواری عورت سے بھی زیادہ حیادار تھے۔ آپ ﷺ کو جب کوئی بات ناگوار گزرتی تو چہرے سے ہی پتا چل جاتا تھا۔ اپنی نظریں کسی کے چہرے پر گاڑھتے نہیں تھے۔ اپنے نگاہیں ہمیشہ پست رکھتے۔ حیااور کرم کا عالم یہ تھا کہ کسی سے ناگوار بات کبھی نہ کرتے۔

آپ ﷺ سب سے زیادہ عادل، پاک دامن، صادق الہجہ اور عظیم الامانۃ تھے۔ اس کا اعتراف آپ ﷺ کے دشمن اور دوستوں سب کو ہے۔ نبوت سے قبل آپ ﷺ کو امین اور صادق مانا جاتا تھا۔ لوگ آپ ﷺ سے فیصلے کرواتے تھے۔ ابو جہل نے کہا تھا کہ ہم آپ ﷺ کو جھوٹا نہیں کہتے لیکن جو بات آپ ﷺ لے کر آئے ہو اس کا انکار کرتے ہیں۔[1]

آپ ﷺ صحابہ کو اپنی آمد پر کھڑا ہونے سے منع کرتے۔ مسکینوں کی مدد کرتے، فقراء کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ غلام کی دعوت قبول کرتے تھے۔ صحابہ میں بغیر کسی امتیاز کے اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ اپنے جوتے خود گانٹھتے تھے۔ اپنے کپڑے خود سیتے تھے۔ اپنا کام کو داپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔[2]

آپ ﷺ سب سے زیادہ عہد کی پابندی اور صلہ رحمی فرماتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ بہت زیادہ شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ رہائش اور ادب میں سب سے اچھے تھے۔ اخلاق میں سب سے بلند تھے۔ بد اخلاقی سے بہت دور تھے۔ کسی کی برائی نہ کرتے اور نہ ہی کسی کی چغلی کھاتے۔ برائی کا بدلہ اچھائی سے دیتے تھے۔ بلکہ معافی اور در گزر سے کام لیتے تھے۔ کسی کو اپنے پیچھے چلتا ہوا نہ چھوڑتے تھے۔ کھانے پینے میں اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں برابری کرتے تھے۔ کبھی اپنے خادم کو اُف تک نہ کہتے تھے۔ کبھی کام نہ کرنے کی وجہ سے سزا نہ دیتے تھے۔ مسکینوں سے محبت کرتے جنازوں میں حاضر ہوتے تھے۔ کسی فقیر کو اس کی غربت کی وجہ سے کمتر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک سفر میں آپ ﷺ نے اپنے ذمہ ایندھن اکٹھا کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور فرمایا کہ میں آپ ﷺ پر برتری اور ممتاز کو پسند نہیں کرتا ہوں۔

آپ ﷺ صحابہ کی خبر گیری کرتے۔ اچھی چیز کی تعریف کرتے اور بری چیز کو ناپسند کرتے۔ افراط و تفریط سے دور تھے۔ آپ ﷺ کے نزدیک سب سے اچھا وہ آدمی تھا جو سب سے زیادہ خیر خواہ ہو۔ آپ ﷺ اُٹھتے بیٹھتے اللہ کا ذکر فرماتے۔ اس کے لیے کوئی جگہ مخصوص نہ کرتے، آپ ﷺ کسی مجلس میں جاتے جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے، تمام اہل مجلس پر برابر توجہ فرماتے، حتیٰ کہ کوئی شخص یہ محسوس نہ کرتا کہ کوئی شخص آپ ﷺ کے نزدیک اس سے زیادہ باعزت ہے۔ کوئی ضرورت

---

1 ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، باب من سورۃ الانعام: ۳۰۶۴

2 ابن حنبل، المسند، ج۶، ص۱۶۷۔ مسند عائشہؓ، رقم الحدیث: ۲۵۳۹۵

مند آپ ﷺ کے پاس آتا تو آپ ﷺ صبر کے ساتھ اس کے لیے رکے رہتے تھے۔ آپ ﷺ سے کوئی سوال کرتا تو آپ ضرور عطاء فرماتے۔ آپ ﷺ نے اپنی خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے سب کو نوازا۔ آپ ﷺ کے نزدیک تمام لوگ برابر کے حقوق رکھتے تھے۔ اگر کسی کو فضیلت تھی تو تقویٰ کی بنیاد پر۔ آپ ﷺ کی مجلس حلم وحیاء اور صبر وامانت کی مجلس ہوتی تھی۔ اس میں آوازیں بلند نہ ہوتی تھیں اور نہ حرمتیں پامال کی جاتی تھیں۔ کسی کو اپنی بے عزتی کا اندیشہ نہ تھا۔ لوگ تقویٰ کی بدولت باہم محبت وہمدردی رکھتے تھے۔ بڑے کا احترام کرتے چھوٹے پر رحم کرتے تھے۔ حاجت مندوں کو نوازتے اور اجنبی کو انس عطاء کرتے۔

آپ ﷺ کے چہرے پر ہمیشہ بشاشت رہتی۔ سہل خو اور نرم پہلو تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے نفس کو تین باتوں سے۔ محفوظ رکھا ریاکاری سے۔ کسی چیز کی کثرت سے۔ اور لایعنی بات سے۔ اور لوگوں تین باتوں سے محفوظ رکھا، کسی کی مذمت نہیں کرتے تھے، کسی کو عار نہیں دلاتے تھے اور کسی کی عیب جوئی نہیں کرتے تھے۔ آپ ﷺ وہی بات زبان پر لاتے جس میں اجر وثواب کی اُمید ہوتی تھی۔ آپ ﷺ جب گفتگو کرتے تو آپ ﷺ کے صحابہ اس طرح باادب ہو کر سنتے گویا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ آپ ﷺ کی مجلس میں کوئی آدمی فضول بات کرنے کی ہمت نہ کرتا۔ آپ ﷺ بات کرنے والے کی بات کو پوری توجہ سے سنتے حتیٰ کہ وہ اپنی بات پوری کر لیتا۔ جس بات پر تمام لوگ ہنستے آپ ﷺ بھی اس پر ہنستے تھے۔ جس بات پر لوگ تعجب کرتے آپ ﷺ بھی اس بات پر تعجب کرتے۔ اگر کوئی اجنبی آدمی سخت کلامی کرتا تو آپ ﷺ صبر کرتے اور آپ ﷺ فرماتے: جب تم حاجت مندوں کو دیکھو تو ان کی حاجت کو پورا کرو اُسے ضرورت کی چیز عطا کرو۔ آپ ﷺ احسان کا بدلہ دیتے، کسی سے ثناء کی طلب نہ کرتے۔

حضرت خارجہ بن زید کا بیان ہے کہ آپ ﷺ اپنی مجلس میں سب سے زیادہ باوقار ہوتے اپنے پاؤں وغیرہ نہ پھیلاتے۔ بہت زیادہ خاموش رہتے۔ بلاضرورت ہرگز نہ بولتے۔ جو کوئی نامناسب بات کرتا آپ ﷺ اس سے رُخ پھیر لیتے۔ آپ ﷺ کی ہنسی مسکراہٹ تھی۔ اور گفتگو دو ٹوک کرتے فضول بات کبھی نہ کرتے۔ آپ ﷺ کے صحابہ کی ہنسی بھی مسکراہٹ کی حد تک ہی ہوتی تھی۔[1]

حاصل یہ کہ نبی ﷺ بے نظیر صفات کمال سے آراستہ تھے۔ آپ ﷺ کے رب نے آپ ﷺ کو بے نظیر اور بے مثال

---

[1] ترمذی، ابو عیسیٰ، محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ (م ھ) مختصر شمائل محمدیہ، ن، سعید ایچ ایم کمپنی پاکستان چوک کراچی، باب ماجاء فی ضحک رسول اللہ ﷺ

ادب سے نوازہ ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے خود آپ ﷺ کی تعریف میں قرآن نازل فرماتے ہوئے کہا:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ [1]

"بے شک آپ اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔"

یہ ایسی خوبیاں تھیں جن کی طرف لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں آپ کی محبت بیٹھ گئی۔ اور آپ کو قیادت کا وہ مقام حاصل ہوا کہ لوگ آپ پر وارفتہ ہو گئے۔ انہیں خوبیوں کے سبب آپ کی قوم کی اکڑ اور سختی میں نرمی آئی یہاں تک کہ یہ قوم فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو گئی۔ [2]

آپ کے کمالات اور اوصافِ حمیدہ کو کماحقہ بیان کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے یہ چند باتیں وہ بیان کی گئیں ہیں جو ہماری تحقیق سے متعلق ہیں۔ جو داعین، مبلغین اور مدعوین حضرات کے لیے راہنما اصولوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور عمل دعوت میں توشۂ حیات ہیں۔ جن سے یہ بات واضح طور پر اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ کسی بھی داعی کی دعوت کا انحصار اس کے شخصی کردار کی تاثیر پر منحصر ہے۔

خود آزمائی

1۔ دعوت نبوی کے مختلف مراحل بیان کریں۔

2۔ مکی عہد نبوت میں کون سے اہم مراکز دعوت تھے؟

3۔ رسول اکرم ﷺ کے سفر طائف کی تفصیلات قلم بند کریں۔

4۔ مکی عہد میں آپ ﷺ نے کن قبائل کو دعوت اسلام دی؟

5۔ صلح حدیبیہ کے دعوتی اثرات بیان کریں۔

6۔ رسول اللہ ﷺ کے دعوتی مکاتیب کے اہم نکات تحریر کریں۔

7۔ فتح مکہ کے دعوتی اثرات بیان کریں۔

8۔ خطبہ حجۃ الوداع میں بنیادی انسانی حقوق کے متعلق تحریر کریں۔

---

1 سورۃ القلم ۶۸ : ۴

2 سورۃ النصر ۱۱۰ : ۲

یونٹ نمبر 6

داعی اعظم ﷺ کا منہج دعوت حکمت عملی

تالیف

ڈاکٹر محمد سجاد

فہرست

صفحہ نمبر

یونٹ کا تعارف	231
یونٹ کے مقاصد	232
1۔ دعوت نبوی میں تدریج کی حکمت عملی	233
2۔ دعوت نبوی میں رفق ونرمی کا پہلو	234
3۔ دعوت نبوی میں یسر اور آسانی کا پہلو	236
4۔ دعوت نبوی میں ترغیب وترھیب (Motivation) کا پہلو	240
5۔ دعوت نبوی میں اختصار کا پہلو	243
6۔ عدم جبر واکراہ کا پہلو	244
7۔ دعوت میں روزمرہ واقعات ومشاہدات کا استعمال	245
8۔ دعوت نبوی ﷺ میں مخاطب کی نفسیات کا لحاظ (چند مثالیں)	246
8.1۔ انفرادی اختلاف کی رعایت	246
8.2۔ مخاطب کی استعداد کا لحاظ	249
8.3۔ مشترکہ نکات دعوت کی بنیاد	252
8.4۔ حفظ مراتب کا لحاظ	254
8.5۔ طریقہ تنبیہ وتادیب	256
9۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوتی حکمت عملی میں عملیت کا اتمام واکمال	257
خود آزمائی	261
ماخذ ومصادر	262

یونٹ کا تعارف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں انسانوں کے لیے زندگی گزارنے کا بہترین نمونہ ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں آپ ﷺ کی عملی مثال اور نمونہ موجود ہے۔ اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اسی نمونہ کے مطابق اپنا نظام زندگی استوار کریں۔ اسی بات کو قرآن مجید نے ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾[1]

(بے شک تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے)

آپ ﷺ کی دعوت کا بنیادی منشور قرآن تھا اور اس کی عملی تصویر اپنا کردار تھا۔ حضور اکرم ﷺ کا پیغام جس طرح اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی کی صورت میں نازل ہوا تھا۔ اسی طرح اس کے فروغ و اشاعت کا طریق کار بھی اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے بتایا جاتا ہے۔ سورۃ النحل میں فرمایا:

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾[2]

(آپ انہیں اپنے رب کی راہ کی طرف بلائیں حکمت عمدہ نصیحت اور احسن طریق سے بحث و تمحیص کے ذریعے)

اس آیت مبارکہ میں تبلیغ دین کے تین اصولوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ا۔ حکمت۔ ۲۔ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ یعنی عمدہ نصیحت ۳۔ احسن طریق سے بحث ۔ ان اُصول دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ نہایت پختہ اور اٹل مضامین مضبوط دلا ئل و براہین کی روشنی میں حکیمانہ انداز سے پیش کئے جائیں جنہیں سن کر فہم وادراک اور علمی ذوق رکھنے والا طبقہ گردن جھکا دے۔ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت استعداد اور حالات کو سمجھ کر موقع و محل کی مناسبت سے بات کی جائے۔ ہر قسم کے لوگوں کو ایک ہی لاٹھی سے نہ ہانکا جائے جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے اس کے مرض کی تشخیص کی جا ئے پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہیں۔ نہایت سنجیدہ طریقے سے مخاطب کی ذہنیت کا لحاظ رکھتے ہوئے دعوت دی جائے۔

1۔ سورۃ النحل ۱۶: ۱۲۵

2۔ سورۃ الأحزاب ۲۱: ۳۳

دعوت دین کے حوالے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت عملی کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ میں انسانی معاشرے کی بنیادی ضروریات کو پیش نظر رکھا۔آپ مبلغ بھی تھے اور لوگوں کے دنیوی امور میں راہنما بھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے سوچتے بھی تھے اور عملی طور پر فلاحی امور میں حصہ بھی لیتے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے دکھ درد میں ان کے برابر کے شریک تھے۔کسی کی معاشرتی ضرورت ہوتی تو اس کی تکمیل کی فکر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دامن گیر ہوتی اور اس کے لئے جس طرح بھی ہوتا اہتمام فرماتے۔اگر کوئی بیمار ہوتا تو اس کی عیادت کو تشریف لے جاتے،جنازوں میں شرکت فرماتے،لوگوں کے معاشرتی مسائل میں انھیں مشورے دیتے۔اقتصادی مسائل میں لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے راہنمائی لیتے۔اس طرح اس طریق تبلیغ میں پوری انسانی زندگی کا احاطہ کر دیا گیا تھا۔آپ ﷺ کی دعوت میں سب سے زیادہ کردار آپ ﷺ کے اخلاق عالیہ کا تھا۔آپ ﷺ کی ذات اقدس میں انسانیت کے لیے رحمت کمال درجے پر تھی کیوں کہ آپ تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر تشریف لائے۔صبر واستقامت،عفو و درگذر،شفقت و محبت،ہمدردی و حسن سلوک،خیر خواہی و صلہ رحمی اور انسانی نفسیات کے جملہ تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ ﷺ نے دعوت حق کو پیش کیا جس کے اثرات فوراً ظاہر ہونے لگے۔ایک داعی اپنی دعوت میں نبی کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ کو پیش نظر رکھے تاکہ اس کی دعوت موثر ہو سکے۔اس یونٹ میں منہج دعوت نبوی کی چند نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ دعوت نبوی ﷺ کا مطالعہ کر سکیں۔

2۔ دعوت نبوی ﷺ کے طریقہ کار کو جان سکیں۔

3۔ دعوت نبوی ﷺ میں انسانی نفسیات کے لحاظ کی رعایت کا مطالعہ کر سکیں۔

4۔ دعوت نبوی ﷺ میں اخلاق حسنہ کے پہلوؤں کے اثرات جان سکیں۔

1۔دعوت نبوی میں تدریج کی حکمت عملی

تبلیغ ودعوت کی جڑیں س وقت تک مضبوط نہیں ہو تیں اوراس کی شاخیں پھیل کر پھل نہیں دیتیں جب تک اس کی اساس پختہ دلیل پر قائم نہ ہو اور داعی حق اپنی دعوت کو عام کرنے کے لیے ہر دانش مندانہ اور خوبصورت ادبی اسلوب نہ اپنالے۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت میں ایسے اوصاف تھے جو عقل کو قبولیت پر آمادہ کر دیتے۔آپ ﷺ پیام حق کی اشاعت کے لیے ایسے طریقے اپناتے تھے جو یقینی کامیابی کے ضامن ہوتے۔ موقع کے مطابق گفتگو فرماتے۔ ہر قبیلے سے ان کی ذہنی سطح سے ہم آہنگ ہو کر کلام کرتے۔کتب سیرت واحادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ دعوت و تبلیغ میں مخاطبین کی ذہنی وجسمانی طاقت ان کی فطری صلاحیت ان کے مزاج وطبیعت کو مد نظر رکھتے۔ دعوت کے انہی حکیمانہ اسالیب کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

رسول اللہ ﷺ نے دعوت و تبلیغ میں تدریج کا لحاظ رکھا اور دوسرے مبلغین اسلام کو بھی اصولِ تدریج کی تلقین فرمائی۔ حکمتِ تبلیغ کے ضمن میں داعی کا فرض ہے کہ تدریج کے پہلو کو نظرانداز نہ کرے۔تدریج کا مطلب یہ ہے کہ داعی ایک ہی بار شریعت کے تمام احکامات کا بوجھ مخاطب کی گردن پر نہ لاد دے بلکہ آہستہ آہستہ اس کے سامنے سارے احکام پیش کرے۔تدریج کا یہ اصول فرد اور قوم دونوں کے لیے ضروری ہے۔دین ایک نظام ہے اور اس نظام کو اگر حکیمانہ ترتیب سے پیش نہ کیا جائے تو مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔اسی حقیقت کی طرف ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ۔

" إِنَّمَا نَزَلَ أَوَّلَ مَا نَزَلَ مِنْهُ سُورَةٌ مِنَ الْمُفَصَّلِ فِيهَا ذِكْرُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ حَتَّى إِذَا ثَابَ النَّاسُ إِلَى الْإِسْلَامِ نَزَلَ الْحَلَالُ وَالْحَرَامُ وَلَوْ نَزَلَ أَوَّلَ شَيْءٍ لَا تَشْرَبُوا الْخَمْرَ لَقَالُوا لَا نَدَعُ الْخَمْرَ أَبَدًا وَلَوْ نَزَلَ لَا تَزْنُوا لَقَالُوا لَا نَدَعُ الزِّنَا أَبَدًا "[1]

' قرآن میں سب سے پہلے جو چیز نازل کی گئی وہ مفصل کی سورتوں میں سے ایک سورۃ ہے، جس میں جنت اور جہنم کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کے دائرے میں آگئے تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔اگر بالکل شروع ہی میں حکم آجاتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم ہر گز نہ چھوڑیں گے اور اگر یہ حکم دیا جاتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے ہم

1۔ البخاری، الجامع الصحیح کِتَاب فَضَائِلِ الْقُرْآنِ بَاب تَأْلِيفِ الْقُرْآنِ

ہر گز نا نہ چھوڑیں گے"۔

اس دعوتی اصول کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن دعوت و تبلیغ کے لیے بھیجا تو ان الفاظ میں تلقین فرمائی:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ مُعَاذًا قَالَ بَعَثَنِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّكَ تَأْتِي قَوْمًا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ فَادْعُهُمْ إِلَى شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللّٰهِ فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوا لِذَلِكَ فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِي كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوا لِذَلِكَ فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ فِي فُقَرَائِهِمْ فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوا لِذَلِكَ فَإِيَّاكَ وَكَرَائِمَ أَمْوَالِهِمْ وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللّٰهِ [1]

"تم عنقریب اہلِ کتاب کی ایک قوم کے پاس پہنچو گے۔ جب تو ان کے پاس پہنچے تو سب سے پہلے انہیں یہ دعوت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ جب وہ اس میں تیری اطاعت کر لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان پر دن رات کی پانچ نمازیں فرض کی ہیں اور جب وہ تیری یہ بات مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے صدقہ فرض کیا ہے۔ یہ صدقہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دیا جائے گا اور جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو دیکھو چن چن کر ان کا عمدہ مال نہ لے لینا اور ہاں مظلوم کی بد دعا سے ڈرتے رہنا کیوں کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں"۔

2۔ دعوت نبوی ﷺ میں رفق و نرمی کا پہلو

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو اپنے بدترین مخالفین سے بھی نرم انداز میں گفتگو کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ و ہارون علیہما السلام کو فرعون جیسے باغی کے سامنے پیغامِ ربانی لے کر جانے کا حکم دیا تو یہ ہدایت بھی فرمائی:

﴿اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾ [2]

---

1 ۔ مسلم، الجامع الصحیح، كِتَابُ الْإِيمَانِ بَابُ الدُّعَاءِ إِلَى الشَّهَادَتَيْنِ وَشَرَائِعِ الْإِسْلَامِ

2۔ سورۃ طٰہٰ ۲۰: ۴۳، ۴۴

(تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اس نے سرکشی کی ہے تو اس سے نرم گفتگو کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا (اللہ سے ڈرے)۔

دعوت و تبلیغ میں رفق و نرمی کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی کہ نہ انبیاء سے بہتر کوئی داعی ہو سکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی سرکش اور باغی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسے مجرم کے سامنے وعظ و نصیحت کرتے وقت نرمی اختیار کرنے کا حکم ہے تو عام مجرم اور گمراہ لوگوں سے تو کہیں بڑھ کر نرمی اختیار کرنی چاہئے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مبلغ صحابہ کرامؓ کو ہمیشہ نرمی اختیار کرنے کا حکم فرمایا۔ حضرت طفیلؓ بن عمرو نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنی ہی قوم کی طرف مبلغ بنا کر بھیجا۔ چنانچہ وہ لوگوں کو مسلسل دعوت دیتے رہے لیکن قوم انکار کرتی رہی۔ بالآخر وہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ قبیلہ دوس نے مجھے ہرا دیا۔ میں نے ان کو بہت دعوت دی لیکن وہ ایمان نہیں لائے۔ آپ ان کے لیے بد دعا کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے بد دعا کرنے کی بجائے قبیلہ دوس کے لیے یہ دعا فرمائی:

اللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا وَأْتِ بِهِمْ [1]، ارْجِعْ إِلَى قَوْمِكَ فَادْعُهُمْ وَارْفُقْ بِهِمْ [2]

"اے اللہ دوس کو ہدایت عطا فرما (طفیلؓ بن عمرو سے فرمایا) تم اپنی قوم کی طرف لوٹ جاؤ ان کو دعوت دیتے رہو لیکن ان کے ساتھ نرمی اختیار کرو"۔

چنانچہ مأخذ سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے تعلیم کردہ اسلوب کو اختیار کرنے کا نتیجہ انتہائی شاندار نکلا۔ کثیر لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ سات ہجری میں حضرت طفیلؓ بن عمرو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے ساتھ قبیلہ دوس کے ستر یا اسی گھرانوں کے لوگ تھے۔ [3]

رسول اللہ ﷺ نے عمروؓ بن مرہ جہنی کو اپنے قبیلہ کی طرف دعوت دینے کے لیے بھیجا تو ان کو دعوت و تبلیغ کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

عَلَيْكَ بِالرِّفْقِ وَالْقَوْلِ السَّدِيدِ،وَلَا تَكُنْ فَظًّا،وَلَا مُتَكَبِّرًا وَلَا حَسُودًا ".فَذَكَرَ أَنَّهُ أَتَى قَوْمَهُ،

1۔ البخاری کِتَاب الْجِهَادِ وَالسِّيَرِ بَاب الدُّعَاءِ لِلْمُشْرِكِينَ بِالْهُدَى لِيَتَأَلَّفَهُمْ

2۔ ابن هشام السيرة النبوية قِصَّةُ إِسْلَامِ الطُّفَيْلِ بْنِ عَمْرٍو الدَّوْسِيِّ

3۔ ابن ہشام، قصۃ اسلام الطفیلؓ بن عمرو الدوسی، ۱/۴۲۳ و اسد الغابہ، تذکرہ طفیلؓ بن عمرو، ۳/۵۵

فَدَعَاهُمْ إِلَى مَا دَعَاهُ إِلَيْهِ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فأسلموا۔[1]

"نرمی سے پیش آنا، صحیح اور سچی بات کرنا، سخت کلامی اور بد خلقی سے پیش نہ آنا، تکبر اور حسد نہ کرنا"۔

دعوت و تبلیغ میں حسنِ اخلاق اور نرمی کا اسلوب کس قدر موثر ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو دعوت و تبلیغ کے لیے یمن روانہ فرمایا، حضرت خالدؓ بن ولید نے بعض لوگوں کے ساتھ سختی کی جس کی وجہ سے چھ ماہ مسلسل کوشش کے باوجود بھی لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو واپس بلالیا اور حضرت علیؓ کو بطور مبلغ روانہ فرمایا۔ ابن اثیر کا بیان ہے:

بعث رسول الله عليا إلى اليمن وقد كان أرسل قبله خالد بن الوليد إليهم يدعوهم إلى الإسلام فلم يجيبوه فأرسل عليا وأمره أن يعقل خالدا ومن شاء من أصحابه ففعل وقرأ على كتاب رسول الله على أهل اليمن فأسلمت همدان كلها في يوم واحد۔[2]

"رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو یمن بھیجا اور ان سے قبل آپ ﷺ خالدؓ بن ولید کو یمن دعوت و تبلیغ کے لیے بھیج چکے تھے لیکن ان لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو روانہ کرتے وقت نصیحت کی کہ وہ خالدؓ اور ان کے اصحاب کی وجہ سے (اہلِ یمن کے ساتھ) ہونے والی بد سلوکی اور نقصان کا تاوان ادا کریں (ان لوگوں سے نرمی کریں) چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کا خط پڑھ کر سنایا تو قبیلۂ ہمدان سارے کا سارا ایک ہی دن میں مسلمان ہو گیا"۔

وہ لوگ جو چھ ماہ سے قبولِ اسلام سے انکاری تھے جب ان کے ساتھ نرمی کا اسلوب اختیار کیا گیا تو انہوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔

3۔ دعوت نبوی ﷺ میں یسر و آسانی کا پہلو

دعوتِ دین میں آسانی اور سہولت کو پیشِ نظر رکھنا، دین کو درشت اور مشکل نہ بنانا، اس کی قبولیت کا اہم ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے عام مسلمانوں کے لیے اور دعوت دین میں آسانی اور سہولت کے پہلو کو پیش

1۔ ابن كثير، ابو الفداء اسماعيل ابنِ عمر، "البداية والنهاية"، ۳۵۱/۲

2۔ ابن اثیر، ابو الحسن علی بن ابی الکرم، "الکامل فی التاریخ"، دار الکتب العربی، بیروت، ۱۹۶۷ء، ۲۰۵/۲

نظر رکھا۔ حضرت عائشہؓ رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل کے متعلق ارشاد فرماتی ہیں:

مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ أَمْرَيْنِ قَطُّ إِلَّا أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا مَا لَمْ يَكُنْ إِثْمًا فَإِنْ كَانَ إِثْمًا كَانَ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ وَمَا انْتَقَمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهِ فِي شَيْءٍ قَطُّ إِلَّا أَنْ تُنْتَهَكَ حُرْمَةُ اللَّهِ فَيَنْتَقِمَ بِهَا لِلَّهِ[1]

"رسول اللہ ﷺ کو کبھی دو امور میں اختیار نہیں دیا گیا مگر یہ کہ آپ ﷺ نے ان میں سے آسان کو اختیار کیا بشرطیکہ اس میں گناہ نہ ہوا گر گناہ ہو تو اس سے تمام انسانوں سے زیادہ دور ہوتے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا مگر جبکہ اللہ کی حرمت مجروح ہو تو پھر آپ ﷺ اللہ کے لیے انتقام لیتے"۔

انسان طبعاً سہولت پسند ہے اس لیے داعی کا فرض ہے کہ وہ دین کو مشکلات کا مجموعہ نہ بنائے بلکہ جہاں تک ممکن ہو دینی زندگی کو لوگوں کے لیے آسان بنا کر پیش کرے۔ دینی معاملات میں تشدد پسندی اور سختی سے حتی الوسع پرہیز کرے اور اگر کسی سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو جو حل سب سے آسان ہو اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل سے اس کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: دَخَلَ أَعْرَابِيٌّ الْمَسْجِدَ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ، فَصَلَّى، فَلَمَّا فَرَغَ، قَالَ: اللَّهُمَّ ارْحَمْنِي وَمُحَمَّدًا وَلاَ تَرْحَمْ مَعَنَا أَحَدًا، فَالْتَفَتَ إِلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا، فَلَمْ يَلْبَثْ أَنْ بَالَ فِي الْمَسْجِدِ، فَأَسْرَعَ إِلَيْهِ النَّاسُ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَهْرِيقُوا عَلَيْهِ سَجْلاً مِنْ مَاءٍ، أَوْ دَلْوًا مِنْ مَاءٍ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ۔[2]

"ایک دیہاتی مسجد میں آیا اس نے دو رکعتیں ادا کیں پھر کہنے لگا: اے اللہ مجھ پر اور محمد پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی اور پر نہ فرما۔ رسول اللہ ﷺ نے توجہ فرمائی اور فرمایا: تو نے وسیع چیز کو تنگ کر دیا۔ پھر اس نے جلدی سے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ لوگ اس کی طرف (مارنے کی خاطر) دوڑے تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہیں آسانی کرنے والا بنایا گیا ہے۔ مشکل

1۔ البخاری، كِتَاب الْأَدَبِ بَاب قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَكَانَ يُحِبُّ التَّخْفِيفَ وَالْيُسْرَ عَلَى النَّاسِ

2۔ الترمذی، ابْوَابُ الطَّهَارَةِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَابُ مَا جَاءَ فِي الْبَوْلِ يُصِيبُ الْأَرْضَ

پسند نہیں۔اس پر پانی کا ایک ڈول بہادو"

جہالت یا عدم واقفیت ایک مرض ہے۔اسے ایک قسم کی معذوری سمجھ کر ازالے کی کوشش کرنا ہی انسانیت کی خدمت ہے۔ لیکن اس سے اظہارِ نفرت و انتقام گویا اس کی اصلاح کے تمام راستے بند کرنے والی بات ہے۔اسی لیے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ: «خَيْرُ دِينِكُمْ أَيْسَرُهُ [1]

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارا دین آسان ہے اور اچھی عبادت دینی بصیرت حاصل کرنا ہے"۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو یمن میں دعوتی مہم پر روانہ فرمایا توان کو اسی اسلوبِ دعوت کی تلقین ان الفاظ میں فرمائی:

يَسِّرا ولا تُعَسِّرا، وبشِّرا ولا تُنَفِّرا۔ [2]

"دین کو آسان بنا کر پیش کرنا سخت بنا کر پیش نہ کرنا، لوگوں کو خوشخبری سنانا نفرت نہ دلانا"

صحابہ کرامؓ نے اگر کبھی دینی معاملات میں اعتدال سے ہٹ کر تشدد کی راہ اپنائی تو آپ ﷺ نے انتہائی سختی سے منع فرمایا۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ حضرت معاذؓ بن جبل نے ایک مرتبہ انصار کو نمازِ مغرب پڑھائی اور قرأت کو خوب طول دیا۔ حضرت حرام انصاریؓ نہ ٹھہر سکے اور اپنی علیحدہ نماز پڑھ کر چل دیے۔ حضرت معاذؓ بن جبل ان سے سخت ناراض ہوئے۔ حضرت حرامؓ بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ معاذؓ ہمیں بہت طویل نماز پڑھاتے ہیں۔ جس کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

يَا مُعَاذُ أَفَتَّانٌ أَنْتَ؟ اقْرَأْ بِكَذَا وَاقْرَأْ بِكَذَا۔ [3]

"اے معاذؓ! کیا تم فتنہ میں ڈالنے والے ہو؟

1۔ المعجم الصغیر للطبرانی، بابُ المیم

2۔ البخاری، کتاب المَغَازِی باب بَعْثُ أَبِي مُوسَى وَمُعَاذٍ إِلَى الْيَمَنِ قَبْلَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ

3۔ مسلم، کتاب الصلاۃ باب القِرَاءَةِ فِي الْعِشَاءِ

رسول اللہ ﷺ نے بنو ثقیف پر حضرت عثمانؓ بن ابی العاص کو امیر مقرر کر کے روانہ فرمایا وہ خود فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھ سے جو آخری عہد لیا وہ یہ تھا:

كَانَ آخِرُ مَا عَهِدَ إِلَيَّ النَّبِيُّ -صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ- حِينَ أَمَّرَنِي عَلَى الطَّائِفِ، قَالَ لِي: "يَا عُثْمَانُ، تَجَاوَزْ فِي الصَّلَاةِ وَاقْدِرِ النَّاسَ بِأَضْعَفِهِمْ، فَإِنَّ فِيهِمُ الْكَبِيرَ وَالصَّغِيرَ وَالسَّقِيمَ وَالْبَعِيدَ وَذَا الْحَاجَةِ۔ [1]

''اے عثمانؓ! نماز ہلکی رکھنا اور لوگوں میں ان کے سب سے زیادہ ضعیف آدمی کو معیار بنانا، کیونکہ (نماز پڑھنے والے) لوگوں میں بڑے بھی ہوتے ہیں اور چھوٹے بھی، ضعیف بھی ہوتے ہیں اور صاحبِ ضرورت بھی''۔

شاہانِ حمیر نے قاصد کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے اسلام لانے کی اطلاع بھیجی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف چند صحابہ کو محاصل جمع کرنے اور دعوت و تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا، ان لوگوں میں حضرت معاذؓ بن جبل بھی تھے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے روانگی کے وقت ان سے عہد لیا اور سہولت اور آسانی کا اسلوب اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

''يسر ولا تعسر، وبشر ولا تنفر، وانك ستقدم على قوم من اهل الكتاب، يسئلونك ما مفتاح الجنة؟ فقل شهادة ان لا اله الا الله وحده لا شريك له[2]۔

''آسانی پیدا کرنا، دشواری پیدا نہ کرنا، خوش رکھنے والی باتیں کرنا، نفرت دلانے والی باتیں نہ کرنا، تم اہلِ کتاب کے کچھ لوگوں کے پاس جا رہے ہو، وہ تم سے پوچھیں گے جنت کی کنجی کیا ہے؟ تو تم کہنا: اس بات کی گواہی دینا کہ خدائے واحد کے سوا اور کوئی ہستی عبادت کے لائق نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے''۔

حضرت ابو مسعود انصاریؓ سے مروی ہے:

عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ الْأَنْصَارِيِّ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللهِ إِنِّي وَاللهِ لَأَتَأَخَّرُ عَنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ مِنْ أَجْلِ فُلَانٍ مِمَّا يُطِيلُ بِنَا فِيهَا قَالَ فَمَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطُّ أَشَدَّ غَضَبًا فِي مَوْعِظَةٍ مِنْهُ يَوْمَئِذٍ ثُمَّ قَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِينَ فَأَيُّكُمْ مَا

1۔ ابن ماجہ، أَبْوَابُ إِقَامَةِ الصَّلَوَاتِ وَالسُّنَّةِ فِيهَا بَابُ مَنْ أَمَّ قَوْمًا فَلْيُخَفِّفْ

2۔ ابنِ ہشام، وصیۃ الرسول ﷺ معاذؓ حین بعثہ الی الیمن، ۲۴۶/۴

صَلَّى بِالنَّاسِ فَلْيُوجِزْ فَإِنَّ فِيهِمُ الْكَبِيرَ وَالضَّعِيفَ وَذَا الْحَاجَةِ.[1]

"ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میں تو فلاں شخص کی وجہ سے فجر کی نماز سے پیچھے رہ جاتا ہوں (باجماعت ادا نہیں کر سکتا)، کیونکہ وہ بہت لمبی نماز پڑھاتا ہے"۔ راوی کا بیان ہے: میں نے رسول اللہ ﷺ کو وعظ کے دوران کبھی اس قدر غصے میں نہیں دیکھا جتنا اس دن ہوئے۔ پھر فرمایا اے لوگو! تم میں کچھ لوگ نفرت پھیلانے والے ہیں، جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے وہ مختصر (قرأت وغیرہ) کرے، ان میں بوڑھے، کمزور اور کام والے بھی ہوتے ہیں"۔

4۔ دعوت نبوی میں ترغیب و ترہیب (Motivation) کا پہلو

محرکات وہ عوامل ہوتے ہیں جو کسی فرد کے اندر کسی کام کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ یا شوق بڑھاتے ہیں۔ دنیا میں رونما ہونے والے تمام کے تمام واقعات کسی نہ کسی محرک کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ عام محرکات میں بھوک، پیاس، جنسی کشش وغیرہ شامل ہیں لیکن ہمارا موضوع چونکہ دعوت وارشاد ہے اور تربیت انسانی ہے۔ اس کے لیے وہ محرکات جو اس مقصد کے لیے کارگر ثابت ہوتے ہیں ان میں سے ترغیب و ترہیب، انعامات، معاوضہ دینا، مقابلہ و مسابقت، حوصلہ افزائی، توجہ و دلچسپی اور دیگر محرکات شامل ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے دعوت حق پیش کرتے ہوئے ترغیب و ترہیب سے محرک عمل کو ابھارا۔ اسلامی دعوت کے ابتدائی زمانہ میں رسول اللہ ﷺ کی توجہ پورے طور پر اس طرف تھی کہ عقیدہ توحید کی دعوت دی جائے۔ آپ ﷺ آخرت میں ثواب عظیم اور دخولِ جنت کا وعدہ کر کے لوگوں کو ایمان اور توحید کو اختیار کرنے اور شرک سے دور رہنے کی بہت ترغیب دیتے اور یہ ترغیب فقط آخرت کے حوالے سے ہی نہیں تھی بلکہ آپ ﷺ یہ بھی فرماتے ہیں کہ دنیا میں بھی تم فلاح پاؤ گے اور انہیں اس کے عوض عزت و شرف اور بزرگی عطا ہو گی۔

مثلاً ابن سعد نے الطبقات الکبری، میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعوت و تبلیغ کے لیے حج کے موسم میں ہر اس قبیلہ کے پاس جاتے جو خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے آتا تھا۔ ان کو دعوت پیش کرتے اور یہ فرماتے کہ اگر تم اس دعوت کو قبول کر لو تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ عرب تمہارے زیر نگیں ہو گا اور عجم پر تمہاری حکمرانی ہو گی:

1۔ البخاری کتاب الأحکام. باب ہل یقضی القاضی او یفتی وہو غضبان

"وکان رسول اللہ ﷺ یعرض نفسہ فی المواسم قبیلۃ قبیلۃ ویقول یایہا الناس قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا وتملکوا بہا العرب وتذل لکم العجم واذآمنتم کنتم ملوکا فی الجنۃ[1]

اسی طرح بیعت عقبہ اولیٰ کے اصحاب سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم نے اس عہد کو پورا کیا تو تمہارے لیے جنت ہے اور ایک مرتبہ آپ ﷺ تشریف لے جارہے تھے کہ آپ ﷺ نے دیکھا کہ آل یاسرؓ کو قریش ایذادے رہے ہیں تو آپ نے فرمایا:

"اے آل یاسر صبر کرو، تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔[2]

کبھی آپ ﷺ قصے کہانیاں سے جذبہ عمل کو ابھارتے کیونکہ قصے کہانیاں انسان کو متوجہ کرتی ہیں۔ سننے کی رغبت پیدا کرتی ہیں۔ اس لیے دعوت وارشاد میں قصوں کا استعمال انتہائی مؤثر ہے۔ قرآن مجید نے بھی لوگوں کی تربیت کرنے، انہیں نصیحت کرنے اور بہت سے عبرتوں اور حکمتوں کو سکھانے میں قصوں سے مدد لی ہے۔ قرآن مجید نے انتہائی اختصار کے ساتھ قصوں کی تربیتی تاثیر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی نفسیاتی تربیت میں قصوں سے مدد لی ہے۔ صحابہ کرامؓ کی توجہ منعطف کرانے میں مواعظ اور حکمت سکھانے کے لیے سننے کا شائق بنانے میں قصوں کا بڑا دخل ہے۔ رسول اللہ ﷺ مختلف تربیتی اغراض کے لیے قصوں سے مدد لیتے تھے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقع پر کہ جس وقت کھدائی ہو رہی تھی اور ایک سخت چٹان آپڑی۔ صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ سے عرض کیا تو آپ ﷺ تشریف لائے اور کدال لی بسم اللہ کہہ کر ایک ضرب لگائی اور ایک ٹکڑا ٹوٹ گیا اور فرمایا اللہ اکبر مجھے ملک شام کی کنجیاں دی گئیں ہیں۔ واللہ! میں اس وقت وہاں کے سرخ محلوں کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر دوسری ضرب لگائی تو ایک دوسرا ٹکڑا کٹ گیا اور فرمایا اللہ اکبر! مجھے فارس دیا گیا ہے۔ واللہ، میں اس وقت مدائن کا سفید محل دیکھ رہا ہوں پھر تیسری ضرب لگائی اور فرمایا، بسم اللہ، تو باقی ماندہ چٹان بھی کٹ گئی، پھر فرمایا اللہ اکبر مجھے یمن کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ واللہ! میں اس وقت اپنی جگہ سے صنعاء کے پھاٹک دیکھ رہا ہوں۔[4]

---

1 ابن سعد، محمد بن سعد، الطبقات الکبریٰ ۲۱۶/۱

2 البخاری، باب وفود الانصار وابن ہشام ۲۸۸/۱، والطبقات ۲۲۰/۱

3۔ سورۃ یوسف ۱۲: ۱۱۱

4 ۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۲۱۹/۲

یعنی یہ دعوت پیش کی جارہی ہے اور اس سلسلے میں جو مشکلات پیش آرہی ہیں عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے بدلے دنیا میں سرخرو فرمائے گا اور عرب و عجم پر اس دعوت و پیغام کے علمبرداروں کو غلبہ نصیب ہوگا۔ یہی نہیں آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائے گا اور خندق کھودتے ہوئے صحابہ کرامؓ اپنے کندھوں پر مٹی ڈھو رہے تھے۔ اسی اثناء میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اللهم لا عيش إلا عيش الآخرة فاغفر للمهاجرين والانصار۔[1]

اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔ بس مہاجرین اور انصار کو بخش دے۔

جب قبیلہ عبدالقیس کا وفد جن کی تعداد بیس کے قریب تھی عبداللہ بن عوف الاشج کی قیادت میں آیا اور آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ یہ عبدالقیس کا وفد ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ان کو مرحبا ہے۔ عبدالقیس بھی کیسی اچھی قوم ہے۔ ان لوگوں نے آپ ﷺ کو سلام کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم میں عبداللہ الاشج کون ہیں؟ عبداللہ نے کہا یارسول اللہ میں ہوں۔ وہ کریہہ منظر (بدشکل) آدمی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ انسان کی کھال کی مشک نہیں بنائی جاتی البتہ آدمی کو دو سب سے چھوٹی چیزوں کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک اس کی زبان اور ایک اس کا دل۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (اے عبداللہ) تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو اللہ پسند کرتا ہے۔ عبداللہ نے کہا کہ وہ کون سی؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حلم اور وقار۔ انہوں نے عرض کیا کہ یہ چیز پیدا ہوگئی ہے یا میری خلقت اسی پر ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری خلقت اسی پر ہوئی ہے۔

آپ ﷺ نے ان لوگوں کو انعامات دینے کا حکم دیا۔ عبداللہ الاشج کو سب سے زیادہ دلایا۔ انہیں ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی مرحمت فرمائی۔[2] اس وفد سے آپ کی ملاقات اور دعوت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے انسانی نفسیات کا کس قدر لحاظ فرمایا۔ مثلاً:

ا۔ سب سے پہلے عبدالقیس کے وفد کی آمد پر خوش آمدید کہا۔

1۔ البخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ خندق ۵۸۸/۲

2۔ ابن سعد، الطبقات الکبری، ۸۸/۲

۲۔ اس وفد اور اس کے رئیس کی مدح و توصیف فرمائی۔

۳۔ وفد کے رئیس عبداللہ بن عوف الاشج کی ظاہری شکل و صورت کے برعکس ان کی داخلی صفات اور خوبیوں کا ان کے سامنے ذکر کیا کہ حقیقت میں اصل خوبصورتی اور حسن، رنگ و نسل کا نہیں بلکہ وہ اخلاق حمیدہ ہیں جن سے انسان متصف ہوتا ہے اور حضرت عبداللہ الاشج میں جو دو خصلتیں اور خوبیاں، حلم اور وقار، ہیں یہی ان کی خوبصورتی اور حسن ہے۔ اس طرح آپ ﷺ نے ان کی شخصیت کے وقار میں اضافہ کر دیا۔

۴۔ اور انعامات میں ان کو یعنی عبداللہ الاشج جو کہ وفد کے رئیس تھے سب سے زیادہ دلایا۔

5۔ دعوت نبوی ﷺ میں اختصار کا پہلو

رسول اللہ ﷺ کے دعوتی و تربیتی خطبے نہایت مختصر ہوا کرتے تھے اور بعض روایات میں رسول اللہ ﷺ نے خطبہ کے اختصار کو خطیب کی دانش مندی کی علامت قرار دیتے ہوئے فرمایا:

إن من البيان سحرًا۔[1]

''بعض خطبے جادو ہوتے ہیں''

اس حدیث میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر داعی کا خطبہ مختصر، جامع اور بلیغ ہو گا تو وہ جادو کی طرح اثر کرے گا۔ جبکہ طویل خطبہ نہ صرف سامع کی طبیعت کو کند کر دے گا بلکہ دعوت کو قبول کرنے کی حس اور صلاحیت کو بھی ختم کر دے گا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے دعوت و تبلیغ میں ہمیشہ اختصار سے کام لیا نیز آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی بھی اسی نہج پر تربیت فرمائی۔ حضرت عمار بن یاسرؓ فرماتے ہیں:

''أمرنا رسول الله ﷺ بإقصار الخطب[2]

''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ میں اختصار کا حکم فرمایا ہے''

حضرت عمار بن یاسرؓ نے ایک دفعہ خطبہ دیا تو آپؓ نے اپنے خطبہ میں اختصار سے کام لیا۔ قبیلۂ قریش کے ایک شخص نے کہا اگر آپؓ کچھ مزید فرماتے تو بہتر تھا، آپؓ نے جواب دیا:

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب ماجاء فی الشعر

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب اقصار الخطب

"ان رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی ان نطیل الخطبة[1]

"رسول اللہ ﷺ نے ہمیں طویل خطبے سے منع فرمایا ہے"

6۔ دعوت نبوی میں عدم جبر و اکراہ کا پہلو

اسلام کو جملہ الہامی و غیر الہامی مذاہب میں اس لحاظ سے انفرادیت حاصل ہے کہ اس نے اپنی ترویج واشاعت کے باقاعدہ اصول بیان کئے ہیں اور کھل کر اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ دین ایسی چیز نہیں جس کو زبردستی کسی پر ٹھونسا جائے کیونکہ دینِ اسلام کا اولین جزو ایمان ہے اور ایمان نام ہے یقین کا۔ دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی زبردستی پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لیے قرآن کا واضح حکم ہے:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾[2]

(دین میں زبردستی نہیں ہے، تحقیق ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے)

دعوتِ دین کا یہ وہ اسلوب ہے جس کو نہ صرف رسول اللہ ﷺ نے خود اختیار فرمایا بلکہ صحابہ کرامؓ کو بھی اس کی تلقین فرمائی چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جب عمروؓ بن حزم کو بنو حارث بن کعب کی طرف دعوت و تبلیغ اور صدقات کی وصولی کے لیے روانہ فرمایا تو ان کو ایک تحریر لکھ کر دی جس میں یہ ہدایت واضح طور پر درج تھی:

"وأنه من أسلم من يهودي أو نصراني إسلاما خالصا من نفسه، ودان بدين الإسلام، فإنه من المؤمنين له مثل مالهم وعليه مثل ما عليهم، ومن كان على نصرانيته، أو يهوديته، فانه لا يردعنها۔[3]

"اور جو یہودی یا نصرانی اپنی طرف سے مخلصانہ اسلام لے آئے اور دین اسلام کو اپنا دین بنا لے وہ مومنوں میں شمار ہو گا، اس کے وہی حقوق ہوں گے جو مومنوں پر ہوں گے اور جو اپنی یہودیت یا نصرانیت پر قائم رہے گا اسے اس یہودیت یا نصرایت سے پھیرا نہ جائے گا"۔

1۔ المسند، حدیث عمار بن یاسرؓ، حدیث نمبر ۱۸۴۱۰، ۴۱۹/۵

2۔ سورۃ البقرہ، ۲۵۶:۲

3۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، اسلام بنی الحارث بن کعب، ۲۵۱/۴

7۔ دعوت میں روزمرہ واقعات ومشاہدات کا استعمال

رسول اللہ ﷺ چشم دید مشاہدے کے لیے کسی چیز کی ظاہری ہیت کی طرف اشارہ کرتے یا اس کے پاس کھڑے ہو جاتے تھے اور پھر اس سے اپنی بات مستنبط کرتے تھے۔

ایک بار آپ ﷺ کا بازار سے گزر ہوا۔ بازار ایک چھوٹی موٹی دنیا ہے۔ کوئی خریداری کرتا ہے اور کوئی بیچتا ہے۔ ایک اپنے سامان کے بھاؤ اور قیمت کا اعلان کرتا ہے تو دوسرا اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ آپس میں ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ غرضیکہ ہر ایک اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے۔ ایک شخص نفع کمانے کی دھن میں رہتا ہے تو دوسرا سستا سامان خریدنے کی فکر میں رہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سوچا لوگوں کو اس دنیا کی قدر و قیمت بتائی جائے۔ جس پر یہ ٹوٹ پڑ رہے ہیں۔ چنانچہ ایک کن کٹی بکری کے بچہ کی لاش سے گزر ہوا تو آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے پوچھا:

"أیکم یحب أن ھذا بدرھم؟ فقالوا ما نحب أنه لنا بشيءٍ وما نصنع به قال أتحبون انه لکم؟ قالوا واللہ لو کان حیا لکان عیباً فیه أنّه أسَكُّ فکیف وھو میت؟ فقال فواللہ للدنیا اھون علی اللہ عزوجل من ھذا علیکم۔ [1]

اس طرح آپ ﷺ نے حکمت سے دنیا کی قدر و قیمت واضح فرمادی اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بے نیازی کی عظیم صفت کو عمدہ طریقے سے ذہن نشین کرا دیا۔ اس طرح محسوس طریقے سے دعوت قلب و ذہن پر اثر انداز ہوتی ہے اور مخاطب فوراً قبول کرتا ہے۔

---

[1]۔ منذری، عبدالعظیم بن عبد، حافظ "الترغیب والترھیب"، مصر

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک گاوں سے واپسی پر مدینہ کے بازار سے گزر رہے تھے لوگوں نے آپ ﷺ کو دونوں طرف سے گھیرے رکھا تھا۔ وہاں چھوٹے کانوں والا ایک مردہ بکری کا بچہ پڑا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کون اس مردہ بچہ کو ایک درہم میں خریدنے کے لیے تیار ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا! ہم کسی بھی قیمت پر اس کو خریدنا نہیں چاہتے ہیں۔ یہ ہمارے کسی کام کا نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم پسند کرتے ہو کہ یہ تم کو مل جائے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ اگر یہ زندہ ہوتا تب بھی کان چھوٹے ہونے کی وجہ سے اس میں عیب تھا اور اب تو یہ مردہ ہے اس لیے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا "خدا کی قسم" یہ بچہ تمہاری نظر میں جتنا بے وقعت ہے دنیا اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس سے زیادہ بے وقعت ہے۔

8۔ دعوت نبوی ﷺ میں مخاطب کی نفسیات کا لحاظ (چند مثالیں)

8.1۔ انفرادی اختلاف کی رعایت

کسی بات کے موثر ابلاغ وافہام و تفہیم کے لیے جس طرح انسان کی نفسی کیفیات، جسمانی حالات اور علاقائی نفسیات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح اس کے عقلی، ذہنی اور فکری رجحانات و میلانات، میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، اس کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ جدید تعلیمی نفسیات میں، اس کو ''انفرادی اختلافات کی رعایت'' کے عنوان سے موسوم کیا جاتا ہے کہ متعلم و مخاطب کے ان فطری و نفسی رجحانات، خواہشات، وراثتی ماحول اور ذہنی استعداد کا لحاظ رکھا جائے، کہ وہ بات کو اخذ کر سکے۔ اس کو سمجھنے میں مدد ملے اور اس پر عمل کرنا آسان ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے اندر انفرادی فرق کی طرف اس حدیث میں اشارہ فرمایا ہے جسے حضرت ابو ہریرہؓ نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

الناس معادن کمعادن الفضة والذهب، خيارهم في الجاهلية خيارهم في الاسلام اذا فقهوا۔[1]

ترجمہ: سونے چاندی کی کانوں کی طرح لوگوں کی بھی کانیں ہیں پس زمانہ جاہلیت میں جو سب سے بہتر تھا اسلام میں بھی سب سے بہتر ہو گا۔ بشر طیکہ وہ دین کا فہم حاصل کرلے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح سونے اور چاندی اور دیگر اشیاء کی کانوں کی خصوصیات ان کی قدر و قیمت اور بناوٹ و ساخت میں باہم فرق ہوتا ہے اسی طرح لوگوں کی بھی فطری اور طبعی خصوصیات مختلف ہوا کرتی ہیں۔ ان کی طبائع، اخلاق و عبادات اور جسمانی اور عقلی صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ جو شخص زمانہ جاہلیت میں ان صفات سے آراستہ اور ان خصوصیات کے اعلیٰ مقام پر تھا وہ دین اسلام میں داخل ہو کر اور دین میں تفقہ پیدا کر کے اپنے اس بلند اور پسندیدہ معیار کو باقی رکھتا ہے۔ آپ ﷺ نے ''معادن'' کی تشبیہ و تمثیل اس بات کی وضاحت کے لیے دی کہ زمانہ جاہلیت میں جو افضل و برتر تھا۔ اسلام میں تفقہ پیدا کر لینے کے بعد وہ اپنی اس فضیلت کے مقام پر فائز رہے گا۔ جس طرح سونا چاندی، جب ''کان'' میں تھے تب بھی ان کی قیمت تھی اور باہر آکر بھی ان کی قیمت برقرار ہے۔ احکامات و تعلیمات

1۔ مسلم الجامع الصحیح، کتاب البر والصلة والاداب، باب الارواح جنود مجندة (حدیث نمبر ۱۶۰)

کی تفصیل اوران پر عمل کرنے کی تلقین کرتے ہوئے بھی آپ انسان کی نفسیاتی، جسمانی اور ذہنی فرق کا لحاظ فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ کی تعلیمات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ جیسے حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ

''جب ہم رسول اللہ ﷺ سے اطاعت وفرمانبرداری پر بیعت کرتے تھے توآپ ہم سے فرماتے حسب استطاعت [1] اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میں نے جن چیزوں سے تمہیں روکا ہے ان سے باز رہو اور جن کا تمہیں حکم دیا ہے انہیں بقدر استطاعت انجام دو''[2]

حضور ﷺ کے ارشاد کہ ''اسے حسب استطاعت انجام دو'' میں صاف اشارہ ہے کہ رسول اللہؐ صحابہ کرامؓ کے درمیان پائے جانے والے فرقوں کی رعایت کرتے تھے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے ان سے یہ فرمایا کہ ان میں سے ہر شخص اپنی استطاعت کے بقدر حکم کی بجاآوری کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک فرمان میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیھم السلام کو اس بات کی تعلیم دی ہے کہ وہ لوگوں کے مراتب اور فہم و فراست کے مطابق دعوت دیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

''امرنا ان نکلم الناس علیٰ قدر عقولھم''[3]

ہم انبیاء کی جماعت کو اس بات کا حکم ملا ہے کہ لوگوں کو ان کے مقام و مرتبہ اور ان سے ان کی عقلوں کے لحاظ سے گفتگو کریں''۔

دعوت و تبلیغ اور تربیت واصلاح میں آپ لوگوں کی فہم وفراست، میلانات ورجحانات اور ذہنی و عقلی استعداد کا پورا خیال رکھتے تھے۔ آپ ﷺ کو مردم شناسی میں کمال حاصل تھا۔ ہر شخص کی خوبیوں اور اس کے کمزور پہلوئوں پر آپ کی گہری نظر ہوتی، ہر شخص کے مزاج اور طبیعت کا گہرا مطالعہ کرتے، ہر معاملہ میں ان کے مزاج اور ساخت کا خیال رکھتے۔ سیر واحادیث میں کئی ایسے واقعات ہیں جن سے آپ کے نزدیک نفسیات انسانی کی رعایت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثلاً

1۔ البخاری، کتاب الاحکام، باب کیف یبایع الامام الناس۔

2۔ البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب وسنة، باب الاقتدا بسنن رسول اللہ ﷺ

3۔ المتقی، المنتخب کنز العمال، کتاب الاخلاق باب فی الاخلاق محمودہ ۷۰/۴

۱۔ جب کسی نے نصیحت یا وصیت کی درخواست کی تو آپ نے سائل اور طالب کے حسب حال اور مزاج و نفسیات کے مطابق مختلف وصیت و نصیحت کیں۔

۲۔ اسی طرح سائلین نے ایک ہی طرح کا سوال کیا۔ مگر آپ نے اپنے فتاویٰ میں جوابات ہر ایک کے مناسب حال مختلف دیے۔

۳۔ لوگوں کے مزاج اور ذہنی و عقلی استعداد کے مطابق مختلف اوامر و نواہی کی تلقین۔

۴۔ جہاں تک پہلے طریقے کا تعلق ہے تو اس میں آپ کا اسلوب کچھ یوں ہے کہ بہت سے لوگوں نے آپ سے کسی ایسے عمل اور نیکی کے بارے میں وصیت یا نصیحت کرنے کی درخواست کی کہ جس پر عمل پیرا ہو کر وہ جنت میں داخل ہو سکیں اور جہنم سے بچ جائیں یا اسی طرح کی کوئی جامع نصیحت وغیرہ تو ان کے جواب میں بعض سے آپ نے یہ ارشاد فرمایا:

"تعبد اللہ لا تشرك به شيأً و تقيم الصلوة و تؤتی الزكوة و تصل الرحم۔[1]

اور بعض کو یہ تلقین کی کہ:

"اتق اللہ حیثما کنت واتبع السيئة الحسنة تمحها وخالق الناس بخلق حسن۔[2]

اور بعض کے سوال کے جواب میں فرمایا:

"قل امنت باللہ فاستقم۔[3]

کسی نے فرمایا کہ نصیحت کیجیے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"لا تغضب، فردد مرارا قال لا تغضب۔[4]

اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ ہر شخص کا علاج اس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے۔ اس موخر الذکر

1۔ مسلم الجامع الصحیح، کتاب الایمان، باب بیان الاعمال الذی یدخل بہ الجنتہ وان من تمسک بما امر بہ دخل لجنتہ۔

2۔ احمد بن حنبل، المسند جلد ۲۳۶/۵

3۔ مسلم، الجامع الصحیح۔ کتاب الایمان، باب جامع اوصاف الاسلام

4۔ البخاری، کتاب الادب، باب الاحذر من العضب

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل میں شاید غصہ اور جذبات کا غلبہ تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے اس کے لیے یہ علاج تجویز فرمایا۔ جس کو وہ بادیءالنظر میں معمولی سمجھا۔ اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن آپ ﷺ نے ہر بار یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ اس طرح آپ ﷺ ہر ایک کے حسب حال نصیحت فرماتے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہی تعلیم صحابہ کرامؓ کو بھی دی کہ وہ دعوت حق پیش کرتے وقت مدعو کی نفسیات کا لحاظ رکھیں اور اس کے مطابق دعوت دیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"وانزلوا الناس منازلھم۔[1]

اور لوگوں کی حیثیت اور سوجھ بوجھ کے مطابق دعوت دو۔

8.2۔ مخاطب کی استعداد کا لحاظ

رسول اللہ ﷺ کے طریقہ دعوت کی اہم بات "مخاطب کا معیار" ہے۔ آپ نے ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھا کہ سننے والے کی استعداد کیا ہے؟ آپ ﷺ دیہات سے آنے والے لوگوں کے سامنے دین حق کو جس انداز سے پیش کرتے تھے وہ اس سے مختلف ہوتا تھا۔ جس انداز سے آپ ﷺ مکہ اور مدینہ کے شہریوں کو دعوت دیتے تھے۔ پھر عقلی استعداد، قلبی و نفسی کیفیات اور قومی نفسیات کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے۔ مثلاً

عربوں کی نفسیات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ظاہری جہالت اور اکھڑپن کے پیچھے فطرت کی سادگی اور سچائی پوری طرح عیاں تھی۔ ایک عرب کے لیے کہنے اور کرنے میں فرق کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ خود بھی قول و فعل میں سچے تھے اور دوسروں کو بھی سچا سمجھتے تھے۔ جیسے ہی ان کی سمجھ میں بات آجاتی وہ فوراً اسے مان لیتے۔ ان کے اندر نفاق نہ تھا۔ اقرار اور انکار کے درمیان وہ کسی تیسری چیز کو نہ مانتے تھے۔ مثلاً ایک قبیلہ کے سات افراد آپ ﷺ کے پاس اسلام قبول کرنے اور بیعت کے لیے حاضر ہوئے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے بتایا کہ ہم نے جاہلیت سے پانچ چیزیں سیکھی ہیں۔ ہم ان پر اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک آپ ہمیں اس سے منع نہ کریں گے۔ آپ نے فرمایا وہ کون سی ہیں۔ انہوں نے عرض کیا:

1۔ مسلم، الجامع الصحیح، تعلیقا فی مقدمتہ، سنن ابی داود، کتاب الادب باب فی تنزیل الناس منازلھم

"الشکر عندالرخاء والصبر عند البلاء والصدق فی مواطن اللقاء والرضاء بمر القضاء و ترك الشماتة بالمصيبة إذا حلت بالاعداء۔[1]

خوشحالی میں شکر کرنا، مصیبت میں صبر کرنا، مڈبھیڑ کے وقت سچا ثابت ہونا، تقدیر پر راضی رہنا، کسی کی مصیبت پر خوش نہ ہونا، خواہ وہ دشمن پر کیوں نہ ہو۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا، یہ لوگ عالم اور اہل ادب ہیں۔ان کے اندر انبیاء کی سی شان ہے۔ کتنی اعلیٰ ہیں ان کی باتیں جب وہ ایمان لائے تو آپ ﷺ نے ان کو مزید پانچ باتوں پر عمل کرنے کی تلقین فرمائی۔

اسی طرح ضمادؓ اور طفیل عمروؓ دوسی کے ایمان لانے اور دعوت حق قبول کرنے میں بھی یہی سچائی کا انسانی عنصر شامل تھا۔ مثلاً ضمادؓ کو قریش مکہ نے بتایا کہ محمد ﷺ کو (نعوذ باللہ) جن و بھوت کا اثر ہے۔ ضماد اس خیال سے آپ ﷺ سے ملے کہ اپنے فن کے ذریعہ آپ کا علاج کریں۔ مگر جب آپ ﷺ کی باتیں سنیں تو کہا:

''خدا کی قسم میں نے کاہنوں اور ساحروں کی باتیں سنی ہیں اور شعراء کے کلام دیکھے ہیں۔ مگر ایسے کلمات میں نے کبھی نہیں سنے۔ اپنا ہاتھ بڑھائیے کہ میں بیعت کرلوں''۔

حسب عادت داعی اعظم ﷺ نے اس موقع پر کوئی لمبی تقریر نہیں کی تھی۔ صرف اتنا کہا تھا:

''ان الحمدلله نحمده و نستعينه من يهده الله فلا مضل له و من يضلل فلا هادی له وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له و أن محمدا عبده و رسوله۔[2]

اس پر ان الفاظ کا یہ اثر ہوا کہ وہ مکرر سننے کے مشتاق ہوئے۔آپ ﷺ نے تین بار ان کلمات کا اعادہ کیا۔اسی طرح طفیل عمروؓ دوسی کو قریش مکہ نے منع کیا کہ آپ ﷺ کی باتیں نہ سنیں۔ مگر خود اپنے سے مخاطب ہوئے کہ،

"والله انی لرجل لبيب شاعر، ما يخفی علی الحسن من القبيح فما يمنعنی ان اسمع کلامه فان کان حسنا قبلته ان کان قبيحا ترکته۔[1]

1۔ المتقی، کنز العمال ۶۹/۱

2۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ۳۶/۳، مسلم کتاب الجمعہ، باب تخفیف الصلوۃ والخطبۃ حدیث نمبر ۸۶۸

مخاطبین میں بدوی، شہری، پڑھا لکھا اور ان پڑھ اور عقل و تجربہ کے مختلف مدارج والے انسان ہوتے تھے۔ آپ ﷺ ہر ایک سے مختلف طریقے پر سلوک کرتے تھے۔ ایک دیہاتی، شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا:

بما اعرف انك نبی میں کیسے پہچانوں کہ آپ نبی ہیں؟

آپ نے فرمایا: "ان دعوت هذا العذق من هذه النخلة يشهد انی رسول الله؟"[2]

اگر میں کھجور کے اس خوشہ کو بلاؤں اور وہ آکر یہ گواہی دے دے کہ میں خدا کا رسول ہوں (تو تم مانو گے) آپ ﷺ نے اس کو آواز دی، فوراً وہ اترنے لگا اور اترتے اترتے آپ ﷺ کے سامنے آپڑا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا۔ واپس چلا جا، وہ چلا گیا۔ یہ دیکھ کر وہ دیہاتی مسلمان ہو گیا۔

بے علم طبیعتیں ہمیشہ عجوبہ نمائیوں کی گرویدہ ہوتیں ہیں، ان ہی کو معیار کمال تصور کرتی ہیں۔ ان ہی کا اثر قبول کرتی ہیں۔ اس لیے نباض فطرت اور داعی اعظم ﷺ نے اس کے سامنے اس کی فطرت کے مناسب ہی ایک جاذب اسلام کا نظارہ پیش کر دیا تھا۔ جس کو دیکھ کر وہ فوراً اسلام لے آیا۔

اس طرح قبیلہ کندہ کا وفد حاضر خدمت ہوا۔ وفد کے امیر اشعث بن قیس آگے بڑھے اور کہا کہ آپ ﷺ بتائیں کہ میری مٹھی میں کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا، یہ کاہن کا کام اور پیشہ کہانت جہنم کی اشیاء میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول اور پیغامبر بنا کر بھیجا اور مجھ پر اپنی کتاب نازل کی ہے۔ وفد کے اراکین نے قرآن سننے کی فرمائش کی۔ آپ ﷺ قرآن سناتے جاتے ہیں آپ ﷺ کے اشک رواں ہیں۔ وفد کا قائد پوچھتا ہے کہ کیا اس خدا کے خوف سے روتے ہیں۔ جس نے آپ ﷺ کا پیغمبر بنایا، فرمایا ہاں، اسی کے خوف سے روتا ہوں اس لیے کہ اس نے مجھے اس دین متین اور صراط مستقیم پر قائم کیا ہے جو شمشیر آبدار کے درمیان ہے اور اس راستہ اور دین سے کجی ہلاکت تک پہنچا دیتی ہے۔ آپ ﷺ کے پر اثر کلمات اور تلاوت قرآن سن کر وفد کے تمام اراکین اسلام قبول کر لیتے ہیں۔[3]

1۔ ابن ہشام ۱/۳۸۴

2۔ ترمذی، السنن، کتاب المناقب، باب نمبر ۵، حدیث نمبر ۳۶۲۸۔

3۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ ۱/۳۲۴۔

یہاں آپ ﷺ نے مخاطبین کے فہم و فراست اور معقول پسند طبیعت دیکھی تو طریقہ دعوت مختلف اختیار کیا۔ان کو قرآن مجید کی آیات پڑھ کر سنائیں اور اس سے دین حق کو اختیار کرنے کی اہمیت بیان کی۔وفد یہ باتیں سن کر متاثر ہوا اور ان کے ذہنوں نے اس کو قبول کر لیا۔

8.3۔ مشترکہ نکات دعوت کی بنیاد

عرب کے مشرکین اللہ تعالیٰ ہی کو کائنات کا خالق و مالک مانتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے دوسرے خداؤں کی خدائی کے بھی قائل تھے۔قرآن مجید نے کئی ایک مقامات پر ان ہی کے مسلمات سے اس تضاد کو نمایاں کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کائنات میں ہر طرف خدا کی حکمرانی کو تسلیم کرنا اور اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانا ایک ایسا رویہ ہے جن کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ایک جگہ ارشاد ہے:

''اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اور کس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا تو وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے (ان سے کہو) پھر کہاں وہ بہکائے جاتے ہیں۔ اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے رزق میں کشادگی عطا کرتا ہے اور جس کو چاہے تنگی میں مبتلا کرتا ہے۔بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان سے بارش کون اتارتا ہے اور اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے تو وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ اللہ ہی کرتا ہے۔ کہو الحمدللہ (اس طرح خود ہی تم نے شرک کی تردید کر دی) لیکن ان میں سے اکثر سمجھتے نہیں ہیں'۔ [1]

مشرکین کے اس اعتراف سے کہ کائنات کا سارا اقتدار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے جس طرح قرآن مجید نے حجت قائم کی ہے۔اس کی ایک مثال ذیل میں دی جارہی ہے:

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ' سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْن [2]

''(ان سے) کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ زمین اور اس کی ساری مخلوق کس کی ہے؟ تو وہ ضرور جواب دیں گے کہ اللہ کی ہے۔ کہو تو پھر کیوں نہیں نصیحت حاصل کرتے، ان سے پوچھو کہ ساتوں آسمان اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ تو ضرور

1۔ العنکبوت ۲۹: ۶۲، ۶۳

2۔ المومنون ۲۳: ۸۴، ۸۶

یہی جواب دیں گے کہ اللہ، ان سے کہو تو پھر کیوں نہیں اس سے ڈرتے"۔

رسول اکرم ﷺ دعوت میں قدر مشترک کو اختیار کرتے تھے اور عربوں کے ان معتقدات کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو جانتے ہیں۔ مثلاً اکابرین قریش نے حضرت حصین خزاعیؓ کو جو کہ ان کے ہاں بڑی عزت اور قدر و منزلت رکھتے تھے، حضور ﷺ کے پاس بھیجا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے اس سلسلہ میں بات چیت کریں کہ جو وہ ان کے معبودوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں اور ان کو برا بھلا کہتے ہیں۔ حصین کے ساتھ قریش کے بھی کچھ لوگ آکر رسول اللہ ﷺ کے دروازہ پر بیٹھ گئے، حصین اندر داخل ہوئے انہوں نے آپ ﷺ سے کہا تمہارے بارے میں کیا خبر ہے، کیا تم ہمارے معبودوں کو گالی دیتے ہو، آپ ﷺ نے حصین سے پوچھا، **یاحصین کم تعبد من اله**؟ کہ کتنے معبودوں کو پوجتے ہو، انہوں نے کہا۔ **سبعة فی الارض و واحد فی السماء** سات زمین اور ایک آسمان کے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے پھر پوچھا جب تم کو کوئی تکلیف لاحق ہو جاتی ہے تو کس معبود کو پکارتے ہو۔ جواب دیا (الذی فی السماء) جو آسمان میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ایک خدا تمہاری پکار کو سنتا ہے اور تم ہو کہ اس کے ساتھ دوسرے معبودوں کو بھی شریک کر لیتے ہو۔ فرمایا، اے حصین اسلام قبول کر لو سلامتی میں رہو گے، چنانچہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔[1]

یہ انداز قرآن مجید نے اہل کتاب کے ساتھ بھی اختیار کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾[2]

اے نبی ﷺ کہو اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے پھر اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں صرف ایک خدا کی اطاعت کرنے والے۔

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کو ان کی بے راہ روی اور ضلالت اور مشرکانہ معتقدات کے پیش نظر اے گمراہ اور شرک میں مبتلا لوگو! کہہ کر خطاب نہیں کیا گیا۔ بلکہ انہیں ایسے لقب سے خطاب فرمایا گیا جس سے ان کی شان و امتیاز کا

1۔ الحلبی، السیرۃ الحلبیہ، ۳۱/۱

2۔ سورۃ آل عمران ۳: ۶۴

اظہار ہوتا تھا۔ جو ان کے لیے باعث عزت وافتخار تھا۔ پھر فرمایا کہ ''ہماری توحید کی تعلیم ایسی نہیں ہونی چاہیے جس سے تمہارے کان ناآشنا ہوں، یہ دعوت تو وہی ہے جس کے داعی حقیقت میں تم خود بھی ہو''۔

رسول اللہ ﷺ نے جو دعوتی خطوط اہل کتاب کو لکھے ہیں ان میں اس آیت کو نقل فرمایا ہے۔ کسریٰ پرویز جو مجوسی تھا، اس کے نام یا دیگر مشرک سرداروں کے نام جو آپ ﷺ کے مکتوبات پائے جاتے ہیں ان میں اس آیت کو نقل نہیں فرمایا گیا۔ مشرکین اور مجوسی بادشاہوں کے مذہب کی بنیاد شرک پر قائم تھی اس لیے ان کے لیے یہی کافی تھا کہ انہیں اسلام کی طرف دعوت دی جائے اور قبول دعوت کی صورت میں انہیں دین و دنیا کی سلامتی کا مژدہ سنایا جائے۔ اہل کتاب حکمرانوں کے نام جو مکتوبات آپ ﷺ نے بھیجے ہیں ان میں ''اسلم تسلم'' کے بعد ''یوتك الله اجرك مرتين''[1] اللہ تمہیں دوہرے اجر سے نوازے گا) بھی ہے۔ یعنی اہل کتاب کو یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ اگر تم دعوت حق کو قبول کرتے ہو تو اللہ کے یہاں تمہارے لیے دوہرا اجر ہے۔

8.4۔ حفظ مراتب کا لحاظ

آپ ﷺ دعوت و تبلیغ میں بھی مدعو اور مخاطب کے مراتب کا لحاظ فرماتے تھے۔ مثلاً دعوت ذوالعشیرہ کے موقع پر اپنے خاندان کو جو کہ قریش میں بلند مقام و مرتبہ رکھتا تھا اور پورے عرب میں اس کی عزت کی جاتی تھی۔ باقاعدہ کھانے پر بلایا اور ان کے مقام و مرتبہ اور مراتب کا لحاظ کرتے ہوئے بڑے وقار سے دعوت حق کو پیش کیا۔ اسی طرح اکابرین قریش کے مشہور اور پسندیدہ ناموں سے ان کو یاد فرمایا۔ مثلاً عتبہ بن ربیعہ آپ ؐ کے پاس چند مطالبات اور تجاویز لے کر آیا، تاکہ آپ دعوت حق سے باز آجائیں۔ آپؐ اس کی گفتگو غور سے سنتے رہے جب اس نے بات ختم کی تو آپؐ نے فرمایا: افرغت یا ابا الولید[2]۔

یہاں آپ ﷺ نے عتبہ کی مشہور اور معروف کنیت سے اس کو مخاطب کیا، دعوت حق کے سخت ترین مخالف ابو جہل، عمرو بن ہشام کو آپ اس کی مشہور کنیت ''ابا الحکم'' سے بلاتے تھے[3]۔ قریش کے بزرگ اور ممتاز لوگوں میں ایک نام حصین خزاعی کا تھا۔ قریش نے ان کو آپ ﷺ کی طرف بھیجا کہ وہ آپ ﷺ کو اس دعوت کے ابلاغ سے

1۔ مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب کتاب النبی ﷺ الی ہرقل یدعوہ الی الاسلام حدیث نمبر ۱۷۷۳۔

2۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۱/۲۹۵۔

3۔ السیوطی، الخصائص الکبری، ۱/۲۸۶

روکیں۔ جب وہ آپ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا:

''**اوسعوا للشیخ**''کہ شیخ کے لیے جگہ کشادہ کر دو۔ مقصد تعظیم اور عزت دینا تھا اور جب وہ گفتگو کر چکے اور اسلام کی دولت حاصل کر لی اور گھر واپس جانے لگے تو آپ ﷺ نے ان کے مقام و مرتبہ کا لحاظ رکھتے ہوئے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ شیعوہ الی منزلہ[1]۔ کہ ان کو منزل تک پہنچا دو۔

مختلف قبائل جو کہ عربوں کے نزدیک بڑی قدر و منزلت رکھتے تھے اور طاقت و شجاعت میں ان کا بڑا مقام تھا۔ جب وہ ایمان لائے تو آپ ﷺ لوگوں کے سامنے ان کی تعریف و توصیف فرماتے تھے۔ مثلاً بنی غفار اور بنو اسلم کے بارے میں فرمایا:

غفار غفر الله لها، واسلم سالمها الله۔[2]

اور یمن سے لوگ اسلام قبول کرنے کے لیے آئے تو فرمایا:

جاء اهل اليمن هم ارق أفئدة، الايمان يمان والفقه يمان والحكمه يمانية۔[3]

اہل یمن آگئے، یہ لوگ نہایت رقیق القلب ہوتے ہیں۔ ایمان اور دین کی سمجھ اور حکمت تو یمن ہی کا حصہ ہے۔

آپ ﷺ نے حکمرانوں، امراء اور سرداروں کو دعوتی خطوط ارسال کئے ان میں بھی حفظ مراتب کا لحاظ رکھا۔ مثلاً قیصر روم، **ھرقل عظیم الروم**[4] اور قبطیوں کے حکمران مقوقس کو **عظیم القبط**[5] کسریٰ کے حکمرانوں کو عظیم فارس[6] جیسے مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے دعوت حق کی طرف بلایا۔ فتح مکہ کے موقع پر اکابرین قریش کا لحاظ رکھا اور

1۔ الحلبی، السیرۃ الحلبیہ، ۳۱۸/۱۔

2۔ مسلم کتاب فضائل صحابہ، باب من فضائل غفار واسلم وجھینہ

3۔ مسلم کتاب الایمان، باب تفاضل الایمان فیہ ورجحان اھل الیمن فیہ

4۔ البخاری، کتاب الوحی، باب کیف کان بدالوحی

5۔ ابن قیم الجوزیہ، زادالمعاد فی ھدی خیر العباد، ۱۲۹/۳۔

6۔ الطبری، تاریخ الرسل والملوک ۹۱/۳

اسی وجہ سے ابو سفیان کے گھر کو دار الامن قرار دیا اور مال غنیمت سے ان کو بے شمار مال و دولت سے نوازا۔ عام الوفود میں جب پورے عرب سے مختلف قبائل اسلام قبول کرنے اور بیعت کرنے کی غرض سے بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے ان کے ساتھ بھی آپ ﷺ محبت اور عزت کا سلوک فرماتے ان کے مقام و مرتبہ کا لحاظ فرماتے۔ بعض وفود کے استقبال کے لیے شہر سے باہر تشریف لے جاتے اور بعض کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے تمام اراکین وفود کو ہدیے اور تحفے اور وفد کے قائد و امیر کو سب سے زیادہ دلاتے، اس کا مقصد بھی ان کی دلجوئی تھا اور ان کی قوی مراتب کا لحاظ تھا۔ دعوت و تبلیغ میں حفظ مراتب کا یہ لحاظ اس حد تک جائز ہے جہاں تک یہ اس دعوت حق کے احترام و وقار کے خلاف نہ ہو۔ جس کو داعی پیش کر رہا ہے۔ اگر یہ لحاظ کسی پہلو سے حق کے وقار کو صدمہ پہنچائے پھر یہ جائز نہیں ہے۔

8.5۔ طریقہ تنبیہ و تادیب

حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ خرابیوں کی جانب اس طرح توجہ دلائی جائے جس سے معلوم ہو کہ یہ کسی مخصوص و معین شخص کی خرابی کا ذکر نہیں کیا جارہا بلکہ اصل مقصد عام لوگوں کی اصلاح ہے اور داعی و مصلح کے دل میں سب کی ہمدردی و اصلاح کا جذبہ موجزن ہے اور اسی نے اسے مجبور کیا ہے کہ وہ اس خرابی کی جانب متوجہ کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا انداز تادیب و تنبیہ یہی تھا کہ اگر کسی خاص شخص کی غلطی کی اصلاح مقصود ہوتی تو آپ براہ راست اسے مخاطب کر کے اس کی جانب متوجہ نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اس سے اس کے اندر نفرت و بیزاری پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ ایسے مواقع پر آپ کا خطاب عام ہوتا تھا گویا آپؐ کو پوری قوم کی اصلاح و ہدایت مطلوب و مقصود ہے اور جس خرابی کا ذکر آپ کر رہے ہیں وہ کسی خاص میں نہیں پائی جاتی بلکہ عام افراد میں موجود ہے۔ خطاب کے اس طریقہ سے بات زیادہ مؤثر اور کارگر ہوتی ہے۔ یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ا۔ نماز میں خشوع و خضوع اور تمکین و وقار ضروری ہے لیکن ابتداء میں یہ ارکان و آداب لازمی نہیں قرار دیے گئے تھے بلکہ بتدریج ان کی تکمیل کی گئی۔ اس کے بعد بھی جب کچھ لوگ نماز میں آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ لیا کرتے تھے تو آپؐ نے ان کی اصلاح کی ضرورت محسوس کی۔ مگر انہیں اس سے باز رہنے کی ہدایت ایسے عام انداز میں کی کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ محض انہیں کو پیش نظر رکھ کر بات کی گئی ہے فرمایا:

ما بال اقوام یرفعون ابصارھم الی السماء فی صلوتھم۔[1]

1۔ البخاری، کتاب الصلوۃ باب رفع البصر الی السماء فی الصلوۃ

"لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ نماز میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا کرتے ہیں"۔

تشدد اور غلو پسند لوگ شریعت کی بیان کردہ ہدایت پر قناعت نہیں کرتے اور اللہ کی دی ہوئی رخصتوں سے فائدہ اٹھانا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے وہ اپنے اوپر ایسی قیود اور بندشیں عائد کر لیتے ہیں جو خدا اور رسول اللہ ﷺ کی جانب سے ان پر عائد نہیں کی گئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کے لوگوں کی مذمت کی ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ آپ ﷺ جن رخصتوں پر عمل پیرا تھے۔ بعض لوگوں کو انہیں کرنے میں تکلف ہوتا تھا۔ جب آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے حمد و ثنا کے عام انداز میں لوگوں کو اس طرح تنبیہ فرمائی:

"ما بال اقوام یتنزّھون عن الشيء أصنعه فو الله إني لأعلمهم بالله وأشدهم له خشية۔[1]

(لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس چیز سے بھی احتراز کرتے ہیں جس کو میں کرتا ہوں۔ خدا کی قسم مجھے اللہ کے بارے میں ان سے زیادہ واقفیت ہے اور میں ان سے زیادہ اس سے ڈرتا ہوں)۔

کسی تعین و صراحت کے بغیر اصلاح و ہدایت اور تلقین وارشاد کا یہ عام انداز اور موثر و بلیغ اسلوب ان حدیثوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں "احدکم" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ گویا اس طرح کی حدیثوں میں کسی ایک شخص کی غلطی پر تنبیہ مقصود ہوتی ہے لیکن خطاب کا رخ عام لوگوں کی طرف کر دیا جاتا ہے تاکہ اس کی زد براہ راست کسی ایک شخص پر نہ پڑے بلکہ اس کے عموم کی وجہ سے ہر شخص کو تنبیہ ہو جائے اور اس شخص کو بھی برا نہ لگے جو واقعی اس فعل کا مرتکب ہو۔

9۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوتی حکمت عملی میں عملیت کا اتمام واکمال

تعلیم و تعلم اور ابلاغی و سماجی نفسیات میں کئی ایک نظریات و تصورات بیان کئے گئے ہیں۔ ان کا مطالعہ تعلیم و تدریس اور دعوت و تبلیغ سے وابستہ افراد کے لیے مفید اور سود مند ہو سکتا ہے۔ عصر حاضر میں انسانیت پسند ماہرین نفسیات نے اپنے نظریات سے جدید نفسیات میں ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ ان ماہرین نے بنیادی طور پر انسان کی فطرت کو کلی انداز میں دیکھا ہے اور انسانی جذبات واحساسات اور انسانی پہلو (Human Factor) کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک موثر ابلاغ اور تعلم کی خوبی یہ ہے کہ داعی انسانی جذبات واحساسات سے ہم آہنگ ہو اور عملی اعتبار سے خود بھی

---

[1] ۔ البخاری کتاب الأدب باب من لم یواجہ النّاس بالعِتاب

اس کام پر عمل پیرا ہو جس کی وہ دعوت دے رہا ہے یا جس کا ابلاغ کر رہا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک مؤثر ابلاغ و تعلم خود مبلغ کا ذاتی کردار اور اخلاق ہے۔ ایک انسانیت پسند ماہر نفسیات ریسٹ (Rest) تعمیر سیرت کے عمل کا تجربہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ عمل چار مرحلوں پر مشتمل ہے:

۱۔ کردار کی تعمیر کے سلسلے میں پہلے مرحلے میں افراد کے اندر اخلاقی حس (Moral Sensitivity) پیدا کی جاتی ہے تاکہ صورت حال پر توجہ دے کر کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے مائل ہو۔

۲۔ دوسرا مرحلہ اخلاقی فیصلہ (Moral Judgement) کرنے کا مرحلہ ہے جہاں اس مخصوص صورتحال میں ممکنہ ردعمل میں سے اخلاقی طور پر مثبت اور مستحسن ردعمل کا انتخاب کریں۔

۳۔ تیسرا مرحلہ اخلاقی تحریک (Moral Motivation) کا ہے جہاں افراد اپنے انتخاب پر عمل پیرا ہونے کے لیے خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

۴۔ چوتھا اور آخری مرحلہ اخلاقی کردار (Moral Character) ہے جہاں افراد نے اخلاقی فیصلوں پر عمل کرنے کے لیے نہ صرف تحریک عمل پاتے ہیں بلکہ نہایت استقلال اور ثابت قدمی سے ان فیصلوں پر عمل کرتے ہیں کیونکہ کردار کا اظہار اعمال سے ہی ہوتا ہے۔[1]

کردار سازی کے پہلے دو مرحلوں کو افراد میں ابھارنے کے لیے انہیں اخلاقی مسائل اور واقعات سے دوچار کرنا ضروری ہے۔ اس لیے تعمیر سیرت و تشکیل ذات کے لیے سب سے اعلیٰ نمونہ خود مبلغ و معلم کا ذاتی کردار اور خلاق ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جس کو وہ دعوت دے رہا ہے کیا وہ خود بھی اس پر عمل پیرا ہے؟ کیا اس کے قول و فعل میں تضاد تو نہیں اور کیا وہ اخلاق حمیدہ سے اپنی ذات کو مزین کئے ہوئے ہے؟ چنانچہ انسانیت پسند یعنی (Humanistic Psychology) میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ استاد، داعی اور مبلغ کی سیرت افراد کے لیے باعث تقلید ہونی چاہیے۔ تاکہ وہ کردار کے اعلیٰ نمونوں کی تقلید کر کے انہیں شخصیت کا حصہ بنائیں۔ دعوت نبوی ﷺ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی ذات والا صفات اخلاق کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھی اور آپ ﷺ کی سیرت و اخلاق کی ایک اور امتیازی شان عملیت بھی ہے۔ یعنی سب سے پہلے خود عمل کر کے دکھایا اور بعد میں اس کے کرنے کا حکم دیا اور آپ ﷺ کی سیرت اور اخلاق کی گواہی خود خالق کائنات نے یوں دی:

1۔ منظور عارف، ڈاکٹر، تعلم نفسیات کے انسانیت پسندانہ تناظر میں، در مجلّہ سہ ماہی تعلیمی زوایے، لاہور، جلد ۵ شمارہ ۲ جولائی ۱۹۹۴

﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیمٍ﴾[1]

اور آپ ﷺ جس مقصد کے لیے بھیجے گئے اور جو بات آپ ﷺ کے مقاصد نبوت میں شامل تھی وہ اخلاق عالیہ تکمیل و اتمام ہے۔آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔[2]

بے شک مجھے اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا۔

بعثت نبوی ﷺ سے قبل کی زندگی بھی آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ کی مثال تھی۔اہل مکہ آپ ﷺ کے اخلاق و کردار کی گواہی دیتے تھے۔مثلاً بناء کعبہ کے وقت جب ''حجر اسود'' کو مخصوص جگہ رکھنے کا مسئلہ در پیش ہوا اور قریش لڑائی جھگڑا تک پہنچ گئے اور آخر فیصلہ ہوا کہ مسجد حرام کے دروازے سے جو شخص پہلے داخل ہو اسے اپنے جھگڑے کا حکم مان لیں۔لوگوں نے یہ تجویز منظور کر لی۔اللہ کی مشیت کہ اس کے بعد سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔لوگوں نے آپ ﷺ کو دیکھا تو چیخ پڑے کہ

ھذا الامین رضینا ھذا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔[3]

ھذا الامین قد رضینا بما قضی بیننا۔[4]

''ھذا الامین قد رضینا بہ فحکموہ''[5]

یعنی سب سے پہلے انہوں نے اس اخلاقی صفت کا ذکر کیا۔جس کی وجہ سے آپ ﷺ ان کے نزدیک مشہور و معروف تھے۔اس کے بعد آپ ﷺ کے اسم مبارک کا ذکر کیا اور اس کے بعد اس مسئلے کے جھگڑے کا جس کے بارے میں آپ ﷺ فیصلہ کریں گے۔

1۔ القلم: ۶۸:۴

2۔ مالک بن انس، امام، الموطا، کتاب حسن خلق باب ماجاء فی حسن الخلق

3۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۱/۱۹۷

4۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۱/۱۲۴

5۔ ازرقی، اخبار مکہ، (تحقیق استاد رشدی الصالح)، دار الثقافہ مکہ مکرمہ ۱۳۸۵ھ ۱/۱۶۴،

یہ نہیں بلکہ آپ ﷺ کی دعوت کے سب سے بڑے مخالف اور آپ ﷺ کے جانی دشمن بھی آپ ﷺ کے اخلاق و کردار کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ابو جہل، عتبہ، ابو سفیان، نضر بن حارث، نے آپ ﷺ کی صداقت، امانت اور شرافت کی گواہی دی۔ ابو جہل نے یوں کہا:

واللہ ان محمدا الصادق و ما کذب محمد قط۔[1]

اللہ قسم محمد ﷺ سچے ہیں انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

نضر بن حارث نے کہا:

''قد کان محمد فیکم غلاما حدثا أرضا کم فیکم وأصدقکم حدیثا، وأعظمکم امانۃ۔[2]

اور پھر جب دعوت عام کے اعلان کا حکم ہوا تو دعوت اسلام کو عام کرنے اور لوگوں تک پہنچانے کے لیے کوہ صفاء پر چڑھے تاکہ لوگوں کو اس سے متنبہ کریں اور ان کو اس دین کی بشارت دیں۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو بلایا، اور جب تمام قبائل کے لوگ اکٹھے ہو گئے تو اس وقت آپ ﷺ نے دعوت دین پیش کی۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا بلکہ اپنے اخلاق اور اپنی ذات کو ہی بطور معجزہ پیش کیا۔ صحیح بخاری میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

أرأیتم لو أخبرتکم أن خیلاً تخرج من بسفح ھذا الجبل، أکنتم مصدقی قالوا ما جرجنا علیك کذبا۔[3]

''لوگو! اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اس پہاڑ کی دوسری طرف ایک بھاری لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو تم میری بات کو سچ مانو گے؟ سب نے کہا ہاں کیونکہ ہمارے تجربہ میں ہے کہ آپ ﷺ کبھی بھی جھوٹ بولنے والے نہیں رہے۔''

اس واقعہ سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت و کردار کے بارے میں مشرکین مکہ کی رائے معلوم ہوتی ہے اور پھر

1۔ قاضی عیاض، الشفاء بتعریف الحقوق المصطفی ﷺ ۱/۱۸۱

2۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۱/۲۹۹

3۔ البخاری، کتاب التفسیر، تبت یدا ابی لھب

آپ ﷺ کے دعوتی اسلوب وابلاغ کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے علاقہ کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک خاص آواز (یاصباحاہ) لگائی جو کہ کسی خطرہ یا دشمن کے حملے کے وقت لگائی جاتی تھی تاکہ لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ جب تمام قریش اکٹھے ہو گئے تو آپ ﷺ نے اپنی سیرت کو اس انداز سے پیش کیا کہ سب نے کہا آپ ﷺ سچے ہیں۔ جب ان کا اعتماد آپ ﷺ کی سیرت کے حوالے سے واضح ہو گیا تو پھر آپ ﷺ نے دعوت حق کو پیش فرمایا۔ الغرض رسول اللہ ﷺ نے اپنی سیرت واخلاق کو بطور نمونہ کے پیش فرما کر اپنی دعوت کی حقانیت وصداقت کو ثابت فرمایا کہ جس سے انکار وفرار ناممکن تھا۔ اور پھر انتہائی قلیل عرصہ میں یہ دعوت نہ صرف جزیرۃ العرب بلکہ عالمی سطح تک پھیل گئی اور امراء وملوک اور روساء حکمرانوں نے اسے اختیار کیا کیونکہ اس کی اساس وبنیاد آپ ﷺ کی امتیازی شان "عملیت" پر تھی اور یہی آج کی جدید نفسیات کا خاصہ ہے کہ اس کے نزدیک بھی موثر ابلاغ اور تعلیم کے لیے اولین شرط معلم و مبلغ کا ذاتی کردار اور اس کی عملیت ہے۔

مندرجہ بالا دلائل وبراہین سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن حکیم میں بیان کردہ اصول دعوت کے مطابق اسلام کی تعلیمات کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر ہزاروں لوگوں نے نہ صرف یہ گواہی دی کہ آپ ﷺ نے دین حق کو پہنچا دیا بلکہ آپ ﷺ نے اس کے ابلاغ کا حق ادا کر دیا۔ دور حاضر میں ملت اسلامیہ دعوت و تبلیغ میں وہی حکمت عملی اور منہاج دعوت اختیار کر کے کامیابی حاصل کر سکتی ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے پیش فرمایا اور جس کو دعوت میں اپنانے کی تلقین فرمائی۔

خود آزمائی

1۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوتی حکمت عملی بیان کریں۔

2۔ رسول اکرم ﷺ طریق دعوت کے نمایاں پہلوؤں بیان کریں۔

3۔ دعوت نبوی ﷺ میں تدریج کی اہمیت اجاگر کریں۔

4۔ دعوت نبوی ﷺ میں مخاطب کی نفسیات کا کس قدر لحاظ رکھا گیا بیان کریں۔

5- دعوت میں داعی کے عملی کردار کی کس قدر اہمیت ہے۔ سیرت طیبہ کی روشنی میں بیان کریں۔

ماخذ و مصادر

۱۔ دعوت دین اور اس کا طریقہ کار — مولانا امین احسن اصلاحی

۲۔ رسول اللہ ﷺ کا طریق تربیت — مولانا سراج الحق ندوی

یونٹ نمبر7

دعوتی تحریکات، جماعتیں و تنظیمات

تالیف:

ڈاکٹر محمد سجاد

فہرست

	صفحہ نمبر
یونٹ کا تعارف	265
یونٹ کے مقاصد	265
1۔ تبلیغی جماعت	266
1.1۔ مولانا محمد الیاس کاندھلوی، احوال وآثار اور دعوتی فکر	266
1.2۔ تبلیغی جماعت، دعوت، تنظیم، طریقہ کار	275
2۔ دعوت اسلامی: تعارف ومقاصد	281
2.1۔ دعوت اسلامی کے آغاز کا پس منظر واسباب	283
2.2۔ دعوت اسلامی کی اہمیت	289
2.3 ۔ دعوت اسلامی کا طریق کار	295
3۔ اسلام سرکل آف نارتھ امریکہ	307
4۔ اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ	316
5۔ الرسالہ: دعوتی تحریک	324
5.1۔ مولانا وحید الدین خان کے احوال اور دعوتی فکر وخدمات	324
خود آزمائی	340

یونٹ کا تعارف

تحریک تبلیغ، عصر حاضر کی سب سے بڑی اصلاحی و فکری و عملی تحریک ہے جو پورے عالم میں دین کی دعوت اور اس کے پیغام کو پہنچا رہی ہے، اس تحریک کا آغاز مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ نے میوات سے کیا۔ مولانا کی فکر یہ تھی کہ، موجودہ دور میں امت کا زوال اور پستی کی بنیادی وجہ، اس کے اصل کام یعنی، امر بالمعروف نہی عنی المنکر کو چھوڑ دینا ہے، جس کے لیے یہ اُمّت پیدا کی گئی ہے۔ چنانچہ آپ نے سلف صالحین کے طریقہ پر دعوت و تبلیغ کا ایک اسلوب اپنایا اور گھر گھر قریہ قریہ، شہر شہر اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے جماعتوں کی روانگی شروع کی، تھوڑے ہی عرصہ میں اس کے نتائج حوصلہ افزا نکلے۔ آج دنیا کے ہر کونے میں، تبلیغی جماعتیں گشت کر رہی ہے اور امت کو بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ، دعوت و تبلیغ اور اصلاح اعمال کا فریضہ بھی سر انجام دے رہی ہیں۔ تحریک تبلیغ کا اپنا طریق کار اور نصاب دعوت ہے، جس کو وہ اپنائے ہوئے ہے۔ دعوت اسلامی ایک دوسری جماعت ہے جو تبلیغی مشن کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ مولانا محمد الیاس قادری نے عصری وسائل و ذرائع سے خوب دعوتی کام لیا ہے۔ اس تحریک کے مقاصد میں اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ پوری انسانیت کی اصلاح کے لیے کوششیں شامل ہیں۔ عصری دعوتی تحریکات میں الرسالہ کو منفرد حیثیت حاصل ہے۔ مولانا وحید الدین خان کی تحریرات میں دعوت و تبلیغ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ دعوتی ادب کے فروغ میں مولانا وحید الدین خان کی نمایاں خدمات ہیں۔ اسی امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں نے دعوت و اصلاح کے لیے دو تنظیموں کی بنیادیں رکھیں، جن میں ایک اسلام سر کل آف نارتھ امریکہ اور دوسری اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ ہے اس یونٹ میں ان پانچ دعوتی جماعتوں کی خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ تحریک تبلیغ کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔
2۔ تبلیغی جماعت کی دعوت اور طریقہ کا مطالعہ کر سکیں۔
3۔ مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی دعوتی فکر کے بارے میں جان سکیں۔
4۔ دعوت اسلامی کے قیام کا فکری پس منظر جان سکیں۔
5۔ دعوت اسلامی کے مقاصد کا مطالعہ کر سکیں۔
6۔ مولانا وحید الدین خان کی دعوتی فکر کا مطالعہ کر سکیں۔
7۔ اسلام سر کل آف نارتھ امریکہ اور اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے مشن اور دعوتی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

1۔ تبلیغی جماعت

1.1۔ مولانا محمد الیاسؒ کے احوال وآثار اور دعوتی فکر

برعظیم پاک وہند اور بنگلہ دیش میں تبلیغی تحریک سے وابستہ افراد کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے اور اس کے متعلقین دنیا کے کئی ایک ممالک میں موجود ہیں واقعہ یہ ہے کہ اس جیسی تحریک کی مثال دنیا میں اس وقت کہیں نہیں ملتی دن بدن اس میں پھیلاو مشاہدہ کی بات ہے اکثر وبیشتر حلقوں میں اس کے فروغ اور وسعت کو بانی تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے اخلاص اور امت کے لیے ان کے سوز دروں کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ تبلیغ تحریک کی بدولت بیشمار افراد کے کلمے درست ہوئے، نمازیں استوار ہوئیں اور دین سے تعلق پیدا ہوا، اس کے ساتھ ہی اس سے تحریک سے بعض وابستگان اور داعیان کے بیانات سے جو تاثر قائم ہوتا ہے اس سے دین کے دیگر پہلوئوں کی کم وقعتی کا احساس ہوتا ہے بسا اوقات تبلیغ کے اس مخصوص طریق کار کو حاصل دین قرار دینے کی سوچ بھی سامنے آتی ہے۔

لہذا ضروری ہے کہ اس تحریک کے بانی کے حالات وافکار کا مطالعہ کیا جائے کہ ان کے ہاں دین کا تصور کیا ہے اور ان کی زندگی کے ان پہلوؤں پر غور کیا جائے جن سے مولانا محمد الیاسؒ کی سوچ کی بنیادیں استوار ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت مولاناؒ کی فکر اپنے والدین اور گھریلو ماحول سے متاثر ہونے کے علاوہ اس کو اپنے اکابر اور اساتذہ سے بھی جلا ملی ہے اس لیے ان کی سوچ کے زاویئے اپنے اساتذہ اور مشائخ کی صحبت میں ہی درست ہوئے اور جو ان کے اکابرین کی فکر تھی وہی ان کی شعوری اساس تھی تاہم اس اساس پر تعمیری منصوبہ بندی میں ان کی ذاتی کاوشوں کو عمل دخل حاصل ہے۔ جب مولانا کی زندگی کا اس حوالہ سے مطالعہ کیا جائے اور ان کے اپنے بیان کردہ خیالات کے آئینہ میں دیکھا جائے تو وہاں تعلق باللہ، عبادت، ذکر، علم کی اہمیت کے علاوہ جہاد وسیاست، انسانی حقوق کی پاسداری وغیرہ یعنی دین کا مکمل تصور نظر آتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ان کی تحریک بجائے خود مستقل نہیں بلکہ ولی اللہی سلسلہ کے اہل حق کی جدوجہد کا ایک حصہ ہے۔

حضرت مولانا الیاس نے ۱۳۰۳ھ میں جب آنکھ کھولی [1] تو اپنے ارد گرد تعلق باللہ کے بنیادی امر کے علاوہ خدمت خلق کا ماحول دیکھا چنانچہ ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں۔

---

[1]۔ سید ابوالحسن علی ندوی حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت (کراچی مجلس نشریات اسلام 1985ء ص 46)

مولانا محمد الیاسؒ کے والد مولانا محمد اسماعیل صاحب کے لیے ذکر و عبادت، آئے گئے مسافروں کی خدمت اور قرآن مجید و دین کی تعلیم شب و روز کا مشغلہ تھا، خدمت و تواضع کا یہ عالم تھا کہ جو مزدور بوجھ لادے ہوئے پیاسے ادھر آنکلتے تھے ان کا بوجھ اتار کر رکھ دیتے، اپنے ہاتھ سے ڈول کھینچ کر ان کو پانی پلاتے پھر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتے کہ اے اللہ تونے مجھے اپنے بندوں کی خدمت کی توفیق دی میں اس قابل نہ تھا عام اجتماع و ہجوم کے زمانے میں پانی اور لوٹوں کا خاص اہتمام رکھتے اور رضائے الٰہی اور قربت خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خلق خدا کی راحت رسانی اور خدمت میں مشغول رہتے۔[1] مولانا محمد اسماعیلؒ کی وفات ۱۳۱۵ھ میں ہوئی۔ گویا حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کو اپنی عمر کے ابتدائی بارہ تیرہ برس اپنے والد کے معمولات دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ عمر کا وہ حصہ ہے جس میں جو چیز ذہن پر نقش ہو جائے اس کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں وہ اس عمر میں اپنے والد محترم کو ذکر عبادت اور دین کی تعلیم کے علاوہ انسانوں بالخصوص مسافروں اور مزدوروں کی خدمت میں مشغول دیکھتے رہے لامحالہ ان کے ذہن میں دین کی عمارت خدا پرستی اور انسان دوستی کی بنیادوں پر قائم ہوئی۔

بعدازاں جب زندگی کے اس دور کا آغاز ہوا جس میں انسان کی سوچ کے خطوط متعین ہوتے ہیں تو آپ گنگوہ آگئے جہاں آپ کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی صحبت میں دس سال رہنے کا موقع ملا۔ حضرت گنگوہیؒ کی اپنی زندگی جہاں ایک طرف عبادت و ریاضت اور عشق الٰہی سے عبارت تھی وہاں اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جہد مسلسل کا دوسرا نام تھی۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے موقع پر جب علمائے حق نے شاملی کے میدان میں انگریز کے خلاف علم جہاد بلند کیا تو حضرت گنگوہیؒ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی قیادت میں وزیر لام بندی کی حیثیت سے شریک تھے۔[2] اس کے علاوہ سیاست کے میدان میں حضرت گنگوہیؒ کا نقطہ نظر بہت ترقی پسندانہ تھا ان کا فتویٰ تھا کہ دنیاوی معاملات میں اسلام کے بنیادی اصولوں کو نقصان پہنچائے بغیر غیر مسلموں سے تعاون جائز ہے۔ ۱۸۸۵ء میں جب انڈین نیشنل کانگرس وجود میں آئی تو آپ نے اس میں مسلمانوں کی شمولیت کی بات کی تھی۔[3]

اس امر کی بظاہر کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ حضرت گنگوہیؒ کی صحبت میں شعور کی حالت میں دس سال رہنے

---

1 ۔ ایضاً، ص ۴۶

2۔ ایضاً، ص ۴۶

3۔ سید مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی (دارالعلوم دیوبند ۱۳۷۳ھ)، ج ۲، ص ۱۲۷

والا فرد ان کے افکار سے متاثر نہ ہوا ہو حالانکہ محمد الیاسؒ کو حضرت گنگوہیؒ سے گہرا لگاؤ بھی تھا چنانچہ ان کا قول ہے کہ ہم نے تو ساری عمر کا رونا اس رونا رو لیے تھا جس روز حضرتؒ دنیا سے رخصت ہوئے۔) گنگوہ میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے قیام کے بارے میں مولانا ابو الحسن علی ندوی رقم طراز ہیں، مولانا حصول علم کے لیے والد صاحب کی اجازت سے اپنے منجھلے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب کے ہمراہ 1314ھ یا 1315ھ میں گنگوہ آگئے اور بھائی صاحب سے پڑھنا شروع کر دیا۔ گنگوہ اس وقت صلحاء فضلاء کا مرکز تھا ان کی اور خود مولانا رشید احمد صاحبؒ کی صحبت اور مجالس کی دولت مولانا محمد الیاسؒ کو شب و روز حاصل تھی، دینی جذبات کی پرورش نیز دین کی سمجھ اور اس کا سلیقہ پیدا کرنے میں ان کیمیا اثر صحبتوں اور مجالس کو جو دخل ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں، مولانا کی دینی اور روحانی زندگی میں اس کی ابتدائی ماحول کا فیض برابر شامل رہا انسان کی زندگی میں مقام ماحول کا اثر قبول کرنے کا جو بہترین زمانہ ہو سکتا ہے، مولانا محمد الیاسؒ صاحب کا وہ زمانہ گنگوہ میں گزرا جب گنگوہ آئے تو دس گیارہ برس کے بچے تھے جب 1323ء میں مولانا گنگوہیؒ نے وفات پائی تو بیس سال کے جوان تھے گویا دس سال کا عرصہ مولانا کی صحبت میں گذرا۔

مولانا محمد یحییٰ کامل استاد اور مربی تھے وہ اس بات کا خاص اہتمام رکھتے تھے کہ ہونہار بھائی ان صحبتوں اور مجلسوں کے فیوض سے پورے طور پر مستفید ہو مولانا محمد الیاسؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب حضرت گنگوہیؒ کے خاص فیض یافتہ اور تربیت یافتہ علماء گنگوہ آئے تو بعض اوقات بھائی درس بند کر دیتے اور کہتے اب تمہارا درس یہ ہے کہ تم ان حضرت کی صحبت میں بیٹھو اور ان کی باتیں سنو۔ [1]

حضرت مولانا گنگوہیؒ کے جو خصوصی تربیت یافتہ حضرات گنگوہ آتے تھے ان میں آپ کے خلیفہ اجل حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری بھی شامل تھے جو بعد میں اس تحریک جہاد کے قائد بنے جس کا مقصد انگریز کو ہند بدر کرنا تھا۔ [2]

حضرت گنگوہیؒ کے رحلت کے بعد مولانا محمد الیاسؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (1339ھ) کے حلقہ درس میں شریک ہوئے۔ [3]

1۔ سید ابو الحسن علی ندوی، حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، ص ۵۶
2۔ موسیٰ جار اللہ، الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن، حیدر آباد نفیس پرنٹنگ پریس، ص ۱۳۶
3۔ سید ابو الحسن علی ندوی، حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، ص ۵۷

جہاں آپ نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اپنے استاد کے سیاسی جذبات سے بھی گہرا تاثر قبول کیا، یہی سبب ہے کہ حضرت مولانا شیخ الہندؒ سے بیعت سلوک کے علاوہ بیعت جہاد کے بھی طالب ہوئے، حضرت شیخ الہند نے بیعت سلوک کے لیے تو حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے رجوع کا مشورہ دیا۔[1] لیکن بیعت جہاد کے لیے ان کی درخواست قبول کر لی۔[2]

حضرت شیخ الہندؒ کا جہاد سامراج کے خلاف تھا اس وقت آزادی سے محبت اور انگریز سے نفرت کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مالٹا کی جیل سے رہائی کے بعد ترک موالات (یعنی انگریز کے سوشل بائکاٹ) کا استفتاء آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اپنے تین شاگردوں مولانا مفتی محمد کفایت اللہ، مولانا سید حسین احمد اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو جمع کر کے فرمایا کہ یہ فتویٰ آپ لوگ لکھیں ان حضرات نے عرض کیا کہ حضرت آپ کی موجودگی میں ہم کیا لکھیں گے فرمایا کہ مجھ میں انگریز سے نفرت کا جذبہ شدت لیے ہوئے ہے مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے کہ حدود کی رعایت ہو سکے گی اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے،

کسی قوم کی عداوت تمہیں عدل سے نہ ہٹائے۔ اس لیے آپ لوگ ہی لکھیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کرنے سے مولانا محمد الیاسؒ کی اس قلبی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس سے وہ اس وقت گذر رہے تھے ملک کی غلامی اور مسلمانوں کی بربادی نے انہیں انگریز کے خلاف اقدام کرنے پر جس طرح آمادہ کیا اس سے تاثر کی نفی ہو جاتی ہے کہ وہ محض چند دینی باتوں کے مبلغ تھے بلکہ اس بیعت سے ان کی زندگی کے حقیقی مشن کو متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے کہ ان کی سوچ کسی طرح اپنا اکابرین سے مختلف نہیں تھی۔[3]

یہ الگ بات ہے کہ اس کو عمل میں لانے کے لیے ان کا طریقہ کار اپنا تجویز کردہ تھا لیکن طریق کار کی تبدیلی سے مقاصد متاثر نہیں ہوا کرتے بلکہ ہر باشعور فرد کی ذمہ داری ہوتی کہ وہ مقاصد کو پایا تکمیل تک پہنچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ موثر طریقہ دریافت کرے۔ مولانا محمد الیاسؒ کو اپنے اکابر سے جو قلبی تعلق تھا اس کی موجودگی میں ان کی

1۔ ایضاً، ص ۵۷

2۔ ایضاً، ص ۵۸

3۔ ایک مرتبہ لال قلعہ دہلی کے پاس سے گزرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی نے دریافت کیا کہ کبھی جناب نے لال قلعہ بھی دیکھا ہے؟ فرمایا میں لال قلعہ کی سیر کو بے حمیتی سمجھتا ہوں، میں نے بچپن میں اس وقت دیکھا ہے جب دکھانے والے رو رو کر دکھایا کرتے تھے۔ (سید ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، ص ۲۰۳)

تحریک کو مستقل تحریک خیال کرنا محض ایک خانہ ساز تصور ہے چنانچہ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری "مولانا محمود حسن" (شیخ الہند) اور مولانا اشرف علی تھانویؒ میرے جسم و جان میں بسے ہوئے تھے اور اکابرین کو بھی مولانا کی امتیازی خصوصیت کی وجہ سے خصوصی محبت اور لحاظ تھا ایک مرتبہ کاندھلہ میں شاہ عبدالرحیم پوری مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اور مولانا اشرف علی تھانوی موجود تھے، نماز کا وقت آیا تو امامت کے لیے آپ کو کہا گیا اس پر خاندان کے ایک بزرگ مولوی بدر الحسن نے ازراہ ظرافت کہا کہ اتنی بڑی بڑی گاڑیاں اور ایسا ہلکا پھلکا انجن جوڑ دیا ہے حضرت میں سے کسی نے کہا کہ یہ تو انجن کی طاقت پر ہے۔[1]

الغرض مولانا محمد الیاسؒ کی سوچ مکمل طور پر اپنے اکابر اساتذہ مشائخ سے ہم آہنگ تھی، ان کی تحریک کا مطالعہ اسی پس منظر میں کیا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ وہ خود اپنا اختیار کردہ تبلیغی طریقہ کار کو اساس و بنیاد کی بجائے تمہید کی حیثیت دیتے ہیں وہ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں۔

"دین کے ادارے اور جتنے بھی ضرورت کے امور ہیں ان سب (دینی امور) کے لیے تبلیغ (صحیح اصول کے ساتھ ملک ملک پھرتے ہوئے کوشش کرنا) بمنزلہ زمین ہموار کرنے کے ہے اور بمنزلہ بارش کے ہے اور دیگر جتنے بھی امور ہیں وہ اس زمین مذہب کے اوپر بمنزلہ باغات پرورش کرنے کے ہیں۔"[2]

اس مکتوب کی موجودگی میں بالخصوص تمہیدی امور کو اساسی مقام دے دینا اور درحقیقت بانی تحریک کی فکر سے انحراف ہے اور جو ایسا کر رہے ہیں ان کے اپنے مخصوص مقاصد تو ہو سکتے ہیں لیکن اس سے حضرت مولاناؒ کا کوئی تعلق نہیں بنتا، یہی وجہ کہ آپ نے دین کی مکمل تعبیر کے لیے شریعت، طریقیت اور سیاست کو بنیادی اجزاء قرار دیا ہے، اور تبلیغی کام کو ان کے حصول کا ذریعہ[3]

عام طور پر دین کے دو اجزاء ہی بتائے جاتے ہیں شریعت و طریقت کہ ایک تعلق انسان کے ظاہری اعمال سے ہے اور دوسرے کا تعلق انسان کے باطنی افعال سے ہے لیکن مولانا محمد الیاسؒ نے شریعت ہی کے ایک حصے سیاست کو علیحدہ ذکر کر کے اس کی بنیادی اہمیت کو اجاگر کیا ہے گویا ان کے ہاں سیاست کی اہمیت۔ سیاسی عمل کی ضرورت ان کے

1۔ ایضاً، ص۵۹۔۵۸

2۔ ایضاً، ص ۲۴۲

3۔ افتخار فریدی، ارشادات و مکتوبات حضرت مولانا محمد شاہ محمد الیاسؒ، رائے ونڈ مکتبہ دینیات بار اول ۱۹۸۱، ص ۲۲

اس قول سے بھی ظاہر ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی کی برکت سے انگریزوں کا مقابلہ کرنا ہے اور یہ کام بھی نہیں چھوڑنا ہے۔[1]

بلکہ وہ اپنے تبلیغی کام کو سیاسی کام کرنے والوں کے لیے ستر اور آڑ قرار دیتے ہیں۔[2]

مولانا محمد الیاسؒ کے ان خیالات سے ان کی فکری پس منظر کو صحیح طور پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے ایسے میں ان کے کام کو سیاست سے متضاد سمت رکھنے والا کام قرار دینا کسی طرح قرین انصاف نہیں بلکہ ایک حوالہ سے ان پر تہمت ہے تاہم اس سے انکار نہیں کہ ان کے ہاں ایک فطری ترتیب ضرور پائی جاتی ہے اور اس ترتیب کا لحاظ رکھے بغیر سیاسی عمل کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں دے سکتا کیونکہ کسی بھی اقدام کے لیے تیار ہونا از حد ضروری ہے۔

اس لیے حضرت مولاناؒ کا یہ نظریہ تھا کہ ایک عرصہ تک صبر وضبط کے ساتھ دعوت کے اصول پر کام کرنے کی ضرورت ہے جس سے مسلمانوں میں نظم و ضبط کی قابلیت اطاعت، ڈسپلن کا مزاج، خواہشات نفس اور ذاتی اغراض و مفادات کے برعکس کسی اصولی موقف پر استقامت کی قوت پیدا ہوگی۔اس کے بعد ہی عملی سیاست صحیح بنیادوں پر استوار ہو سکے گی اگر دعوت کے مرحلہ میں غیر مناست عجلت یا تیز رفتاری سے کام لیا گیا تو سیاست اسی قدر ناپائیدار ہو گی چنانچہ موجودہ اختلاف انتشار اور خرابیوں کا سبب یہی کہ دعوت سے پہلے عملی سیاست شروع کر دی گئی ہے۔[3]

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ بندہ ناچیز کے دماغ میں کچھ ایسے ایسے خیالات ہیں کہ قبل از وقت ہونے کی بناء پر زبان سے نکالنے کو جی نہیں چاہتا اور اس کی وجہ تھی کہ انہوں نے جس کام کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا اور جس کی دعوت دی تھی وہ ان کے ماحول سے بالکل مناسبت نہیں رکھتی تھا وہ اس زمانہ اور گردو پیش کی سطح سے بہت بلند تھا اس لیے بلند عزائم اور اپنے دلی حوصلوں کا اظہار بہت کم کرتے تھے پھر بھی کبھی ترشح ہو جاتا۔[4]

چنانچہ ایک مرتبہ مولانا ظہرالحسن سے فرمایا ظہیرالحسن میرا مدعا کوئی نہیں پاتا لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تحریک صلوۃ ہے میں قسم سے کہتا ہوں کہ یہ تحریک صلوۃ نہیں۔[5]

1۔ ایضاً، ص ۳۸

2۔ ایضاً، ص ۳۸

3۔ سید ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، ص ۲۵۰

4۔ سید ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، ص ۲۰۱

5۔ ایضاً، ص ۱۹۹

غرضیکہ مولانا محمد الیاسؒ کی سوچ محض چند عبادات کی تلقین و تبلیغ تک محدود نہیں تھی، بلکہ آپ مکمل دین کا احیاء چاہتے تھے اور اسی مشن کے لیے آپ ایک جماعت سے تیار کرنے کے لیے سر گرم عمل رہے اس سلسلے میں آپ کے سامنے ابتداء ہی سے صحابہ کرام کا اسوہ اور ان کی جدوجہد رہی۔

حضرت مولاناؒ کی نانی اماں بی امتہ الرحمان [1] فرمایا کرتی تھیں اختر [2] مجھے تجھ سے صحابہ کی خوشبو آتی ہے کبھی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فرماتیں کہ کیا بات ہے کہ تیرے ساتھ مجھے صحابہ کی سی صورتیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ بھی فرمایا کرتے تھے کہ جب میں مولوی الیاس کو دیکھتا ہوں تو مجھے صحابہ یاد آجاتے ہیں۔ [3]

صحابہ کرام کی زندگی کیا تھی اس پر تاریخ کی کتابیں شاید ہیں کہ ایک طرف عبادت الہی اور خدا پرستی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا تو دوسری جانب انسانیت دوستی ان کا مشن تھا۔ حضرت مولاناؒ اسی جامع زندگی کا احیاء چاہتے تھے جس میں عبادت خداوندی کے ساتھ خدمت خلق کو بھی بنیادی اہمیت حاصل ہو چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

"بیوی بچوں کے حقوق، والدین کے حقوق، پڑوسی کے حقوق، تمام مسلمانوں کے حقوق انسانوں کے حقوق، پرندے اور اللہ کی ساری مخلوق کے حقوق و جمادت و نباتات کے حقوق ہیں ان سب کی ادائیگی ترتیب وار ضروری ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں اللہ کے حکم ہیں، اللہ اپنے حقوق کی کمی تو معاف فرمادیں گے لیکن حقوق العباد کو معاف نہیں کریں گے اس لیے حقوق العباد کی ادائیگی میں نہایت احتیاط اور ہوشیار سے کام لینا چاہیے۔" [4] مزید فرماتے ہیں کہ خدمت خلق کے ذریعہ خدا کا راستہ ملتا ہے، اس نے اپنا راستہ اپنی مخلوق کی خدمت کے ذریعہ ہی رکھا ہے۔ [5] یہ اللہ کا تحفہ ہے اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں جب کہ عبادات تو صرف اپنے نفس کے فائدے کے لیے ہیں۔ [6]

1۔ آپ مولانا مظفر حسینؒ صاحب کی صاحبزادی تھیں، ان کی نماز کا یہ حال تھا کہ حضرت مولانا محمد الیاس نے ایک مرتبہ فرمایا کہ امی بی کی نماز کا نمونہ میں نے مولانا گنگوہی کو نماز میں دیکھا اور مولانا گنگوہی کی نماز اپنے طبقہ میں ممتاز تھی۔ (ایضاً ص ۵۰)

2۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کا تاریخی نام اختر الیاس تھا (ایضا ص ۴۹)

3۔ ایضاً ص ۵۲

4۔ افتخار فریدی، ارشادات و مکتوبات حضرت مولانا محمد الیاسؒ، ص ۶۷

5۔ ایضاً ص ۷۱

6۔ ایضاً ص ۷۷

کس قدر واضح اور غیر مبہم انداز میں مولانا نے انسانیت دوستی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے ظاہر ہے کہ یہ رویہ کسی طرح بھی معاشرتی ذمہ داریوں سے گریز اور فرار کی اہمیت رکھنے والوں سے مطابقت نہیں رکھتا جن کے ہاں انسان اور انسانی حقوق چنداں اہمیت نہیں رکھتے اور جن کی تمام تر دینداری چند رسوم کی ادائیگی اور بے روح عبادات کے ارد گرد گھومتی ہے اور اسی معیار پر وہ دیگر انسانوں کو پرکھتے ہیں جب کہ مولانا محمد الیاسؒ کے ہاں تصوف و سلوک کی اہم ترین بنیاد بھی خدمت خلق ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ دل آئینہ ہے اس میں خدا نظر آتا ہے لیکن اس آئینہ کو صاف کرتے رہنا چاہیے، یعنی صفات رزیلہ سے پاک کرنا چاہیے صفات محمودہ اپنی عادت بنانی چاہیے اور صفات رذیلہ دور کرنے کے لیے خدمت خلق ہے۔[1]

اسی نوعیت کا ان کا ایک اور زریں مقولہ ہے، اللہ کی رحمت آتی ہے عبد بننے میں، عبد بننا آتا ہے خدمت خلق کرنے سے۔[2]

حضرت مولانا محمد الیاسؒ فرماتے ہیں:

''شبہ یہ ہے کہ اخلاق (انسان دوستی) بڑا ہے یا ارکان (نماز روزہ وغیرہ) جڑ کے اعتبار سے ارکان بڑے ہیں اور نتیجہ کے اعتبار سے اخلاق بڑا ہے حقوق اللہ معاف ہو جائیں گے مگر حقوق العباد کو اللہ معاف نہیں کرے گا اس معنی میں اخلاق بڑی چیز ہے۔[3]

ایک اور موقع پر فرمایا، اخلاق دین کی جڑ ہے حتی کہ نماز بھی اخلاق کی درستی کے لیے ہے۔[4]

مولانا محمد الیاس کے ہاں اخلاق کی درستی کے لیے خدمت خلق کے ساتھ ساتھ مسلمانوں سے دلی تعلق اور محبت بھی ضروری ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

''یہ سب عمل یعنی نماز روزہ وغیرہ درست نہیں کر سکتے جب تک کہ اللہ کی محبت و عظمت نہ ہو جائے اور اللہ کی عظمت و محبت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ ذکر و شغل نہ کیا جائے اور ذکر و شغل درست نہیں جب تک وساوس کو دفع نہ کیا جائے اور وساوس کیا ہیں صفات رذیلہ کا پھل ہیں اور یہ دفع نہیں ہو سکتے جب تک کہ قرآن اور اللہ کی

1۔ ایضاً ص ۹۷

2۔ افتخار فریدی، ارشادات و مکتوبات حضرت مولانا محمد الیاسؒ، ص ٦٧

3۔ ایضاً ص ۴۸

4۔ ایضاً ص ۱۰۰

عظمت نہ پیدا کی جائے اور یہ پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ مسلمانوں سے محبت والفت نہ پیدا کی جائے۔ [1]

مسلمانوں سے محبت والفت در حقیقت انسانیت دوستی کا ہی ایک مظہر ہے جس سے انسان کے اندر وہ بنیادی صفات پیدا ہوتی ہیں جس کے ذریعہ وہ ادائیگی حق کا فریضہ انجام دیتا ہے جو اس کے منصب اخلاق کا ناگزیر تقاضا ہے اسی منصب خلافت کی وجہ سے اس کی قیمت ہے باقی اس کے اعتبارات ضمنی اور ثانوی نوعیت کے ہیں۔ [2]

انسان کو خلیفۃ اللہ ہونے کی بنا پر اس دنیا میں اپنا کردار لازماً ادا کرنا ہے جبکہ اس کے برعکس بعض حلقوں میں دینداری کا تصور یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دینوی مشاغل سے الگ تھلگ کر لے اور ایک نوع کی راہبانہ زندگی اختیار کر لے ایسے لوگ ان احادیث کو پیش کرتے ہیں جن میں دنیا ومافیہا کو قابل لعنت قرار دیا گیا ہے لیکن اس سلسلے میں متوازن سوچ یہ ہے کہ دنیا کو رضائے الٰہی اور قربت خداوندی کے حصول کا ذریعہ تو مانا جائے، مقصد حیات قرار نہ دیا جائے گویا جس طرح دنیا کو ہی اپنی زندگی کا ہدف اساسی قرار دے لینا غلط ہے اسی طرح یہ سوچ بھی خام ہے کہ دنیا کو بالکل ناقابل التفات گردانا جائے اس سلسلے میں مولانا محمد الیاسؒ نے اپنے مکتوبات [3] میں راہ اعتدال کی وضاحت کی ہے کہ ایک جانب تو احادیث میں دنیا کو قابل لعنت قرار دیا گیا ہے جب کہ دوسری طرف تلاش رزق کا حکم دیا گیا ہے تو ایسے میں معیشت دنیا کے اسباب میں مشغولیت کو دنیا قرار دے کر اسے لائق نفرت ٹھہرانا درست نہیں کیونکہ لعنت کی چیز کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں ہو سکتا گویا دنیا کا مفہوم عام نگاہوں میں غلط ہے۔ لہذا جس چیز کا حکم ہے اس میں حکم کی وجہ سے مشغولیت اور اس میں حلال و حرام کا دھیان تو دین ہے دنیا نہیں تاہم حکم سے قطع نظر از خود اپنی ضرورت کا احساس کرنا اور اسے اپنے تئیں ضروری قرار دینا کہلائے گا۔ گویا مولانا کے نزدیک اسی دنیاوی مصروفیت کے اندر رہی سچے احساسات اور درست عمل سے دین کو حاصل کیا جا سکتا ہے اس کے لیے ترک دنیا نہ ضروری ہے اور نہ پسندیدہ، چنانچہ مولانا دین کی مثال اس لعاب دہن سے دیا کرتے تھے جس کی تھوڑی سے مقدار کی شمولیت بغیر نہ کسی چیز میں ذائقہ پیدا ہوتا ہے اور نہ وہ چیزیں ہضم ہوتی ہیں۔ [4]

1۔ ایضاً ص ۱۰۳

2۔ ایضاً ص ۳۰

3۔ سید ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، ص ۲۰۱

4۔ ایضاً ص ۱۰۵

گویا دین کو اگر دنیاوی مشاغل تعلقات میں پیش نظر رکھ لیا جائے تو یہی دنیا دین بن جاتی ہے لہذا ترک اسباب یا ان کی کلیتہ نفی کا نظریہ درست نہیں بلکہ اسباب تو اللہ کی نعمت ہیں ان کا استعمال میں آنا ضروری ہے لیکن یہ خیال رہے کہ ان پر اس طرح نظر نہ جم جائے کہ خالق اسباب کی جگہ اسباب لے لیں چنانچہ مولانا اراہ اعتدال کی وضاحت دونوں انتہائو ں پر یوں روشنی ڈالتے ہیں کہ اسباب اختیار نہ کرنے والا زندیق جب کہ اسباب پر نظر رکھنے والا مشرک ہے۔[1]

الغرض حضرت مولانا محمد الیاس کا تصور دین جامع اور متوازن ہے اس کو روبہ عمل لانے کے لیے ہر مسلمان سرمایہ پرستانہ اور پر تعیش زندگی جو اسلام کے راہ راست سے ہٹی ہوئی اور بگڑی ہوئی زندگی ہے کو ترک کر کے اسلام کی نصرت و خدمت اور اس کے عملی کاموں میں شخصاً شریک ہو یا جو لوگ ان کاموں میں مشغول ہیں ان کے لیے پشت پناہ بنے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کاموں میں خود عملاً شریک ہونے کا عزم اور جذبہ رکھتا ہو اور صرف کسی معذوری یا دینی مصلحت کی وجہ سے ہی وقتی طور پر اس سے علیحدہ ہو۔[2]

1.2۔ تبلیغی جماعت، دعوت، تنظیم، طریقہ کار

1921ء میں ہندوستان میں آریوں کی کوشش سے جاہل دیہاتوں میں ارتداد کی آگ پھیلی اور مسلمان جو اپنے دین سے ناواقف اور خدا اور رسول سے بے یگانہ تھے اس آگ کی لپیٹ میں آئے۔ اس آگ کو بجھانے کے لیے ہر طرف مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے۔ تبلیغی انجمنیں سرگرم عمل ہوئیں۔ مناظرین اسلام نے اسلام کی فوقیت ثابت کرنے کے لیے بحث و جدال کے میدان گرم کیے۔ ہزاروں روپیہ چندہ میں وصول کر کے مبلغین جگہ جگہ پھیلائے گئے۔ اور اسلام کو بچانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی گئی۔

اسی دور میں مولانا محمد الیاس کاندھلوی نے نہایت خاموشی سے دعوت و تبلیغ کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے ایک ہمہ گیر تحریک چلائی جس نے دس بارہ سال کے قلیل عرصے میں میوات کے علاقے میں ایک نیا انقلاب برپا کر دیا۔ اور گاؤں گاؤں نماز پڑھی جانے لگی اور خود دوسروں تک اسی دعوت کو پہنچانے میں لگ گئے۔

میواتی قوم دہلی کے آس پاس الور، بھرت پور، گوڑ کانوہ اور دوسرے متصل علاقوں میں آباد تھی۔ اس کی مجموعی

1۔ افتخار فریدی، ارشادات و مکتوبات حضرت مولانا محمد الیاسؒ، ص ۱۰۶

2۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی خدمات، ص ۱۰۷ (یہ پورا مضمون پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن کے مقالہ "مولانا محمد الیاس کا تصور دین"، مطبوعہ سہ ماہی فکر و شعور، ص ۱۹ تا ۳۳ سے ماخوذ ہے۔

تعداد 36 لاکھ بتائی جاتی ہے۔ صدیوں پہلے ہی نظام الدین محبوب الٰہیؒ اور ان کے خلفا متبعین کی کوششوں سے اس قوم میں اسلام پہنچا مگر افسوس کے بعد کے زمانوں میں مسلمان حکمرانوں اور جاگیرداروں کی غفلت سے وہاں اسلامی تعلیم اور اسلامی تربیت کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ حکومت کے مرکز سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود اسلام سے دور ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ غیر مسلم مؤرخین کو بھی میواتیوں کی اسلام سے دوری اور بے گانگی کا احساس تھا۔ میجر پاؤلٹ جو انیسویں صدی کے آخر میں ریاست الور کا آفیسر بندوبست رہا ہے۔ الور کے گزیٹر (شائع شدہ 1878ء) میں لکھتا ہے:

''میوات تمام تر مسلمان ہیں، لیکن برائے نام، ان کے گاؤں کے دیوتا وہی ہیں جو ہندو زمینداروں کے ہیں۔ وہ ہندوؤں کے کئی ایک تہوار مناتے ہیں۔ ہولی میواتیوں میں مذاق اور کھل کھیلنے کا زمانہ ہے اور اتنا ہی اہم اور ضروری تہوار سمجھا جاتا ہے جتنا محرم، عید اور شب برات۔ اسی طرح وہ جنم اشٹمی، دسہرا اور دیوالی بھی مناتے ہیں، ان کے یہاں ''پیلی چٹھی'' لکھنے کے لیے یا شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے برہمن پنڈت بھی ہوتے ہیں۔ ایک رام کے لفظ کو چھوڑ کر وہ ہندووانہ نام بھی رکھتے ہیں اگرچہ خان جتنا ان کے ناموں کے اخیر میں ہوتا ہے اتنا نہیں لیکن پھر بھی بکثرت سنگھ ان کے ناموں کا اخیر جزو ہوتا ہے۔''

''میوات اپنے مذہب (اسلام) سے بہت ناواقف ہیں، خال خال کوئی کلمہ جانتا ہے اور پابندی سے نماز پڑھنے والے اس سے بھی کم ہیں اور ان کے اوقات و مسائل سے تو وہ بالکل ناواقف ہیں۔''

''میوات اپنے عادات میں آدھے ہندو ہیں ان کے گاؤں میں شاذ و نادر ہی مسجدیں ہوتی ہیں۔ تحصیل تجارہ میں میوؤں کے باون گاؤں میں آٹھ ہیں البتہ مندروں کو چھوڑ کر میوؤں کی عبادت کی ویسی ہی جگہیں ہوتی ہیں جیسی ان کے ہمسایہ ہندوؤں کے یہاں ہوتی ہے، مثلاً پانچ پیرا، بھیسا اور چاہنڈ یا کھیڑا، دیو مہادیوی کے نام ہوتا ہے جس پر قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں۔ شب برات میں سید سالار مسعود غازیؒ کا جھنڈا بھی ہر میو گاؤں میں پوجا جاتا ہے۔''

ان حالات اور مقامات میں مولانا محمد الیاسؒ نے دین کی تحریک چلائی اور نہایت قلیل مدت میں وہاں کی کایا پلٹ دی۔ پورے علاقے میں دین کی رغبت پھیل گئی اور اس کے آثار نظر آنے لگے۔ جس علاقہ میں کوسوں مسجدیں نظر نہ آتی تھی وہاں گاؤں گاؤں مسجدیں بن گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس ملک میں ہزاروں مسجدیں کھڑی ہو گئیں، صدہا مکتب اور متعدد عربی کے مدارس قائم ہو گئے۔ حفاظ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو گئی۔ ہندووانہ وضع و لباس سے نفرت پیدا

ہونے لگی اور اسلامی و شرعی لباس کی وقعت دلوں میں ہو گئی حتیٰ کہ اکتوبر 1939ء میں ایک عالم دین نے وہاں کا دورہ و مشاہدہ کرنے کے بعد لکھا کہ

''مولانا محترم (محمد الیاسؒ) نے خود اسی قوم کے مبلغوں سے اس کی اصلاح کا کام لیا اور ان کی پیہم کوششوں کا نتیجہ، جو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، یہ ہے کہ بعض علاقوں میں گاؤں ایسے ہیں جہاں ایک بچہ بھی آپ کو بے نمازی نہ ملے گا۔ دیہات کی وہ مسجدیں جہاں یہ لوگ کبھی اپنے مویشی باندھتے تھے، آج وہاں پانچوں وقت اذان اور جماعت ہوتی ہے۔ آپ کسی راہ چلتے دیہاتی کو روک کر اس کا امتحان لیں وہ آپ کو صحیح تلفظ کے ساتھ کلمہ سنائے گا۔ اسلام کی تعلیم کا سیدھا سادا لب لباب جو کہ ایک بدوی کو معلوم ہونا چاہیے آپ کے سامنے بیان کرے گا، وہ آپ کو بتائے گا کہ اسلام کے ارکان کیا ہیں، اب آپ وہاں کسی مسلمان مرد، عورت یا بچے کو ہندوانہ لباس میں نہ پائیں گے، نہ اس کے جسم کو بے ستر دیکھیں گے اور نہ اس کے گھر کو یا اس کے لباس کو نجاستوں میں آلودہ پائیں گے۔ ان کے عادات و خصائل اور ان کے اخلاق میں بھی اس مذہبی تعلیم و تبلیغ کی وجہ سے نمایاں فرق ہو گیا ہے۔ اب وہ متمدن اور مہذب طرز زندگی کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ جرائم میں حیرت انگیز کمی ہو گئی ہے۔ لڑائیاں فسادات اور مقدمات بہت کم ہو گئے ہیں۔ ان کا علاقہ اب پر امن علاقہ ہے جس کا اعتراف خود وہاں کے حکام کر رہے ہیں۔ ان کی معاشرت، ان کے لین دین، ان کے برتاؤ غرض ہر چیز میں عظیم تغیر ہو گیا ہے جس کی وجہ سے گرد و پیش کی آبادی پر ان کا اچھا اخلاقی اثر مرتب ہو رہا ہے اب وہ ذلت اور بے اعتباری کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے، بلکہ ان کی عزت قائم ہوتی جا رہی ہے اور ان کے کیریکٹر پر اعتماد کیا جانے لگا ہے۔[1]

یہ انقلاب حال اور یکلخت تبدیلی محض ایک آدمی کی محنت و کاوش کا ثمرہ ہیں۔ یہاں نہ کوئی کمیٹی تھی، نہ چندہ تھا، نہ کوئی اخبار اور ترجمان تھا، نہ قواعد پریڈ، یونیفارم اور باجوں اور جھنڈوں کے نمائشی مظاہرے تھے۔ بس مولانا نے خاموشی سے دعوت دین کا کام شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اصلاح و تعمیر کا وہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا مکاتب و مدراس کے ذریعہ دینی تعلیم کی اشاعت کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس معمولی اور انفرادی اصلاح سے حالات نہیں بدل سکتے اس کے لیے ضروری ہے کہ عوام کی جماعتیں اہل علم افراد اور مرکزوں تک جائیں اور

1۔ مولانا مودودی، ترجمان القرآن، ج ۱۰، ص ۳۹

کچھ وقت فارغ کر کے دین سیکھنے سکھانے میں صرف کریں چنانچہ آپ کی کوششوں سے سب سے پہلے دس آدمیوں کی ایک جماعت کاندھلہ کے سفر کے لیے تیار ہوئی اور رفتہ رفتہ فوائد و نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف جماعتیں دین سیکھنے اور تبلیغ کرنے کے لیے نکلنے لگیں۔ علماء کے سلسلے میں آپ کا خیال تھا کہ جب تک سلف اول کے طرز پر اشاعت دین کے لیے یہ لوگ نہ نکلیں گے، کام نہیں بنے گا۔ چنانچہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مرحوم کو ایک خط میں لکھا۔

"عرصہ سے میرا اپنا خیال ہے کہ جب تک علمی طبقہ کے حضرات اشاعت دین کے لیے خود جا کر عوام کے دروازوں کو نہ کھٹکھٹائیں اور عوام کی طرح یہ بھی گاؤں گاؤں اور شہر شہر اس کام کے لیے گشت نہ کریں اس وقت تک یہ کام درجہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ عوام پر جو اثر اہل علم کے عمل و حرکت سے ہوگا، وہ ان کی دھواں دھار تقریروں سے نہیں ہو سکتا۔ اپنے اسلام کی زندگی سے بھی یہی نمایاں ہے جو کہ آپ حضرت اہل علم پر بخوبی روشن ہے۔"[1]

تبلیغی جماعت کا طریق کار

مولانا الیاسؒ نے دین کی دعوت اور تبلیغ کے لیے محنت اور جدوجہد، گشت اور سفر کا طریقہ اختیار کیا۔ لوگ عام طور سے دینوی مشاغل میں پھنس کر دین سیکھنے اور حاصل کرنے کے لیے وقت نہ نکال پاتے اس لیے آپ نے یہ پالیسی بنائی کہ انہیں عارضی ترک وطن اور "غربت" اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے تاکہ کچھ مدت کے لیے یکسو ہو کر دین کی بنیادی باتیں (کلمہ اور نماز) سیکھ سکیں اور اہل علم و دین کی صحبت سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ آپ نے ایک گرامی نامہ میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"ہم نے جماعتیں بنا کر دین کی باتوں کے لیے نکلنا چھوڑ دیا۔ حالانکہ یہی بنیادی اصل تھی۔ حضور ﷺ خود پھرا کرتے تھے اور جس نے ہاتھ میں ہاتھ دیا وہ بھی مجنونانہ پھرا کرتا تھا غرض پھرنا اور دین کے لیے جدوجہد اور نقل و حرکت میں رہنا اصل تھا جب یہ چھوٹ گیا جب ہی خلافت ختم ہو گئی۔"

نکلتے وقت حضور کی لائی ہوئی چیزوں میں سے جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے اسی کی حیثیت سے کوشش کرنا چاہیے۔

ا۔ کلمہ کی تصحیح و تلقین

اس وقت بدقسمتی سے ہم کلمہ تک سے ناآشنا ہو رہے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے اسی کلمہ کی تبلیغ ہے جو کہ خدا کی خدائی کا اقرار نامہ ہے یعنی اللہ کے حکم پر جان دینے کے علاوہ درحقیقت ہمارا کوئی مشغلہ نہ ہوگا۔

1۔ سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد الیاس اور ان کی دعوت ص ۱۱۴

۲۔ **نماز کی تصحیح و ترقی**

کلمہ کے لفظوں کی تصحیح کرنے کے بعد نماز کے اندر کی چیزوں کی تصحیح کرنے اور نمازوں کو حضور ﷺ جیسی نماز بنانے کی کوشش میں لگے رہنا۔

۳۔ **تحصیل علم و ذکر**

تین وقتوں کو (صبح، شام اور کچھ حصہ شب کا) اپنی حیثیت کے مطابق تحصیل علم و ذکر میں مشغول رکھنا۔

۴۔ **تفریغ وقت**

ان چیزوں کو پھیلانے کے لیے اصل فریضہ محمدی سمجھ کر نکلنا یعنی ملک بہ ملک رواج دینا۔

۵۔ **خلق**

اس پھرنے میں خلق کی مشقت کرنے کی نیت رکھنا۔ اپنے فرائض کی ادائیگی کی سرگرمی خواہ خالق سے متعلق ہو یا خلق کے ساتھ۔ کیونکہ ہر شخص سے اپنے ہی متعلق سوال ہو گا۔

۶۔ **تصحیح نیت**

ہر عمل کے بارے میں اللہ نے جو وعدے وعید فرمائے ہیں ان کے موافق اس امر کی تعمیل اللہ کی رضا اور موت کے بعد والی زندگی کی درستی کرنے کی کوشش کرنا۔[1]

اُمّتِ مسلمہ کا بنیادی کام

مولانا اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اصل اہمیت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہے اگر اس پر توجہ نہ دی جائے اور دین کی تبلیغ و اشاعت کو مرکزی اہمیت حاصل نہ ہو تو دین مضمحل ہو جائے گا۔ عبادتیں نا قابل قبول قرار پائیں گی اور دین کی شاخیں اور پتیاں مرجھا جائے گی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"میرے حضرت! یہ وظیفہ وظائف اور یہ اللہ کی بارگاہ میں دعائیں اور دین کی لائن کی ہر چیز در حقیقت ایمان کی پگڈنڈیاں اور اس کے پھول پتے ہیں جو درخت اپنی جڑ سے سوکھ چکا ہو، اس کے پھول پتوں میں شادابی کہاں سے ہو سکتی ہے، اس واسطے اس بندہ ناچیز کے نزدیک اس زمانہ میں نہ دعا کارگر ہے نہ وظیفہ بارآور ہے اور نہ کسی کی طرف توجہ اور ہمت کارآمد ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس وقت دین کے فروغ کی کوشش ترک ہو چکی ہو گی۔ جس کو امر

1۔ سید ابوالحسن ندوی، ایک اہم دینی تحریک، ص ۱۴۔۱۵

بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں اس وقت دعائوں میں راتیں رو رو کر گزارنے والوں کی دعا قبول نہیں ہوں گی۔ ابواب رحمت بند ہو چکے ہوں گے۔ ابواب رحمت کھلنے کے کوئی صورت نہ ہو گی۔ مسلم کا فروغ، اسلام کے فروغ کی کوشش میں لگنے کے اندر کے علاوہ ہرگز متصور نہیں، حق عزوجل نے مومن کے ساتھ رحمت کے ساتھ توجہ کرنے اور کرم والطاف کے ساتھ برتاؤ کرنے کا ارادہ صرف اسی وقت فرمار کھا ہے کہ جب وہ اسلام کے فروغ میں ہو، اسلام کے فروغ میں اپنی سعی مصروف کر رہا ہو۔"[1] مولانا کا نقطہ نظریہ تھا کہ قوم کے اندر پہلے دین کے لیے طلب اور رغبت پیدا کی جائے۔ کلمہ لا الہ الا اللہ کا معنی و مفہوم ان کے ذہنوں میں راسخ کیا جائے، دین کی بنیادی باتوں سے واقفیت بہم پہنچائی جائے پھر انہیں غلبہ دین کے لیے اٹھا کھڑا کیا جائے۔ بغیر عقائد و مبادی کی درستی کے دین قائم و غالب نہیں ہو سکتا، چنانچہ ایک گرامی نامہ میں فرماتے ہیں:

"جس قوم کی پستی کلمہ لا الہ الا اللہ کے لفظوں سے بھی گر چکی ہو وہ ابتداء سے درستی کئے بغیر انتہائی درستی کے کب قابل ہو سکتی ہے۔ انتہا ابتدا کے درست ہوئے بغیر نہیں ہو سکتی اس لیے میں نے درمیانی اور انتہائی خیالات بالکل نکال دیے، ابتداء درست ہو کر راستہ پر پڑ جائیں گی تو انتہا پر خود ہی پہنچ جائیں گے اور ابتدا کے بگڑے ہوئے انتہا کی درستی کا خیال ہوس اور بوالہوسی کے سوا کچھ نہیں۔"[2]

مولانا کے اندر دین کے غلبہ و تمکن کی تڑپ اور اسلام کی بدحالی و کسمپرسی پر درد اور کسک بلا کی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ ایک بار کسی نے لال قلعہ کے پاس سے گزرتے ہوئے پوچھا کہ کبھی جناب نے لال قلعہ بھی دیکھا ہے تو فرمایا کہ میں لال قلعہ کی سیر کو بے حمیتی سمجھتا ہوں، ہاں میں نے بچپن میں اس وقت دیکھا ہے جب دکھانے والے رو رو کر دکھاتے تھے۔[3]

مولانا پر بہت گراں تھا کہ عربی زبان اور دینی علوم میں بھی مسلمان غیروں کے دست نگر اور ان کے ماتحت ہوں۔ مولانا نے حافظ عبداللطیف صاحب کو ایک خط میں لکھا کہ

1۔ مولانا محمد الیاس اور ان کی دعوت، ص ۲۹۱، ۲۹۲

2۔ ایضاً ص ۲۲۱

3۔ ایضاً، ص ۲۳۲

''حافظ صاحب مجھے بڑی غیرت آتی ہے کہ مسلمانوں کی عربیت کی جانچ کرنے والے کفار ہوں۔''

انہی کے نام ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''زیادہ زور اس امر پر دیا جائے کہ قوم اپنی پنچائتیں اور اپنے سب کاروبار اور سب فیصلے شریعت کے موافق کرنے کو ہی اسلام سمجھے ورنہ اسلام نہایت ناقص ہے بلکہ بسا اوقات احکام شرعیہ کے بے وقعتی اور بے رخی اور توہین کی بدولت اسلام جاتا رہتا ہے اور یقیناً کفر ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے سامنے اسلام کے مکمل نظام کا تصور موجود تھا اور غیر اسلامی ور طاغوتی عدالتوں میں فیصلہ کرانے کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اپنے سارے معاملات اسلام کی روشنی میں طے کرنا محبوب رکھتے تھے۔ البتہ اسلام کی اقامت کو نماز کی اقامت سے شروع کیا کہ نماز کے بغیر اسلام کی اقامت بے معنی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مولانا کے پیش نظر صرف تحریک اقامت صلوۃ برپا کرنا تھی بلکہ آپ پورے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے جس کی ابتداء کلمہ کی تلقین اور نماز کی اقامت سے ہوتی تھی چنانچہ ایک بار اپنے عزیز مولوی ظہیر الحسن صاحب سے فرمایا:

''ظہیر الحسن میرا مدعا کوئی پاتا نہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تحریک صلوۃ ہے، میں قسم سے کہتا ہوں کہ یہ ہرگز تحریک صلوۃ نہیں۔''

ایک روز بڑی حسرت سے فرمایا کہ:

''میاں ظہیر الحسن ایک نئی قوم پیدا کرنی ہے۔''[1]

مولانا کی یہی دینی حمیت، اسلام کے کامل نظام کے تصور کی حکمرانی اور شریعت اسلامیہ کو غالب دیکھنے کی تڑپ تھی کہ حکومت کی جبری تعلیم کی آپ نے سخت مخالفت کی تھی اور علماء کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا شدھی سنگھٹن کے زمانے میں تحریک ارتداد کا مقابلہ کیا اور اپنی بے پایاں کوششوں سے مسلمانوں میں اس کا رخ موڑ دیا۔[2]

2۔ دعوت اسلامی: تعارف و مقاصد

تمام انبیاء کرام علیہم السلام دعوت دین کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ ان کی دعوت اپنے اپنے علاقے، قوم اور ملک تک محدود رہی جبکہ نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالی نے تمام جہانوں کا رسول اور نبی بنا کر بھیجا اور آپ کو جوامت عطا کی گئی

1۔ مولانا محمد الیاس اور ان کی دعوت، ص ۲۹۲

2۔ عبید اللہ فہد فلاحی، اخذ و تلخیص، تاریخ دعوت و جہاد، ص ۲۲۱

وہ امت دعوت ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾[1]

(تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو)

اس کے علاوہ قرآن پاک نے اس گروہ کو کامیاب قرار دیا جو نیکی کی دعوت کا فریضہ انجام دے جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے۔

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾[2]

(اور تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے کہ بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھی بات کا حکم دیں اور بری سے منع کریں اور یہی لوگ مراد کو پہنچے)

اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس امت کے اندر ایک گروہ یا تنظیم موجود رہے جو تمام ٹیڑھے لوگوں کو بھلائی کی دعوت دے، کافروں کو ایمان کی دعوت دے، فاسقوں کو تقویٰ کی اور غافلوں کو بیداری کی دعوت دے اور یہی دعوت دینے والا گروہ کامیاب ہے۔

2۔ دعوت اسلامی: تعارف و مقاصد

مولانا محمد الیاس عطار قادری نے 1401ھ بمطابق 1981ء معاشرے میں نیکی کی دعوت کو عام کرنے اور امت مسلمہ کے اندر عشق مصطفی ﷺ بیدار کرنے کے لیے ایک غیر سیاسی تحریک دعوت اسلامی کی بنیاد رکھی اور اس دینی تحریک کے ذریعے لاکھوں مسلمانوں خاص طور پر نوجوان مردوں اور عورتوں کے اندر ایک اسلامی جذبہ پیدا کر دیا۔ علامہ الیاس عطار قادری نے اپنے تحریکی ڈھانچے کو ایسے انداز میں ترتیب دیا کہ یہ تحریک تھوڑے عرصے میں کراچی سے نکل کر دنیا بھر میں مقبول ہو گئی۔ اب تک اس دینی تحریک کا کام دنیا کے کم و بیش 72 ممالک میں ہو رہا ہے۔ آج دعوت

1۔ سورۃ آل عمران ۳: ۱۱۰

2۔ سورۃ آل عمران ۳: ۱۰۴

اسلامی 40 سے زائد شعبہ جات میں دین کی خدمت میں مصروف عمل ہے۔

دعوت اسلامی نے معاشرے میں باعمل حفاظ اور علماء پیدا کرنے کے لئے جامعات المدینہ اور مدارس کا نظام رائج کیا ہے۔ دینی وجدید تعلیم کا جامع ادارہ بنام "دار المدینہ" شروع ہونے والا ہے۔ دعوت اسلامی دین اسلام کی نشرواشاعت کے لئے جدید ذرائع ابلاغ سٹلائیٹ اور انٹرنیٹ کا استعمال بھی زور وشور سے کر رہی ہے۔

2.1۔ دعوت اسلامی کے آغاز کا پس منظر اور اسباب

مولانا محمد الیاس عطار قادری نے مسلمانوں کی حالت زار کو محسوس کرتے ہوئے اس غیر سیاسی مذہبی تحریک دعوت اسلامی کا آغاز کیا تاکہ مسلمان صرف "کھاؤ پیو جان بناؤ" کو ہی مقصد حیات نہ سمجھیں بلکہ ﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾[1] کے تحت ایمان کے بعد اعمال صالحہ کرتے رہیں اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں۔ جیسا کہ مجلس المدینہ العلمیہ نے رسالہ "تذکرہ امیر اہلسنت" میں حالات کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

"اس پر فتن دور (یعنی پندرہویں صدی ہجری) میں کہ جب دنیا بھر میں گناہوں کی یلغار، ذرائع ابلاغ میں فحاشی کی بھر مار اور فیشن پرستی کی پھٹکار مسلمانوں کی اکثریت کو بے عمل بنا چکی تھی... گلشن اسلام میں خزاں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھی۔ ان نازک حالات میں اللہ عزوجل نے اپنے ایک ولی کامل کو امت محمدیہ کی اصلاح کے لیے منتخب فرمایا جنہیں دنیا "امیر اہلسنت" کے نام سے پکارتی ہے۔... علامہ محمد الیاس عطار قادری نے نیکی کی دعوت عام کرنے کی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے ایک ایک اسلامی بھائی پر انفرادی کوشش کر کے مسلمانوں کو عملی طور پر سنتیں اپنانے کی طرف راغب کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے آپ نے دعوت اسلامی جیسی عظیم اور عالمگیر تحریک کے مدنی کام کا آغاز فرما دیا"[2]

مولانا الیاس عطار قادری نے ان خستہ حالات میں دین کی دعوت کا کام شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ دینی کام آگے بڑھتا گیا جس سے مسلمانوں کے حالات میں کافی بہتری آئی اور مسلمان اپنے شعائر اور دین سے کافی قریب ہوا۔ دعوت اسلامی کے آغاز کے پس منظر میں کچھ اسباب ہیں جن کو مباحث کی شکل میں تحریر کیا جائے گا۔

1۔ سورۃ الملک ۶۷:۲

2۔ مجلس المدینۃ العلمیہ، تذکرہ امیر اہلسنت (قسط اول)، مکتبۃ المدینہ کراچی ۲۰۰۵ء، ص ۱۰

2.1.1 ۔امت مسلمہ کی دین سے دوری

خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کا بین الاقوامی سطح پر معیار گر گیا۔ مسلمان کو مزید دین اسلام سے دور کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ ذلت اور رسوائی مسلمانوں کا مقدر بن جائے، گناہوں کے ارتکاب میں دلیر ہو جائیں جیسا کہ مجلس المدینۃ العلمیہ نے ذکر کیا۔

" علم دین کی دولت سے محرومی کی بناء پر ان کارناموں کو سرانجام دیتے وقت یہ بھی خیال نہیں کیا جاتا کہ یہ گناہ اور جہنم میں لے جانے والے کام ہیں...بیوقوفانہ جملوں کو دلیل بنا کر ان گناہوں کا ارتکاب اس قدر بے باکی اور دلیری سے کیا جاتا ہے کہ الامان والحفیظ"۔ [1]

اس کے برعکس ایسے مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے جو زیور علم سے آراستہ ہوں اور اپنی زندگیاں رب تعالیٰ کی فرمانبرداری اور حبیب مکرم ﷺ کی اطاعت میں بسر کریں۔ کیونکہ علم دین سے دوری اور جہالت گناہوں کے ارتکاب میں دلیر بنا دیتی ہے۔ علامہ الیاس عطار قادری نے دیکھا کہ مسلمان دین کا کام کرنے سے گریز کرتے ہیں اور ان کے خیال میں دین کا کام صرف علماء ہی کا کام ہے تو آپ نے دعوت اسلامی جیسی خالصتاً دینی تحریک کی بنیاد رکھی۔ جیسا کہ آپ نے فیضان سنت قدیم میں لکھا۔

"آج دنیا میں عیسائی مشنریز اور یہودیوں کی مذموم تحریکیں تو ہر جگہ اپنے مذہب کی سالمیت اور بقاء کے لیے سر گرداں ہیں مگر آہ بے چارہ ستم رسیدہ مسلمان اسے تو دنیا کے دھندوں سے فرصت ہی کہاں؟ اس دور کے مسلمان نے تو" کھاؤ پیو اور جان بناؤ" کے نعرے ہی کو مقصد حیات سمجھ رکھا ہے اسے کہاں پڑی ہے کہ یہ بھی صلوٰۃ و سنت کی دوسروں کو تلقین کرے"۔ [2]

یہ وہ حالات تھے جو علامہ الیاس عطار قادری نے دعوت اسلامی کو تشکیل دیتے ہوئے بیان کئے اور اس امت کیلئے اپنا درد پیش کیا کہ کسی طرح یہ امت دین کے قریب آجائے۔ ایک اور جگہ آپ نے حالات زار یوں بیان کئے۔

"افسوس کہ آج کل علم دین کی طرف ہمارا رجحان بالکل کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج ہونہار بچے کو مغربی تعلیم تو ضرور دلائی جاتی

1۔ مجلس المدینۃ العلمیہ، انفرادی کوشش، مکتبۃ المدینہ کراچی ۲۰۰۵ء، ص ۱۰

2۔ محمد الیاس عطار قادری، فیضان سنت قدیم، مکتبۃ المدینہ کراچی، ص ۲۳۳

ہے مگر سنتوں کی تعلیم کی کوئی پرواہ نہیں...آہ عدم دلچسپی ہے تو اسلامی ماحول اور درسگاہوں سے ہے"۔ [1]

یوں دین کی محبت مسلمانوں کے دلوں میں اجاگر کرنے کے لئے دعوت اسلامی کی بنیاد ڈالی گئی تاکہ عام مسلمان بھی دین کے قریب آئے۔ اس کے علاوہ علامہ الیاس عطار قادری نے اشاعت دین کو وسیع کرنے کے لئے جامعات اور مدارس کا نظام بھی قائم کیا تاکہ لوگوں کو اصل دین سے واقفیت ہو کیونکہ اس وقت لوگ صرف اختلافی مسائل میں الجھے ہوئے تھے اور نظام دین سے عدم آشنا۔ چنانچہ پروفیسر حبیب اللہ چشتی لکھتے ہیں۔

"اگر ہماری زندگیاں مسلک کے دائرے ہی میں کھپ جائیں اور ہم اسلام کو بحیثیت دین متعارف کروانے میں کوئی اہم کردار ادا نہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اصل کو فرع بنادیا اور فرع کو اصل"۔ [2]

چنانچہ یہ ضروری تھا کہ لوگوں کو صرف فروعی اور مسلکی اختلاف میں الجھانے کی بجائے اصل نظام دین سے متعارف کروایا جائے تاکہ لوگ شریعت کو اپنی زندگیوں میں نافذ کر سکیں، معاشرے سے جہالت دور ہو اور لوگوں کو دین سے آشنائی ہو کیونکہ جہالت ہی کی وجہ سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حبیب اللہ چشتی لکھتے ہیں۔

"جب بھی کسی نئے فرقے نے جنم لیا تو صرف جہالت ہی نے اسے پھیلنے کا موقع دیا۔ جہالت ہی کے سبب لوگ شعبدہ بازیوں کو معجزہ سمجھتے رہے اور ان کے جالوں میں پھنستے رہے وہ مقفع کا چاند ہو یا ابن صباح کی جنت"۔ [3]

جہالت کو دور کرنے اور امت مسلمہ کو دین سے آشنا کرنے کے لئے دعوت اسلامی کی داغ بیل ڈالی گئی تاکہ مسلمان گمراہی سے بچ جائیں اور اپنے دین کو سیکھ کر اس پر عمل کرنے والے بن جائیں۔ صرف فرقہ پرستی کو ہوا دینا کوئی دین نہیں اور نہ اس سے اعمال صالحہ کی توفیق ملتی ہے۔

2.1.2۔ فرائض سے غفلت

جب علامہ الیاس عطار قادری نے دعوت اسلامی کی بنیاد ڈالی تو اس وقت امت مسلمہ زوال کا شکار تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے فرائض سے غفلت بھرتی، اپنے اخلاقی اور معاشرتی اصولوں کو چھوڑ دیا۔ جھوٹ، غیبت، چغلی، حسد، تکبر، ریاء، اور رشوت کا مسلمان شکار ہو گئے۔ اپنی ذمہ داری کا احساس تک نہ رہا۔ جیسا کہ حبیب اللہ چشتی اپنی

1۔ ایضاً، ص ۲۹۸

2۔ حبیب اللہ چشتی، امت مسلمہ کا عروج و زوال، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۶۵

3۔ ایضاً، ص ۹۹

کتاب امت مسلمہ کا عروج و زوال میں لکھتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

''امت مسلمہ کا ایمان سے تعلق محض رسمی رہ گیا۔ فرقہ پرستی نے مسلمانوں کو اصل دین سے بے بہرہ کر دیا۔ جہالت کی وجہ سے مسلمان طرح طرح کے فتن میں مبتلا ہو گئے۔ اخلاق عالیہ کی کوئی چیز نام تک نہ رہی۔ امت مسلمہ کا خاص وصف امر بالمعروف مفقود ہو گیا۔ قوم کی خیر خواہی کرنے والے اہل خیر کا خاتمہ ہو گیا اور اشرافیہ کا بگاڑ اپنی حد کو کراس کر گیا''۔ [1]

ان حالات میں علامہ الیاس عطار قادری نے مسلمانوں کے حالات کو سنوارنے کیلئے دعوت اسلامی جیسی عالمگیر دینی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ آپ نے احساس ذمہ داری اور جھوٹ، غیبت، چغلی و حرام ذرائع معاش کے رد پر بیانات کئے۔ مختلف رسائل لکھ کر معاشرتی برائیوں کا رد فرمایا اور فحاشی و عریانی کے خلاف زبانی و تحریری جہاد فرمایا۔ نماز کے مسائل پر مشتمل کتاب '' نماز کے احکام ''، لکھی، کفریہ کلمات سے امت مسلمہ کو بچانے کے لیے ''کفریہ کلمات کے بارے میں سوال جواب'' کتاب لکھ ڈالی۔ مسلمان کھانے پینے میں اعتدال سے کام لے اس کے بارے کتاب ''آداب طعام'' اور '' پیٹ کا قفل مدینہ '' لکھی اور رمضان و تراویح کے فضائل و احکام پر مشتمل کتاب '' فیضان رمضان '' تحریر کی۔ مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے کئی رسائل تحریر تالیف کئے۔ رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کے لیے رسالہ ''احترام مسلم'' تحریر کیا۔ عورتوں کے مسائل، طہارت اور نماز کے لیے علیحدہ کتاب ''اسلامی بہنوں کی نماز'' تحریر کی۔ الغرض آپ نے دعوت اسلامی کا ڈھانچہ ایسے انداز میں مرتب کیا کہ مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں۔ اپنے فرائض و ذمہ داری کا احساس کریں اور شریعت اور سنت کے مطابق زندگی گزارنے والے بن جائیں۔

2.1.3۔اتباع سنت سے روگردانی

علامہ محمد الیاس عطار قادری نے جب دیکھا کہ مسلمان سنت مصطفی ﷺ سے دور ہو چکا ہے انگریزی فیشن سے اس کو الفت ہو گئی ہے۔ دعویٰ تو محبت رسول کرتا ہے مگر اس کا عمل اس کی تائید نہیں کرتا بلکہ اس کا عمل دیکھ کر غیر مسلم اسلام سے اور دور ہو جاتے ہیں۔ آپ نے مسلمانوں کو سنت مصطفی ﷺ کی محبت اپنانے اور اس پر عمل کا جذبہ پیدا

1۔ ایضاً، ص ۶۵

کرنے کے لیے دعوت اسلامی جیسا اچھا ماحول قائم کیا۔ کیونکہ ارشاد خداوندی ہے۔

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ [1]

(تم فرمادو کہ لوگو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ اللہ تمھیں دوست رکھے گا)

اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کے لئے اور اس کی محبت حاصل کرنے کے لئے صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے اتباع سنت مصطفیٰ ﷺ۔ اس لیے علامہ الیاس عطار قادری نے دعوت اسلامی کی بنیاد ڈال کر مسلمان کو سوچ دی کہ ہماری نجات صرف اور صرف سنت نبوی ﷺ کی کامل اتباع میں ہے۔ راہ سنت سے ہٹ کر ہم کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ آپ نے فیضان سنت قدیم میں حالات کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

"آہ صد آہ پہلے تو مسلمانوں کو کفار ظلم و ستم کا نشانہ بناتے تھے اب خود مسلمان کہلانے والے اپنی اولاد کو بالجبر سنتوں سے دور رکھتے ہیں اور سنتوں پر عمل کرنے پر طرح طرح کی سزائیں دیتے ہیں۔"[2]

علامہ الیاس قادری نے جب مسلمانوں کے یہ حالات دیکھے کہ وہ کتنے سنتوں سے دور ہو چکے ہیں اور معاذ اللہ سنتوں سے کس قدر نفرت ہے تو آپ نے دعوت اسلامی کا پاکیزہ روحانی ماحول قائم کیا۔ ایک اور جگہ آپ نے مسلمانوں کی حالت زار کو یوں بیان کیا:

"انگریز بڑا عیار و مکار ہے وہ اپنا باطل مذہب چھوڑ کر مسلمانوں کی نقل ہرگز نہیں کرتا۔ مگر افسوس غیروں کی نقل کرنے والی حماقت اب تو مسلمانوں کا مقدر بنتی جا رہی ہے"۔[3]

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمان اپنے پیارے آقا مدنی مصطفیٰ ﷺ کی نقل کرتا، سیرت و صورت میں اپنے نبی کی پیروی کرتا مگر انگریزی فیشن سے متاثر ہو کر سنت مصطفیٰ ﷺ کو چھوڑ بیٹھا ہے۔ حالانکہ فرمان مصطفیٰ ﷺ ہے۔ (من أحب سنتي فقد أحبني ومن أحبني كان معي في الجنة)[4] جس نے میری سنت سے محبت کی بیشک اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہو گا۔

1۔ سورۃ آل عمران ۳:۳۱

2۔ محمد الیاس قادری، فیضان سنت قدیم، ص ۲۶۰

3۔ محمد الیاس قادری، فیضان سنت قدیم، ص ۲۶۰

4۔ الترمذی، محمد بن عیسیٰ، جامع ترمذی، دار الفکر بیروت، کتاب العلم، باب الاخذ بالسنۃ واجتناب البدع، ج ۴، ص ۳

ان تمام حالات کو دیکھ علامہ محمد الیاس قادری نے دعوت اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ مرتب کیا اور سنت مصطفے ﷺ کو زندہ کرنے کیلئے دعوت اسلامی کا دینی ماحول معاشرے میں جاری کر دیا۔

2.1.4۔ عشق رسول ﷺ کی کمی

محبت رسول متاع ایمان ہے، اس میں اگر کمی آجائے پھر ایمان بھی نا مکمل ہو جاتا ہے۔ بیسویں صدی میں مسلمان انگریزی طور طریقے اپنانے لگے۔ محبت دنیا چھانے لگی اور ظاہر ہے جب خدا اور رسول کی نافرمانیاں بڑھ رہی ہوں تو ایمان کمزور ہو جاتا ہے۔ مجلس المدینہ العلمیہ نے حالات کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے۔

"افسوس صد افسوس کہ آج مسلمانوں کی اکثریت بے عملی کا شکار ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ) جہنم کے گڑھے میں چھلانگ لگانے کے لیے پوری رفتار سے بھاگی چلی جارہی ہے"۔ [1]

اس طرح بے عملی حد سے بڑھ جائے تو ایمان کمزور ہو جاتا ہے اور محبت رسول ﷺ ماند پڑ جاتی ہے اور پھر محبت کے کھوکھلے دعوے رہ جاتے ہیں۔ علامہ الیاس عطار قادری اپنے رسالے "عاشق اکبر" میں کچھ یوں تحریر کرتے ہیں۔

"جس سے محبت ہوتی ہے اسے رنجیدہ نہیں کیا جاتا مگر آہ آج کے اکثر مسلمان جو کہ عشق رسول ﷺ کے دعوے دار ہیں مگر ان کے کام محبوب رب الانام کو شاد کرنے والے نہیں"۔ [2]

یہ وہ حالات ہیں جن کو دیکھ کر علامہ الیاس قادری نے دعوت اسلامی جیسا پاکیزہ ماحول قائم کیا تا کہ مسلمانوں کے اندر حقیقی عملی عشق رسول ﷺ بیدار ہو جائے۔ مسلمان صرف گفتار کے غازی نہ ہوں بلکہ با عمل قوم بن جائیں۔ جیسا کہ علامہ موصوف لکھتے ہیں

"وہ کیسے عاشق رسول ﷺ ہیں جو کہ نماز سے جی چرا کر نماز جان بوجھ کر قضا کر کے سرکار ﷺ کے قلب پر انوار کیلئے تکلیف و آزار کا سبب بنتے ہیں یہ کونسی محبت اور کیسا عشق ہے کہ رسول رفیع الشان...ماہ رمضان کے روزوں کی تاکید فرمائیں مگر خود کو عاشقان رسول ﷺ میں کھپانے والا اس حکم والا سے رو گردانی کر کے ناراضیء مصطفی ﷺ کا سبب بنیں"۔ [3]

1۔ مجلس المدینۃ العلمیہ، انفرادی کوشش، ص ۹

2۔ الیاس عطار قادری، عاشق اکبر، مکتبہ المدینہ کراچی، ص ۲۸

3۔ ایضاً، ص ۳۳

2.1.5۔امت مسلمہ کا اخلاقی بگاڑ

ایک وقت تھا کہ مسلمان اعلیٰ اخلاق کا نمونہ تھے کہ ان کے کردار اور گفتار کو دیکھ کر کفار اسلام قبول کر لیتے تھے مگر اس وقت حالات بر عکس ہیں۔اب مسلمانوں کا کردار انتہائی شرمناک ہے،اچھا اخلاق کمیاب ہے،حیاء جو کہ جزو ایمان ہے،کہیں کہیں نظر آتا ہے۔جدید میڈیا نے حیاسوز مناظر دکھا کر مسلمانوں کا جذبہ غیرت ٹھنڈا کر دیا ہے۔جس طرح علامہ الیاس قادری لکھتے ہیں۔

"افسوس! ذرائع ابلاغ (میڈیا) مثلاً ریڈیو،ٹی وی کے مختلف چینلز اور متعدد اخبارات ورسائل بے حیائی کو فروغ دینے میں مصروف ہیں۔جس کی بنا پر ہمارا معاشرہ تیزی سے فحاشی،عریانی اور بے حیائی کی آگ کی لپیٹ میں آتا جارہا ہے۔جس کے سبب خاص کر نئی نسل اخلاقی بے راہ روی اور شدید بد عملی کا شکار ہوتی جارہی ہے"۔ [1]

علامہ الیاس قادری نے امت مسلمہ کے اندر بد اخلاقی اور بے حیائی کے جراثیم پھیلتے ہوئے دیکھے تو دعوت اسلامی جیسی عالمگیر تحریک کی بنیاد رکھی تاکہ مسلمانوں کو با اخلاق بنایا جاسکے۔کیونکہ معاشرے کی اکثریت بد اخلاقی کا شکار نظر آتی ہے۔کوئی ایسا ماحول نہیں ملتا جس سے امت مسلمہ اخلاق سیکھے اور مسلمانوں کی اخلاقی تربیت ہو سکے۔

2.2۔ دعوت اسلامی کی اہمیت

2.2.1۔لوگوں کے کردار کی اصلاح

دعوت اسلامی جب وجود میں آئی تو مسلمانوں کے حالات ناگفتہ بہ تھے۔مسلمان اپنے آقا ﷺ کی سنتوں کو چھوڑ کر انگریزی فیشن پر مرمٹ رہے تھے۔نہ نمازوں کا ذوق تھا اور نہ ہی روزوں کا شوق۔زکوٰۃ کی ادائیگی میں عدم توجہ تھی۔اسی طرح حقوق العباد کے معاملے میں انتہائی غفلت کا مظاہرہ تھا۔والدین کی نافرمانی عام تھی۔نہ بڑوں کا ادب اور نہ ہی چھوٹوں پر شفقت کی کوئی صورت تھی۔حرام و حلال کی تمیز ختم ہو چکی تھی۔ان حالات میں دعوت اسلامی کا وجود امت مسلمہ کیلئے باعث نجات بن گیا کیونکہ امت اس ماحول کی وجہ سے گمراہی کے راستے سے نجات پانے لگی اور سنت شاہ انبیاء ﷺ عام ہونے لگی۔جیسا کہ ملک عادل رضا لکھتے ہیں:

1۔ محمد الیاس عطار قادری، باحیا نوجوان، مکتبہ المدینہ کراچی، ص ۲۸

''جب پیارے مصطفی ﷺ کی سنتوں کو پامال کئے جانے لگا، ان کا قتل عام شروع ہوا... تو ایسے پر فتن اور کٹھن دور میں عشق مصطفی ﷺ کی شمع کو فروزاں کرنے کے لئے، سنتوں کو رائج کرنے کے لئے خدائے رحمان عزوجل نے امیر اہلسنت، امیر ملت حامی سنت ابوالبلال محمد الیاس عطار قادری رضوی (دامت برکاتہم العالیہ) جیسے مبلغین کو بھیج کر دین کی ضروریات کو پورا کیا۔ آپ کی شبانہ روز محنتیں رنگ لائیں۔ بد مذہبی کی خزاں چھٹ گئی اور سنتوں کی ایسی بہار آئی کہ چمنستان مصطفی کے پھولوں نے سنتوں کی پاکیزہ خوشبو سے مہکنا اور لہلہانا شروع کر دیا اور آج اسی ولی کامل کی سعی جمیلہ سے اقوام عالم میں سنتوں کا ڈنکا بج رہا ہے''۔ [1]

دعوت اسلامی کے مبلغین نے ایسا صاف ستھرا کردار پیش کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ دینی تحریک کراچی سے نکل کر دنیا کے کئی ممالک میں پھیل گئی۔ جیسا کہ علامہ ذوالفقار عطاری لکھتے ہیں۔

''دعوت اسلامی سے ایسے لوگ منسلک ہیں اور ہوئے کہ جن کا عزم، ہمت، حوصلہ بلند اور سینہ عشق رسول ﷺ کا مدینہ تھا... امت مسلمہ کا درد اور اخوت واتحاد کی فکر تھی۔ ان کے اخلاص نے لوگوں کے دل موہ لئے، لوگ جوق در جوق دعوت اسلامی میں شریک ہونے لگے''۔ [2]

اس ماحول کی وجہ سے بے نمازی، نمازی بن گئے، ڈاکو لٹیرے تائب ہوئے، بد کردار لوگ تائب ہو کر اپنے کردار کی اصلاح کرنے والے بن گئے۔ تھوڑے عرصے میں دعوت اسلامی نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے کئی ممالک میں مقبول ہو گئی۔ جیسا کہ علامہ ذوالفقار لکھتے ہیں:

''اور مختصر سے وقت میں دعوت اسلامی کا کام عروج پر پہنچا اور یہ سلسلہ ملک پاکستان کے بے شمار دیہاتوں میں پھیل گیا بلکہ دنیا بھر کے بے شمار ممالک میں پھیل گیا اور مزید یہ کام اپنے عروج پر جاری ہے''۔ [3]

دعوت اسلامی کے انداز تبلیغ سے لوگ اچھا دینی تاثر لے رہے ہیں۔ اس طرح دعوت اسلامی کا دینی کام آئندہ ادوار میں مزید بڑھے گا۔ مسلمان اپنے دین کے مزید قریب آئیں گے اور با عمل مسلمان بنیں گے۔ ان تمام باتوں کے مد نظر دعوت اسلامی ایک عظیم دینی تحریک ہے جو امت مسلمہ کیلئے بہت کارآمد ہے اور اصلاحی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس

1۔ ملک عادل رضا، احیائے سنت میں امیر اہلسنت اور دعوت اسلامی کا کردار، ص ۳۲

2۔ ذوالفقار عطاری، دعوت اسلامی اور مخالفین، مکتبہ غوثیہ، سبزی منڈی کراچی، ص ۱۰

3۔ ذوالفقار عطاری، دعوت اسلامی اور مخالفین، مکتبہ غوثیہ، سبزی منڈی کراچی، ص ۱۰

فصل (دعوت اسلامی کیا ہمیت) کومزید مباحث میں پیش کیا جاتا ہے۔

لوگوں کے کردار کی اصلاح

لوگوں کی اصلاح کا فریضہ امت مسلمہ پر لازمی ہے کیونکہ جس معاشرے میں اصلاح نہ ہو تو وہ معاشرہ بہت جلد تباہی کے دہانے پہنچ جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کسی معاشرے کو شرک و کفر کی وجہ سے برباد نہیں کرتا لیکن اگر وہاں اصلاح کا فریضہ ادا کرنے والے مصلح لوگ موجود نہ ہوں تو وہاں تباہی ضرور آتی ہے۔جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

{وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ}[1]

(اور تمہارا رب ایسا نہیں ہے کہ وہ بستیوں کو ظلم کی وجہ سے ہلاک کر دے حالانکہ بستیوں والے اصلاح کرنے والے ہوں۔

اس آیت میں مفسرین کے مطابق ظلم سے مراد شرک و کفر ہے یعنی بستیاں اس وقت رب قدیر کے عذاب میں پھنستی ہیں جب ان کے باشندے مصلح نہ ہوں، باہمی معاملات کی اصلاح کرنے والے نہ ہوں۔ چنانچہ دعوت اسلامی کی تبلیغی اصلاحی تحریک کا جب آغاز ہوا تو اس ماحول کی وجہ سے کئی لوگوں کی اصلاح ہو گئی بلکہ بہت سے لوگ اس دعوت کا پیغام عام کرنے والے بن گئے۔ چنانچہ رسالہ ''دعوت اسلامی کا تعارف''میں کچھ یوں تحریر ہے۔

''آپ دامت برکاتہم العالیہ نے اس مدنی تحریک ''دعوت اسلامی'' کے ذریعے لاکھوں مسلمانوں بالخصوص نوجوان اسلامی بھائیوں اور بہنوں میں مدنی انقلاب برپا کر دیا۔ کئی بگڑے ہوئے نوجوان توبہ کر کے راہ راست پر آ گئے ... کفر کے اندھیروں میں بھٹکنے والوں کو نور اسلام نصیب ہوا، یورپین ممالک کی رنگینیوں کے دیکھنے کے خواہش مند کعبۃ المشرفہ اور گنبد خضریٰ کی زیارت کیلئے بے قرار رہنے لگے۔ دنیا کے بے جا غموں میں گھلنے والے فکر آخرت کی مدنی سوچ کے حامل بن گئے''۔[2]

واقعی اس ماحول کی وجہ ماں باپ کی بے ادبی کرنے والے باادب بن گئے، چور وڈاکو دوسروں کی عزت کی حفاظت کرنے والے بن گئے، متکبر لوگ عاجزی کے پیکر بن گئے، حسد کی آگ میں جلنے والے دوسروں کو دعائیں دینے والے بن گئے۔ فحش رسائل پڑھنے والے دینی کتب کا مطالعہ کرنے والے بن گئے۔یوں دعوت اسلامی نے لوگوں کے

1۔ سورۃ ھود ۱۱: ۱۱۷

2۔ مرکزی مجلس شوریٰ، دعوت اسلامی کا تعارف، مکتبۃ المدینہ کراچی، ص ۴

کردار پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور اخلاق و کردار میں بڑی تبدیلی سامنے آئی۔

2.2.2۔ عقائد کی اصلاح

جہالت کی وجہ سے طرح طرح گمراہیاں پھیلتی ہیں۔ جہالت کی وجہ سے امت مسلمہ کے اندر کہیں تو شرک جیسی برائی نے جنم لیا تو کہیں وہم پرستی نے اپنے قدم جمائے۔ کئی جگہیں یہ بھی ہوا کہ جہالت کی وجہ سے کچھ لوگ انبیاء، صحابہ، اولیاء کے بارے گستاخانہ عقائد و فکر رکھنے والے بن گئے جبکہ کئی نے رب قدیر لم یزل کے ساتھ دوسری ہستیوں کو معبود ٹھہرایا۔ اس طرح کچھ لوگوں نے انبیاء کی ہمسری کا دعویٰ بھی کیا۔ ان حالات میں جب دعوت اسلامی کا ماحول پھیلا تو دعوت اسلامی کے مبلغین کی مساعی جمیلہ اور مکتبۃ المدینہ سے شائع شدہ کتب و رسائل کی برکت سے جہاں شرک کے بادل چھٹنے لگے، وہاں اوہام پرستی کا خاتمہ شروع ہو گیا۔ اس کے علاوہ انبیاء، صلحاء، اولیاء کے بارے میں غلط عقیدہ رکھنے والوں کی بھی اصلاح ہونے لگی۔ دعوت اسلامی کا انداز تبلیغ و تربیت اتنا مؤثر ہے کہ جو بھی اس ماحول کے قریب آیا، اسے رب کریم کا خوف نصیب ہوا اور محبت مصطفی ﷺ دل میں رچ بس گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام، اولیاء عظام کی عقیدت بھی اس کے دل میں سماگئی۔ چنانچہ خوشتر نورانی، جام نور دہلی میں تحریر کرتے ہیں۔

"اس وقت دعوت اسلامی اپنے 30 سے زائد فعال شعبوں کے ساتھ دنیا کے 72 ممالک میں کام کر رہی ہے ... اور مختلف ممالک میں سینکڑوں غیر مسلموں کو اپنی مؤثر دعوت سے ایمان و یقین کے اجالے میں لا کھڑا کیا"۔ [1]

دعوت اسلامی کے ماحول کی وجہ سے کئی غیر مسلموں نے پاکستان اور پاکستان سے باہر اسلام قبول کیا کیونکہ دعوت اسلامی کے مبلغین سراپا سنت کا نمونہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ حبیب الرحمن سعیدی نظام تبلیغ میں لکھتے ہیں:

"صوبہ سندھ کی دیہی آبادی سے تعلق رکھنے والے پریم چند نامی ایک ہندو نوجوان نے جب دعوت اسلامی کو قریب سے دیکھا تو اس کے مدنی ماحول سے اتنا متأثر ہوا کہ فوراً دعوت اسلامی کے ذمہ دار کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہو گیا[2] "

اسی طرح کے سینکڑوں واقعات ہیں کہ غیر مسلموں نے دعوت اسلامی کے ماحول کی برکت سے اسلام قبول کیا۔ جہالت کی وجہ سے معاشرے میں کئی مسلمان ایسے کلمات بولتے ہیں جو کفریہ ہوتے ہیں اور جن کے بولنے کی وجہ

1۔ خوشتر نورانی، ماہنامہ جام نور، دہلی

2۔ حبیب الرحمٰن سعیدی، اسلام کا نظام تبلیغ اور دعوت اسلامی، رضا پبلیشرز، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۴۰

سے ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ الیاس عطار قادری نے ''کفریہ کلمات کے بارے میں سوال جواب'' کتاب لکھ کر امت مسلمہ کو بہت اچھی تالیف دی تا کہ مسلمان کفریہ عقائد و کلمات سے بچ جائیں۔ اس کتاب کی وجہ سے کفریہ عبارتیں اور اقوال واضح ہو گئے جن سے اپنے آپ کو بچانا آسان ہو گیا۔ الغرض دعوت اسلامی نے جہاں مسلمانوں کی عقائد کی اصلاح کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے وہاں پر غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت قولاً و عملاً پہنچائی جا رہی ہے۔

2.2.3۔ دین کی طرف رغبت

اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا۔

﴿اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ﴾[1]

(اگر تم (دین) خدا کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا)

جس کو اللہ تعالیٰ دین کی خدمت عطا فرماتا ہے اس کی روحانی امداد بھی کرتا ہے کیونکہ خدمت دین انبیاء کرام علیہم السلام کا شیوہ ہے۔ علامہ الیاس عطار قادری نے دعوت اسلامی کا ماحول قائم کر کے لوگوں کو دین کی خدمت پر لگا دیا ہے۔ جو لوگ مساجد سے دور اور مدارس سے لاتعلق تھے، ان کی تربیت کر کے ان کو مساجد کا امام اور مدارس کا مدرس بنا دیا ہے۔ اور جو لوگ سنتوں کو پامال کرتے تھے ان کو سنتوں کا باعمل مبلغ بنا دیا ہے۔ جیسا کہ ملک عادل رضا لکھتے ہیں۔

'' امیر اہلسنت کی برکت سے سنتوں کی ایسی بہار آئی کہ جب کوئی سنتوں کے باعمل مبلغ کو دیکھتا ہے تو اسے صحابہ کرام علیہم الرضوان کا حسین دور یاد آجاتا ہے''۔ [2]

یہ وقت کی ضرورت تھی کہ مسلمان عملی میدان میں ترقی کریں اور دعوت اسلامی نے اس مقصد کے لئے ایک پلیٹ فارم دے دیا۔ اس جماعت نے بوڑھوں، بچوں، مرد و خواتین سب کو متاثر کیا ہے۔ جیسا کہ ملک عادل رضا لکھتے ہیں۔

''آپ (الیاس قادری) کی اس سعی جمیلہ کی برکت نہ صرف نوجوانوں پر اثر انداز ہوئی بلکہ خواتین اور بچوں کی زندگی کی روش بھی تبدیل ہو گئی''۔ [3]

1۔ سورۃ محمد ۴۷:۷

2۔ ملک عادل رضا، احیائے سنت میں امیر اہلسنت اور دعوت اسلامی کا کردار، ص ۳۲

3۔ ملک عادل رضا، احیائے سنت میں امیر اہلسنت اور دعوت اسلامی کا کردار، ص ۱۶

اس ماحول کی وجہ سے خواتین کے اجتماع بھی شروع ہو گئے ہیں۔ کئی خواتین نے باقاعدہ شرعی پردہ اختیار کر لیا ہے۔ کئی عالمہ / حافظہ کورس کر رہی ہیں اور کئی بچے حافظ / عالم بن رہے ہیں۔ جیسا کہ ملک عادل رضا نے لکھا۔

"آپ (الیاس قادری) نہ صرف خود عامل سنت ہیں بلکہ امت کے نونہالوں کو بھی مجسمہ سنت بنا دیا ہے"۔ [1]

دعوت اسلامی کے مدارس میں حفظ و تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاق و روحانی تربیت بڑے اچھے انداز میں کی جاتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے سنتوں پر عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ فیض عباس قمر لکھتے ہیں۔

"دعوت اسلامی نے ایک ماحول دیا ہے اور وہ ماحول اسلامی ماحول ہے سنتوں بھرا ماحول ہے محبت اور اخوت کا ماحول ہے جو اس ماحول میں آتا ہے اور اس سے پوری طرح وابستہ ہو جاتا ہے... تو اس میں ذہنی فکری اور عملی تبدیلی شروع ہو جاتی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سنتوں کا پیکر بن جاتا ہے" [2]

مسلمان کو چاہیے کہ اپنے ایمان و عمل میں دن بدن اضافہ کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اچھے ماحول سے منسلک رہے جس طرح دعوت اسلامی کا ماحول ہے۔ اچھے ماحول کی برکت سے اس کے دین اور عمل میں اضافہ ہو گا۔ جس طرح فیض عباس قمر لکھتے ہیں۔

" اور یہ بھی سچی بات ہے کہ دعوت اسلامی کی تعلیم و تربیت کا جو اسلوب و انداز ہے وہ کہیں دیکھنے میں نہ آیا۔ چنانچہ دعوت اسلامی کے مبلغین سنتوں کے حوالے سے زبانی جمع خرچ سے کام نہیں لیتے بلکہ عملاً سنتوں کی تعلیم دیتے ہیں" [3]

دعوت اسلامی کے ماحول میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ جب اعتکاف میں سحری و افطاری کرائی جاتی ہے تو معتکفین کو سنت کے مطابق کھانے پینے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سونے جاگنے کی سنتیں بھی سکھائی جاتی ہیں۔ ہر جائز کام سے پہلے اچھی اچھی نیتیں کرنے کا ذہن دیا جاتا ہے تاکہ ہر مباح کام بھی ثواب بن جائے۔ یوں اس ماحول کی وجہ سے لوگ دین کے قریب آ رہے ہیں۔ دینی شعائر کا احیاء ہو رہا ہے اور معاشرے میں ایک اسلامی تبدیلی نظر آ رہی ہے۔

1۔ ایضاً، ص ۱۰

2۔ ایضاً، ص ۳۵

3۔ فیض عباس قمر، اتباع سنت نبوی اور دعوت اسلامی، مسلم کتابوی لاہور ۲۰۰۰ء، ص ۷

2.2.4۔ عشق رسول ﷺ کی آبیاری

حبیب خدا ﷺ کا فرمان معظم ہے۔

(لا یومن احدکم حتی أکون أحب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین)۔[1]

ترجمہ: تم میں سے کوئی اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے والدین، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

ایمان کامل کے لئے ضروری ہے کہ محبت رسول ﷺ تمام چیزوں کی محبت پر غالب ہو کیونکہ یہ محبت بہت بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ اس سرمائے کو دلوں سے نکالنے کیلئے ہمیشہ غیر مسلم قوتوں نے کوششیں جاری رکھیں کیونکہ جب یہ سرمایہ دل سے نکل جاتا ہے تو باقی کچھ نہیں بچتا، اس لئے اس کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ اس دور میں دعوت اسلامی لوگوں کو دین کی محبت دیکر علم دین سکھا کر محبت رسول ﷺ عام کر رہی ہے۔ چنانچہ عادل رضا لکھتے ہیں۔

"بے شمار لوگ آپ (الیاس قادری) کی خوبصورت انداز میں کی گئی اصلاح کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے قبول کر کے خدائے رحمان کے حقیقی بندے اور پیارے مصطفی ﷺ کے سچے عاشق بن چکے ہیں"۔[2]

کیونکہ علامہ الیاس قادری خود ایک عاشق رسول ﷺ باعمل مبلغ ہیں اس لئے آپ نے مسلمانوں کو بھی ایسی محبت رسول ﷺ پلائی کہ وہ بھی مخلص عاشق رسول ﷺ بن گئے۔ جیسا کہ ملک عادل رضا لکھتے ہیں:

"عشق رسول ﷺ کی لازوال دولت آپ (الیاس قادری) کے رگ و پے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ آپ نے عشق رسول ﷺ کی پاکیزہ معطر و معنبر خوشبو سے پوری دنیا کو مہکا دیا ہے اور آج الحمد للہ ہزاروں مبلغین عشق رسول ﷺ کی کرنیں بکھیر کر اجالا پھیلا رہے ہیں"[3]

2.3۔ دعوت اسلامی کا طریقہ کار

بانی دعوت اسلامی نے معاشرے کی اصلاح کے لئے 12 دینی کام مرتب کئے ہیں تاکہ ایک مسلمان خود بھی فرائض وواجبات، سنن ومستحبات کی بجاآوری لاتا رہے، ساتھ ساتھ معاشرے کے دوسرے لوگوں کو بھی نیک

1۔ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول ﷺ من الایمان، ص ۱۵

2۔ ملک عادل رضا، احیائے سنت میں امیر اہلسنت اور دعوت اسلامی کا کردار، ص ۱۶

3۔ ملک عادل رضا، احیائے سنت میں امیر اہلسنت اور دعوت اسلامی کا کردار، ص ۱۶

ماحول میں سموتا رہے۔

1۔ ذاتی اصلاح

دعوت اسلامی کے مقاصد میں سے اول اور اہم ترین مقصد ذاتی اصلاح ہے کہ ہر فرد اپنی اصلاح پر توجہ دے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جو شخص بھی آیا اگر وہ بلوغت اور عقلیت کی صفات سے متصف ہے تو اس سے بروز قیامت اس کی ذاتی کارکردگی کے بارے میں سوال ہوگا۔ جیسا کہ فرمان مصطفی ﷺ ہے:

(کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته)۔[1]

ترجمہ: ''تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا''

اس سے معلوم ہوا کہ ہر فرد کو ذمہ دار بنایا گیا ہے کوئی فرد ذمہ داری سے خالی نہیں۔ کوئی عام مخلوق اس کی رعیت میں بے شک نہ ہو مگر اس کی اپنی ذات اس کی رعیت شامل میں ہے۔ اس سے اس کی ذات کے بارے میں سوال ہوگا۔

انسان کے ساتھ نفس اور شیطان کی صورت میں دو برائی کی قوتیں موجود ہیں اس لئے ضروری ہے کہ انسان ان قوتوں کا مقابلہ کرنے کیلئے کوشش کرتا رہے۔ اسی کوشش کو بانی دعوت اسلامی نے ذاتی اصلاح کا نام دیا ہے۔ قرآن پاک میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول یوں ہے:

﴿وَمَآ أُبَرِّئُ نَفۡسِيٓۚ إِنَّ ٱلنَّفۡسَ لَأَمَّارَةُۢ بِٱلسُّوٓءِ﴾[2]

(میں اپنے نفس کو بے قصور نہیں بتاتا۔ بے شک نفس تو برائی کا بڑا حکم دینے والا ہے)

نفس کی قوت انسان کو برائی پر اکساتی ہے۔ انسان کا بھی فرض ہے کہ اس کا مقابلہ کرے اور ذاتی اصلاح میں لگا رہے، کیوں کہ نفس کی اصلاح ہی کو کامیابی قرار دیا ہے۔ جیسا کہ سورہ الشمس میں ارشاد ربانی ہے:

﴿قَدۡ أَفۡلَحَ مَن زَكَّىٰهَا، وَقَدۡ خَابَ مَن دَسَّىٰهَا﴾[3]

(بے شک مراد کو پہنچا جس نے اسے ستھرا کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا۔)

1۔ الہیثمی، نور الدین، علی بن ابی بکر، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، دار الفکر بیروت، کتاب الخلافۃ، باب کلم راع، ج ۵، ص ۲۰۸

2۔ سورۃ یوسف ۱۲: ۵۳

3۔ سورۃ الشمس ۹۱: ۹ تا ۱۰

یعنی جس نے ذاتی اصلاح (نفس کی اصلاح) کر لی وہ کامیاب ہو گیا اور جو اپنی ذاتی اصلاح نہ کر سکا، گناھوں و نافرمانیوں میں لگا رہا تو وہ خائب اور خاسر ہو گیا۔

اس لئے بانی دعوت اسلامی نے ذاتی اصلاح کا مقصد دے کر امت مسلمہ کو نفس کی اصلاح کی طرف بھرپور توجہ دلائی ہے۔ ذاتی اصلاح کے لئے 72 مدنی انعامات پر مشتمل ایک پورا نظام عطا کیا ہے کہ ہر فرد اس پر عمل کے لئے کوشش کرے اور ذاتی اصلاح میں ہمہ تن مصروف ہو جائے۔ بانی دعوت اسلامی نے خواتین کیلئے 63 مدنی انعامات کا رسالہ مرتب فرمایا ہے جو ان کے حسب حال ذاتی اصلاح کا بہترین نسخہ ہے۔ نابالغ بچوں اور بچیوں کی اصلاح و تربیت کے لئے 40 مدنی انعامات کا رسالہ ترتیب دیا ہے۔

الغرض امت مسلمہ کے ہر فرد کو اس کی عمر کے مطابق ذاتی اصلاح کا نہایت ہی اعلیٰ نظام عطا کیا ہے۔ ان مدنی انعامات میں جہاں شرعی فرائض و واجبات کی ادائیگی کا سوال ہے وہیں پر اخلاقی تربیت کیلئے بے شمار مدنی انعامات بصورت سوالات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے مدنی انعامات ہیں جن پر عمل سے نہ صرف تحریک پھلتی پھولتی ہے بلکہ معاشرے میں نیکی کی دعوت کا فریضہ احسن انداز میں انجام پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ الیاس قادری فرماتے ہیں۔

"مدنی کاموں میں ترقی، اخلاقی تربیت اور تقویٰ ملے، اس غرض سے میں نے مدنی انعامات کا سلسلہ شروع کیا اگر ہم اخلاص کے ساتھ کوشش کریں تو ان مدنی انعامات پر عمل کر سکتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم بن ادھم فرماتے ہیں جو کام دنیا میں جتنا دشوار ہو گا بروز قیامت میزان میں اتنا ہی وزن دار ہو گا"[1]

اس طرح مدنی انعامات پر عمل کرنے سے جہاں فرائض و واجبات و سنن و مستحبات کی ادائیگی ہوتی ہے وہیں پر اخلاقی تربیت بھی حاصل ہوتی ہے، رضائے خدا و مصطفیٰ کا حصول بھی ہوتا ہے اور دنیا اور آخرت میں کامیابی کا سبب بھی ہے۔ مدنی انعامات سوالات و جوابات کی صورت میں ذاتی محاسبہ ہے۔ بانی دعوت اسلامی نے ذاتی محاسبے کو سامنے رکھتے ہوئے مدنی انعام نمبر ۲ یوں ترتیب دیا ہے:

"کیا آج آپ نے پانچوں نمازیں مسجد کی پہلی صف میں تکبیر اولیٰ کے ساتھ باجماعت ادا فرمائیں؟ نیز ہر بار کسی ایک کو اپنے ساتھ مسجد لے جانے کی کوشش فرمائی؟"[2]

1۔ مجلس المدینۃ العلمیہ، مدنی تحفہ، مکتبہ المدینہ کراچی، ص ۲۲

2۔ محمد الیاس عطار قادری، ۷۲ مدنی انعامات، مکتبہ المدینہ کراچی، ص ۳

اس مدنی انعام میں علامہ الیاس قادری نے ایک مسلمان عاقل بالغ مرد کو نماز باجماعت جیسے اہم فریضے کی طرف توجہ دلائی۔اس کے علاوہ کسی ایک کو ساتھ لے جانے کی کوشش کے بارے میں سوال پوچھا۔اس طرح فرض و واجب کی ادئیگی بھی ہو گی اور دوسرے مسلمانوں تک نیکی کی دعوت بھی پہنچتی رہے گی۔یوں نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گااور شعائر اسلام زندہ ہوں گے۔ بانی دعوت اسلامی نے مدنی انعام نمبر 5 کچھ یوں ترتیب دیا ہے۔

''کیا آج آپ نے گھر ،دفتر ،بس وٹرین وغیرہ میں آتے جاتے اور گلیوں سے گزرتے ہوئے راہ میں کھڑے یا بیٹھے ہوئے مسلمانوں کو سلام کیا''؟[1]

اس مدنی انعام میں سلام کی اہم سنت کی تاکید کی گئی ہے جس سے باہم محبتیں استوار ہوتی ہیں اور بغض و حسد ختم ہوتا ہے۔ سلام میں پہل کرنے والا بحکم حدیث تکبر سے بری ہوتا ہے۔ مولانا الیاس قادری نے مدنی انعام نمبر ۹ کچھ اس طرح ترتیب دیا ہے۔

''کیا آج آپ نے سلام کا جواب اور چھینکنے والے کے الحمد للہ کہنے پر فوری اتنی آواز سے یرحمک اللہ کہا کہ دونوں نے سن لیا؟[2]

چونکہ رد السلام اور تشمیت العاطس دونوں واجب ہیں اس لئے اس مدنی انعام میں اس واجب کی ادائیگی کا حکم بصورت سوال پوچھا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کے اندر ان دونوں احکام کی بیداری آئے۔اس طرح مسلمانوں کے اندر اخلاقی نکھار پیدا کرنے کیلئے چند مدنی انعام بانی دعوت اسلامی نے مقرر کئے ہیں۔ چنانچہ مدنی انعام نمبر 34 کچھ یوں ہے۔

''کیا آج آپ نے (گھر میں اور باہر) کسی پر تہمت تو نہیں لگائی کسی کا نام تو نہیں بگاڑا؟ کسی سے گالی گلوچ تو نہیں کی؟ (کسی کو سور، گدھا، چور، لمبوں، ٹھنگوں وغیرہ نہ کہا کریں)[3]

اس مدنی انعام میں تہمت گالی گلوچ سے منع کیا گیا ہے {وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ}[4] کے مطابق نام بگاڑنا بھی گناہ ہے۔اس لئے ان معاشرتی برائیوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کے اندر اخلاقی برائیاں پیدا نہ

1۔ ایضاً، ص ۵

2۔ ایضاً، ص ۸

3۔ محمد الیاس عطار قادری، ۷۲ مدنی انعامات، ص ۱۱

4۔ سورۃ الحجرات ۴۹:۱۱

ہوں۔ مسلمان اخلاق حسنہ کے پیکر بنیں کیونکہ اکثر دفعہ مسلمانوں میں باہمی جنگ وجدل کا سبب یہی چیزیں بنتی ہیں۔اس طرح مدنی انعام نمبر 36 میں کچھ اس انداز میں سوال کیا گیا ہے۔

''کیاآج آپ نے راہ چلتے وقت اور گاڑی میں سفر کے دوران آنکھوں کا قفل مدینہ لگاتے ہوئے حتی الامکان نگاہیں نیچی رکھیں۔ نیز بلا ضرورت (گھر میں اور باہر بھی)ادھر ادھر دیکھنے،سائن بورڈ وغیرہ پر نظر ڈالنے سے بچنے کی کوشش کی؟[1]

اس مدنی انعام میں آنکھوں کی حفاظت کا ذہن سوال کی صورت میں دیا گیا ہے اور آنکھوں کو جھکانے کا حکم قرآن پاک نے یوں دیا ہے۔

{قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ}[2]

ترجمہ: تم مومنوں سے فرمادو کہ وہ اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

اس سے مراد یہی ہے کہ آنکھ کچھ نیچی رہے گی تو اس کو بدنگاہی وغیرہ سے بچانا آسان ہو گا اور اگر آنکھ کبھی ادھر اور کبھی ادھر دیکھے تو بدنگاہی وغیرہ گناہوں میں پڑنے کا بھی قوی اندیشہ ہوتا ہے۔اس لئے بانی دعوت اسلامی نے اس مدنی انعام میں امت مسلمہ کو تنبیہ فرمائی کہ اپنی نگاہ کی حفاظت کریں یوں ہر شخص کی عزت وآبرو سلامت رہے گی۔ معاشرتی برائیوں میں کمی آئے گی۔ مذکورہ مدنی انعام ذاتی اصلاح سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔

دعوت اسلامی کے اہم مقاصد میں سے اہم ترین مقصد بندے کی ذاتی اصلاح ہے جو کہ بانی دعوت اسلامی نے ذاتی محاسبے کی صورت میں سوالات وجوابات کے انداز میں پیش کی۔ چنانچہ اس کی تائید حدیث پاک سے بھی ملتی ہے۔

"عن شداد بن اوس قال قال رسول الله ﷺ الكيس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت والاحمق من اتبع نفسه هواها وتمنى على الله"[3]

چنانچہ مذکورہ حدیث میں اس شخص کو دانا کہا گیا ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے اور موت کے بعد والی زندگی کیلئے اعمال صالحہ بجالاتا ہے۔ چنانچہ سیدنا عمر فاروقؓ نے ارشاد فرمایا۔

1۔ محمد الیاس عطار قادری، ۷۲ مدنی انعامات، ص ۱۱

2۔ سورۃالنور ۲۴: ۳۰

3۔ احمد بن حنبل، الامام، المسند، دارالفکر بیروت ۱۴۱۴ھ، باب حدیث شداد بن اوس، ج ۴، ص ۱۲۴

"اپنے نفس کا محاسبہ کرو اس سے پہلے کہ تمہارا حساب لیا جائے"[1]

الغرض مدنی انعامات پر عمل ایک مسلمان کی عملی زندگی میں روحانی جذبہ پیدا کرتا ہے۔ عبادت کا ذوق بڑھتا ہے اور کئی اخلاق رذیلہ سے نجات ملتی ہے۔ چنانچہ مدنی انعامات کی وجہ سے ایک شخص کی زندگی میں تبدیلی آئی جو کتاب (تربیت اولاد) میں موجود ہے یہ واقعہ مذکورہ شخص کے بھائی نے بتایا۔

"علاقے کی مسجد کے امام صاحب جو کہ دعوت اسلامی سے وابستہ ہیں انہوں نے انفرادی کوشش کرتے ہوئے میرے بڑے بھائی کو مدنی انعامات کا ایک کارڈ تحفے میں دیا۔ وہ گھر لے آئے اور پڑھا تو حیران رہ گئے کہ اس مختصر سے کارڈ میں ایک مسلمان کو اسلامی زندگی گزارنے کا اتنا زبردست فارمولا دے دیا گیا ہے۔ مدنی انعامات کا کارڈ ملنے کی برکت سے الحمد للہ ان کو نماز کا جذبہ ملا اور باجماعت نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد میں حاضر ہو گئے اور اب پانچ وقت کے نمازی بن چکے ہیں۔ داڑھی مبارک بھی سجالی ہے اور مدنی انعامات کا کارڈ بھی پر کرتے ہیں"[2]

اس طرح بے شمار لوگوں کی زندگیوں میں عملی تبدیلی آئی ہے یہ رسالہ (کارڈ) پر کر کے اسلامی ماہ کے اختتام پر صرف آخری صفحہ ذمہ دار کو جمع کرادیا جاتا ہے۔ اس صفحے پر ان مدنی انعامات کی تعداد لکھی جاتی ہے جن پر عمل کی کوشش رہی۔

2۔ معاشرے کی اصلاح

دعوت اسلامی کے مقاصد میں دوسرا اہم مقصد معاشرے کی اصلاح ہے۔ اگر مسلمان خود اعمال صالحہ بجالاتا رہے اور ارد گرد کے ماحول میں نیکی کی دعوت نہ کرے تو آخر ایک دن آتا ہے کہ اس کے گھر اور محلے میں بھی وہی برائیاں پہنچ جاتی ہیں۔ ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اعمال صالحہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تبلیغ بھی کرتا رہے۔ معاشرے کی اصلاح تو اس امت کی خصوصیت ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾[3]

(تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں۔ بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو)

1۔ مجلس المدینۃ العلمیہ، فیضان احیاء العلوم، مکتبہ المدینۃ کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۷۹

2۔ مجلس المدینۃ العلمیہ، تربیت اولاد، ص ۲۹

3۔ سورۃ آل عمران ۳: ۱۱۰

امت مسلمہ خیر الامم ہے اس کا فریضہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کا کام احسن انداز میں کرتی رہے

صدائے مدینہ

دینی کاموں میں پہلا کام صدائے مدینہ ہے۔اذان فجر کے بعد دو چار مسلمان مل کر مخصوص الفاظ دہراتے ہیں اور لوگوں کو نماز فجر کیلئے جگاتے ہیں۔ بانی دعوت اسلامی کی طرف سے صدائے مدینہ کے تحریر شدہ الفاظ میں سے کچھ یہ ہیں۔

"فجر کا وقت ہو گیا اٹھو — اے غلامان مصطفیٰ ﷺ اٹھو

اٹھو ذکر خدا کرو اٹھ کر — دل سے لو نام مصطفیٰ ﷺ اٹھو"[1]

اس طرح نماز کی دعوت تمام لوگوں کو مخصوص الفاظ میں دی جاتی ہے۔اس کو صدائے مدینہ کہتے ہیں۔اس دینی کام کے ذریعے معاشرے کی اچھے انداز میں اصلاح ہوتی ہے۔

تفسیر قرآن پاک

12 دینی کاموں میں سے دوسرا کام قرآن پاک سے تین آیات ترجمہ و تفسیر پڑھ کر سنانا ہے کیونکہ ارشاد مصطفیٰ ﷺ ہے۔

(خیرکم من تعلم القران وعلمہ)[2]

ترجمہ: تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور اسے دوسروں کو سکھایا۔

ترجمہ و تفسیر بھی قرآنی علوم سے ہے اور حدیث کے مطابق وہ شخص سب سے بہتر ہے جو قرآنی علوم سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔اس طرح نماز فجر کے بعد مسلمانوں کو مسجد میں جمع کر کے قرآن پاک کی تین آیات ترجمہ و تفسیر سنائی جاتی ہے۔ جس سے ان پڑھ لوگ بھی مستفید ہوتے ہیں۔یوں معاشرے میں قرآنی علوم کے ذریعے اصلاح کا کام انجام دیا جاتا ہے۔

درس فیضان سنت

تیسرا دینی کام درس فیضان سنت ہے۔ علامہ الیاس عطار قادری لکھتے ہیں۔

1۔ مجلس المدینۃ العلمیہ، رہنمائے جدول، ص ۱۰۲

2۔ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب، خیر کم من تعلم القرآن وعلمہ، ۴۶۳۹

"فیضان سنت سے درس دینا بھی دعوت اسلامی کا ایک مدنی کام ہے۔گھر، مسجد، سکول، کالج چوک وغیرہ میں وقت مقرر کرکے روزانہ درس کے ذریعے خوب خوب سنتوں کے پھول لٹائیے اور ڈھیروں ثواب کمائیے" [1]

درس فیضان سنت سے معاشرے میں سنت کا احیاء ہو رہا ہے جس کی موجودہ دور میں اشد ضرورت ہے۔

چوک درس

چوتھا دینی کام چوک درس ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت ایسی ہے جو مسجد سے دور ہے ایسے لوگوں تک دین کا پیغام پہنچانے کیلئے مسجد سے باہر مناسب مقام پر درس فیضان سنت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔علامہ الیاس قادری تحریر کرتے ہیں۔

"ذمہ دار گھڑی کا وقت مقرر کرکے روزانہ چوک درس کا اہتمام کریں۔ مثلاً رات نو بجے مدینہ چوک، 9½ بجے بغدادی چوک وغیرہ پر چوک درس کا اہتمام کیجئے مگر حقوق عامہ تلف نہ ہوں۔ مثلاً مسلمانوں کا راستہ نہ رکے ورنہ گنہگار ہوں گے" [2]

یوں معاشرے کی اصلاح کا سامان چوک درس کے ذریعے کیا جاتا ہے تاکہ سارا معاشرہ سنت کے رنگ میں ڈھل جائے۔

علاقائی دورہ برائے نیکی کی دعوت

یہ ہفتہ وار دینی کام ہے جس میں نیکی کی دعوت دی جاتی ہے۔علامہ الیاس قادری لکھتے ہیں۔

"ہفتے میں ایک دن مخصوص کرکے اپنے ذیلی حلقے میں گھر گھر، دکان دکان جا کر نیکی کی دعوت ضرور دیں اگر آپ اکیلے ہیں تو وادی منیٰ میں تنہا خیمہ خیمہ جا کر نیکی کی دعوت دینے والے مکی مدنی محبوب ﷺ کو یاد کریں" [3]

علاقائی دورہ کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کا اہتمام کیا جاتا ہے۔بے نمازیوں کو نماز کی دعوت دی جاتی ہے۔ نماز کے بعد مختلف موضوعات پر اصلاحی بیانات کئے جاتے ہیں تاکہ لوگوں کو نیکی کی محبت اور گناہ سے نفرت ہو جائے۔

1۔ مرکزی مجلس شوریٰ، مدنی کارکردگی ڈائری، ص ۷

2۔ ایضاً، ص ۲۹۵

3۔ محمد الیاس قادری، ۷۲ مدنی انعامات، ص ۱۷

مدرسۃالمدینہ (بالغاں)

اس مدنی کام میں ان بالغ حضرات کو قرآن پاک پڑھایا جاتا ہے جو صحیح قرأت و تجوید کے ساتھ قرآن پاک نہیں پڑھ سکتے۔ جیسا کہ مرکزی مجلس شوریٰ (دعوت اسلامی) تحریر کرتی ہے۔

''مختلف مساجد وغیرہ میں عموماً بعد نماز عشاء ہزارہا مدرسۃالمدینہ کی ترکیب ہوتی ہے جن میں اسلامی بھائی صحیح مخارج سے حروف کی درست ادائیگی کے ساتھ قرآن کریم سیکھتے اور دعائیں یاد کرتے، نمازیں وغیرہ درست کرتے اور سنتوں کی تعلیم مفت حاصل کرتے ہیں''[1]

اس طرح مدرسۃالمدینہ (بالغاں) کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کا کام انجام دیا جاتا ہے۔

TV Channel

دین اسلام کے اندر ایسی صلاحیت ہے کہ یہ ہر زمانے کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آج کے مصروف دور میں لوگ دینی کاموں کے لئے وقت نہیں دیتے۔ اس لئے وقت کا تقاضا ہے کہ دین کا پیغام ان کو گھر کی دہلیز تک پہنچایا جائے۔ ایسے حالات میں دعوت اسلامی نے ایک خالص اسلامی چینل شروع کر کے اس کمی کو دور کر دیا ہے۔ یہ چینل نہ صرف مسلمانوں کی اصلاح کر رہا ہے بلکہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت بھی دے رہا ہے۔ چنانچہ ماہنامہ جام نور دہلی کے مصنف لکھتے ہیں۔

''قرآن وسنت کی عالمگیر غیر سیاسی تحریک دعوت اسلامی نے بھی اسی شرعی حاجت کے پیش نظر ۲۰۰۹ء میں مدنی چینل کے نام سے اپنا چینل لانچ کیا جو آج عالمی سطح پر کروڑوں افراد کے درمیان اسلام کی دعوت و تبلیغ، صالح معاشرے کی تشکیل اور امت مسلمہ کی اصلاح کا فریضہ انجام دے رہا ہے'' [2]

الغرض دعوت اسلامی کا ٹی وی چینل دور جدید کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک اچھا Electronic مبلغ ہے جو معاشرے کی اصلاح میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

ہفتہ وار اجتماع

دعوت اسلامی کے ماحول میں شہر یا علاقہ سطح پر ہفتہ وار اصلاحی پروگرام ہوتا ہے جس میں علاقہ / شہر بھر کے

1۔ مرکزی مجلس شوریٰ، مدنی کارکردگی ڈائری، ص ۷

2۔ خوشتر نورانی، ماہنامہ جام نور دہلی، مئی ۲۰۰۹، ص ۷

لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے۔ یہ اجتماع پاکستان میں مغرب تا عشاء ہوتا ہے۔ دیگر ممالک میں ان کے مناسب اوقات کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ عالمی مرکز فیضان مدینہ کراچی کا ہفتہ وار اجتماع مدنی چینل پر براہ راست نشر کیا جاتا ہے۔ الغرض ہفتہ وار اجتماع دعوت اسلامی کے ماحول میں معاشرے کی اصلاح کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ جس کے ذریعے کئی لوگوں کی زندگیاں بدل جاتی ہیں۔ بڑے شہروں میں یہ اجتماع ایک سے زائد مقامات پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ کراچی شہر میں چار جگہوں پر اس اجتماع کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

مدنی قافلے

اللہ کے پیارے رسول ﷺ تمام کائنات کے لئے ہادی بنا کر بھیجے گئے۔ آپ ﷺ تمام جہانوں کے لئے رحمت ہیں۔ آپ کی امت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ دین کا پیغام ساری دنیا کے لوگوں تک پہنچائے۔ جیسا کہ مرکزی مجلس شوریٰ لکھتی ہے۔

" عاشقانِ رسول کے سنتوں کی تربیت کے بے شمار مدنی قافلے ملک بہ ملک، شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ سفر کر کے علم دین اور سنتوں کی بہاریں لٹا رہے ہیں اور نیکی کی دعوت کی دھوم میں مچا رہے ہیں"۔ [1]

اس طرح کئی لوگ قافلوں میں سفر کر کے ضروری مسائل بھی سیکھتے ہیں اور دین کی محبت بھی پاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں عملاً تبدیلی بھی آجاتی ہے۔ مدنی قافلے میں سفر کیسے کیا جائے؟ اس غرض کیلئے مدنی قافلہ کورس بھی کرایا جاتا ہے تا کہ مبلغ خود زیور علم سے آراستہ ہو کر دوسرے لوگوں تک دین کا پیغام احسن انداز میں پہنچائے۔ قافلوں کی برکت سے غیر آباد مساجد، آباد ہو جاتی ہیں۔ لوگ نیکیوں کی طرف مائل ہوتے ہیں اور کئی جگہ غیر مسلم اسلام بھی قبول کر لیتے ہیں۔ چنانچہ مجلس المدینۃ العلمیہ تحریر کرتی ہے۔

-"ایک مدنی قافلہ دینِ اسلام کی بہار سمیٹنے کی شوق میں نمپولا [2] گیا وہاں ایک شراب خانے کے مالک مدہن لال نامی کافر پر انفرادی کوشش کی الحمد اللہ وہ مسلمان ہو گیا۔ اس کا اسلامی نام عبد الکریم رکھا گیا۔ عبد الکریم نے مسلمان ہونے کے بعد اپنے شراب خانے کو مسجد بنا دیا اور وہاں باقاعدگی کے ساتھ پانچ وقت کی نماز ہوتی ہے۔ اسی مدنی قافلے میں انفرادی کوشش کی برکت سے ایک سابقہ وزیر خزانہ، اس کا سیکرٹری اور اسسٹنٹ مسلمان ہو گئے ان کا پرانا ماشل

1۔ مرکزی مجلس شوریٰ، دعوت اسلامی کی جھلکیاں، مکتبہ المدینہ کراچی ۲۰۰۷ء، ص ٦

2۔ موزمبینق کا ایک صوبہ

تھااور نیانام محمد اویس رکھا گیا۔اسی ماہ ایک مبلغ کی انفرادی کوشش کی برکت سے موجودہ وزیر خزانہ کا مشیر بھی مسلمان ہو گیا۔"[1]

مدرستہ المدینہ

مدرستہ المدینہ میں حفظ وناظرہ کی تعلیم قراءت و تجوید کے ساتھ دی جاتی ہے بچوں اور بچیوں کو نہ صرف قرآن پاک حفظ کرایا جاتا ہے بلکہ احسن انداز میں ان کی اخلاقی اور دینی تربیت بھی کی جاتی ہے۔ جیسا کہ مرکزی مجلس شوریٰ لکھتی ہے۔

"اندرون وبیرون ملک حفظ وناظرہ کے لاتعداد مدارس بنام "مدرستہ المدینہ" قائم ہیں پاکستان میں تادم تحریر کم وبیش 70 ہزار مدنی منے اور مدنی منیوں کو حفظ وناظرہ کی مفت تعلیم دی جاتی ہے۔"[2]

مدارس المدینہ جہاں حفظ وناظرہ کی تعلیم عام کر رہے ہیں وہاں ساتھ ساتھ نوجوان نسل کو معاشرے کے عظیم افراد بھی بنا رہے ہیں۔

جامعۃ المدینہ

دعوت اسلامی کے زیر اہتمام جامعۃ المدینہ میں عالم / عالمہ کورس کرایا جاتا ہے۔ جیسا کہ مرکزی مجلس شوریٰ لکھتی ہے ۔"ملک وبیرون ملک کثیر جامعات بنام "جامعۃ المدینہ" قائم ہیں ان کے ذریعے لاتعداد اسلامی بھائیوں کو حسب ضرورت قیام وبعام کی سہولتوں کے ساتھ "درس نظامی"(عالم کورس)اوراسلامی بہنوں کو"عالمہ کورس" کی مفت تعلیم دی جاتی ہے۔"[3]

جامعات میں ہزاروں طلباوطالبات دینی تعلیم بھی پارہے ہیں اوران کی اخلاقی وشرعی تربیت بھی جاری ہے اور معاشرے کے ایک باعمل افراد کی صورت میں ابھر رہے ہیں۔کئی علماء فارغ التحصیل ہو کر دوسرے ممالک میں بھی جاکر دین اسلام کی اشاعت کرتے ہیں۔اس طرح دعوت اسلامی کے جامعات اصلاح معاشرہ میں اہم فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

1۔ مجلس المدینۃ العلمیہ، تعارف امیر اہلسنت، مکتبہ المدینہ کراچی ۲۰۰۷ء، ص ۸۲

2۔ مرکزی مجلس شوریٰ، دعوت اسلامی کی جھلکیاں، ص ۱۹

3۔ مجلس المدینۃ العلمیہ، تعارف امیر اہلسنت، ص ۷۷

مجلس فیضان قرآن

دعوت اسلامی کی یہ مجلس جیلوں میں قیدیوں کی اصلاح کی کوشش کرتی ہے کیونکہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو معاشرے میں نفس و شیطان کے بہکاوے میں آکر ڈکیتی، قتل وغارت، دہشتگردی وغیرہ جیسے جرائم کرتے ہیں۔ جیسا کہ مجلس فیضان قرآن لکھتی ہے۔

"مجلس فیضان قرآن کے تحت جہاں قیدیوں کا مدنی ذہن بنانے کے لئے انہیں تعلیم قرآن (حفظ و ناظرہ) نماز، تجوید کورس، شریعت کورس، امامت کورس، ترجمہ و تفسیر کورس، مدرس کورس، عربی لینگوئج کورس کرانے کی بتدریج ترکیب جاری ہے وہیں دنیاوی طور پر معاشی استحکام کیلئے کمپیوٹر کورس، ٹیکنکل کورس کروانے کی بتدریج کوشش بھی کی جارہی ہے تاکہ گناہوں سے نفرت اور نیکیوں سے محبت بھی پیدا ہو اور قیدی جیل سے رہائی پانے کے بعد اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکیں"[1]

مجلس فیضان قرآن کی کوششوں سے کئی قیدیوں کی اصلاح کی خبریں ہیں۔ یہ دعوت اسلامی کا انتہائی فعال شعبہ ہے۔ جو قیدیوں کی دینی تربیت کرتا ہے۔ اس طرح یہ مجلس اصلاح معاشرہ میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

خواتین کی اصلاح

دعوت اسلامی کے زیر اہتمام خواتین کی پردے کے اندر دینی تربیت کی جاتی ہے تاکہ انہیں بھی شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کا طریقہ آجائے۔ جیسا کہ مرکزی مجلس شوریٰ لکھتی ہے۔

"اسلامی بہنوں کے بھی شرعی پردے کے ساتھ متعدد مقامات پر ہفتہ وار سنتوں بھرے اجتماع ہوتے ہیں۔ لاتعداد بے عمل اسلامی بہنیں باعمل، نمازی اور مدنی برقعوں کی پابند ہو چکی ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں گھروں کے اندر تقریباً روزانہ ہزاروں مدارس بنام مدرسۃ المدینہ (بالغات) بھی لگائے جاتے ہیں۔"[2]

اس کے علاوہ خواتین کی تربیت کیلئے قرآن وحدیث کورس بھی کرایا جاتا ہے۔ دعوت اسلامی کی ذمہ دار خواتین کیلئے 12 دن کا تربیتی کورس اور قافلہ کورس بھی شروع کیا جاچکا ہے۔

دعوت اسلامی کے مذکورہ دینی کاموں کو دیکھتے ہوئے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ دعوت اسلامی لوگوں کو

1۔ مجلس فیضان القرآن، دعوت اسلامی کی جیل خانہ میں خدمات، ص ۲

2۔ مرکزی مجلس شوریٰ، دعوت اسلامی کا تعارف، ص ۲۱

شریعت کی بنیادی باتیں سکھا رہی ہے۔ یہ بات بھی عیاں ہے کہ دعوت اسلامی ان دینی کاموں کے ذریعے معاشرے کے تقریباً ہر شعبے میں حکیمانہ انداز میں اصلاح کا کام بھی کر رہی ہے۔ دعوت اسلامی کے ماحول میں خاص طور پر نوجوان نسل زیادہ شامل ہو رہی ہے۔ اگر نوجوان اپنی اصلاح کر لیں تو پورا معاشرہ سنور سکتا ہے۔ معاشرے کی اصلاح دعوت اسلامی کا اہم مقصد ہے جس کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

3۔اسلام سرکل آف نارتھ امریکہ

امریکہ میں دعوتی کام کا باقاعدہ آغاز 1960 کی دہائی کے آغاز میں مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے نام سے امریکہ کی جامعات کے طلبہ نے شروع کیا تھا۔ ان لوگوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ دور طالبعلمی ختم ہو جانے کے بعد بھی ان متحرک افراد کو دین کی دعوت اور کو دا پنے آپ اور اپنے خاندان کو دینی سرگرمیوں میں مشغول رکھنے کے لئے کوئی اور موقع میسر نہیں ہے لہذا وہ طالب علم نہ رہتے ہوئے بھی اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن سے وابستہ رہتے اور ایک موقع ایسا بھی آیا کہ اس کے تقریباً تمام عہدیدار غیر طالب تھے۔ عام افراد کے لئے تنظیم قائم کرنے افیصلہ کیا۔ اس خیال پر بہت غور و فکر کے بعد اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ قائم کی گئی۔ تقریباً عرصے میں اسی طلبہ تنظیم سے منسلک رہ چکنے والے کچھ افراد نے ایک اور تنظیمی حلقہ اسلامی شمالی امریکہ کے نام سے قائم کی۔

حلقہ اسلامی شمالی امریکہ بنیادی طور پر پاکستان سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل تنظیم تھی[1]۔ جو کہ 19 ستمبر 1968 کو قائم کی گئی۔ البتہ 1977 تک اسلامک سرکل آپ نارتھ امریکہ کے افراد مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے ساتھ مل کر بلکہ اس کے اندر رہتے ہوئے کام کرتے رہے۔ 1977 میں اس کا پہلا سالانہ کنونشن نیو جرسی میں ہوا اور اس موقع پر حلقہ اسلامی کا نیا نام اسلامک سرکل آپ نارتھ امریکہ رکھا گیا۔ نام کی تبدیلی تنظیم کے اس فیصلے کی مظہر تھی

1- اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ اور اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کی دعوتی تنظیموں کے بارے میں معلومات ذکر کردہ ڈاکٹر شاہد زیر طبع کے PhD مقالہ بعنوان ــــــــ سے ماخوذ ہے۔ تنظیم کے پاکستان اور کسی حد تک بھارت اور بنگلہ دیش کے افراد پر مشتمل ہونے کا اندازہ اس کے نیوز لیٹر تحریک، میں شامل مضامین اور خبروں سے بھی لگایا جا سکتا ہے مثلاً اکتوبر ۱۹۷۷ء کے شمارے کو اداریہ میں پاکستان کے انتخابات اور مارشل لاء پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان ہی انتخابات کی مہم کے دوران مولانا مودودی نے پاکستان میں کارکنانِ جماعتِ اسلامی سے جو خطاب کیا تھا وہ اس شمارے میں شائع کیا گیا ہے۔ اس طرح شمارے کے ۲۸ میں سے ۱۱ صفحات براہ راست پاکستان سے متعلق ہیں۔

کہ اب دینی ذہن کے حامل برصغیر سے تعلق رکھنے والے افراد کے باہم میل جول اور دینی کام میں شمولیت ہی اس کا مطمح نظر نہیں ہوگا بلکہ اب زیادہ توجہ امریکہ کی عام آبادی کو دین کی دعوت دینے پر رکھی جائے گی۔ اگلے ہی سال 1978 میں اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ سے متعلق خواتین نے علیحدہ پروگرامات ترتیب دینے بھی شروع کر دیئے۔ اب تک اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کے تمام پروگراموں، اجلاسوں حتیٰ کہ نیوز لیٹر میں بھی اردو زبان ہی استعمال کی جارہی تھی۔[1] 1980-81 میں ابلاغ کی زبان تبدیل کر کے انگریزی کر دی گئی۔ اس کے بعد سے تنظیمی اجلاسوں میں بھی خواہ اس میں تمام افراد پاکستان ہندوستان ہی کے کیوں نہ ہوں گفتگو انگریزی میں کی جانے لگی[2]۔ لیکن تاحال پاکستانی انداز اور اردو زبان تنظیم پر غالب ہے[3]۔ اسی دوران میں اکنا کا شعبہ خواتین (Sister's Wing) قائم ہوا۔

1980-81ء ہی سے ایم ایس اے کے بجائے اکنا کے نام سے دعوتی سرگرمیاں کی جانے لگیں اور نئے کارکن بنانے اور مختلف شہروں میں اس کی شاخیں کھولنے کا کام شروع کیا گیا۔ 1983 میں مرکزی دفتر کے لئے نیویارک میں عمارت حاصل کی گئی۔ 1985 سے مقامی ضرورت کے مطابق لٹریچر تیار کرنے ترجمہ کرنے اور ان کو شائع کرنے کا کام شروع کیا گیا۔ مسلمانوں کا ایک بڑا مسئلہ درپیش تھا کہ اپنے سرمائے کو کسی ایسی جگہ رکھیں کہ وہ محفوظ بھی ہو اور اس سے کچھ منافع بھی آتا رہے۔ ایسی جتنی بھی جگہیں ہوسکتی تھیں وہ سودی کاروبار پر مبنی تھیں اس مستقل پریشانی کے حل کے لئے اکنا 1986 میں مسلم سیونگز اینڈ انویسٹمنٹس قائم کیا جو بلا سودی سرمایہ کاری کی سہولت فراہم کرتا تھا۔ اسی سال تنظیم کی طرف سے ایک دینی و دعوتی رسالہ میسج انٹرنیشنل کے نام سے شروع کیا گیا۔ جس نے جلد ہی ایک معتبر اسلامی رسالت کی طور پر اپنے وجود کو منوالیا۔ 1986 میں ہی تنظیم نے ایک اہم شعبہ سمع و بصر کے نام سے شروع کیا۔ اس کے تحت دعوتی انداز کی دلچسپ آڈیو کیسٹ اور ویڈیو کیسٹ تیار کرنے شروع کئے گئے۔ اور اب یہ آڈیو

1- حلقۂ اسلامی سے اسلامک سرکل اور اردو سے انگریزی کی طرف اس سفر کا اندازہ تنظیم کے نیوز لیٹر سے بھی ہوتا ہے۔ ۱۹۷۸ء تک یہ تمام کا تمام اردو زبان میں ہوتا تھا، ۱۹۷۹ء سے اس کے نصف صفحات انگریزی میں اور نصف اردو زبان میں شائع ہونے شروع ہوئے۔ بعد ازاں جب انگریزی کو اختیار کر لیا گیا تو نیوز لیٹر بھی مکمل انگریزی میں شائع ہونے لگا۔

2- ڈاکٹر عبدالمتین سے ان کے گھر (اسلام آباد) پر انٹرویو۔ ڈاکٹر عبدالمتین MSA اور اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ دونوں کے ابتدائی افراد میں سے ہیں اور دونوں کے سیکرٹری جنرل رہ چکے ہیں۔ آپ کا تعلق سابقہ مشرقی پاکستان سے ہے۔

3- پانچ سالہ ہدف و مرکزی پلاننگ ۲۰۰۶ء، اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ سسٹرز ونگ (سالانہ منصوبہ کے کتابچے کا عنوان ان ہی الفاظ میں ہے اور پورا کتابچہ بھی اردو زبان میں ہے)۔

اور ویڈیو سیڈی اور ڈی وی ڈی بھی تیار کر رہا ہے۔ اس میں خاص طور پر بچوں کی دلچسپی کی چیزیں بڑی تعداد میں تیار کی گئی ہیں اور تاحال نئی سے نئی چیزیں مارکیٹ میں آرہی ہیں۔ بچوں کے کارٹون، کہانیاں، نظمیں اس انداز میں تیار کی جارہی ہیں کہ بچے نہایت ذوق و شوق سے یہ چیزیں دیکھتے اور سنتے ہین اور س سے دینی و اخلاقی تعلیمات بھی حاص کرتے ہیں۔ 1990 میں تنظیم نے نوجوانوں کے لئے ینگ مسلم فیڈریشن آف امیرکہ قائم کی تاکہ نوجوان نسل اپنی دلچسپی اور ضرورت کی سرگرمیاں خود سوچ سکیں اور اپنی اسکیموں کو روبہ عمل لا سکیں۔ 1995 میں اس کا نام تبدیل کرکے ینگ مسلمز کردیا گیا۔

1992-93 میں امریکہ میں نیشنل شوری کونسل تشکیل دی گئی۔ جس میں امریکہ کی چار اہم تنظییں بانی تنظیموں کے طور پر شریک تھیں۔ اس کونسل کا مقصد امریکہ میں مسلمانوں کو درپیش معاشرتی، سیاسی، مذہبی اور فقہی مسائل کا حل تجویز کریں۔ اسلامک سرکل آپ نارتھ امریکہ ان چار بانی تنظیموں میں سے ایک ہے۔

تنظیم کے قواعد و ضوابط دستور 4 ستمبر 1977 سے نافظ تھے[1]۔ 1993 میں نیا دستور مرتب کیا گیا جو یکم جنوری 1994 سے نافذ العمل ہے[2]۔

جماعت اسلامی پاکستان سے مماثلت

اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کی تاریخ اس کے نیوز لیٹر، تحریک یا اس کی سرگرمیوں کے انداز کو دیکھا جائے تو اس میں جماعت اسلامی پاکستان کی مماثلت نظر آتی ہے اس کے چارٹر اینڈ بائی لاز کا تقابلی مطالعہ جماعت اسلامی پاکستان کے دستور کے ساتھ جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ گویا جماعت اسلامی پاکستان کی امریکہ شاخ ہے۔ البتہ دوسرے ملک اور ماحول میں ہونے کی وجہ سے اس نے اپنا نام جماعت اسلامی کی بجائے حلقہ اسلامی رکھ لیا اور بعد میں اس کو انگریزی کے قالب میں ڈھال کر اسلامک سرکل کا نام دے دیا۔

دستور جماعت اسلامی کے حصہ میں نام تاریخ نفاذ عقیدہ عقیدے کی مفصل وضاحت کی گئی ہے اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کے چارٹر اینڈ بائی لاز میں ان امور کو چارٹر کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے[1]۔ اور یہ جماعت اسلامی پاکستان کے مذکورہ بالا حصے کا تقریبا لفظی ترجمہ ہے[2]۔

1- دی چارٹر اینڈ بائی لاز اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ، ص iii-iv۔

2- ایضاً، چارٹر شق نمبر ۲۔

اس کے بعد بائی لاز کا حصہ شروع ہوتا ہے اور وہ بھی اپنی ترتیب، دفعات کی نوعیت، طریقہ کار، ہر چیز میں دستور جماعت اسلامی پاکستان ہی کی نقل ہے، حتی کہ نائب امیر کا عہدہ جس طرح جماعت اسلامی میں موجود ہے لیکن یہ دستوری عہدہ نہیں بلکہ ضرورت کے لحاظ سے ہے اسی طرح اکنا میں بھی وائس پریزیڈنٹ کا تذکرہ بائی لاز میں نہیں ہے البتہ وائس پریزیڈنٹ موجود ہوتے ہیں۔ جماعت اسلامی پاکستان میں ممبر، کارکن اور ارکان کی درجہ بندی ہے البتہ دستوری لحاظ سے جماعت اسلامی میں شامل اس فرد کو سمجھا جاتا جو رکن بن جائے[3]۔ جبکہ اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ میں ممبر اور کارکن کو تو ممبر ہی کہتے ہیں۔ جبکہ جسے رکن کی حیثیت حاصل ہو وہ ممبر آف جنرل اسمبلی کہلاتا ہے۔ اسی لئے ممبر ممبر شپ فارم پر کرتا ہے اور اتفاق و تعاون کا وعدہ کرتا ہے[4]۔ جبکہ ممبر آف جنرل اسمبلی حلف اٹھا کر جنرل اسمبلی کا ممبر بنتا ہے[5]۔

مشن اسٹیٹ منٹ

اکنا کا مشن یہ ہے کہ شمالی امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کو قرآن مجید اور سنت نبوی کی ہدایات کے مطابق اس طرح تعلیم دی جائے، مدد فراہم کی جائے اور ان کی صلاحیتوں کو نشوونما دی جائے کہ وہ نہ صرف خود دنیا اور آخرت کی فلاح حاصل کر سکیں بلکہ بہترین انداز میں دوسرے لوگوں کو بھی اسی بات کی طرف دعوت دے سکیں۔

نصب العین

اکنا کا نصب العین یہ ہے کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے طریقوں کا مطابق اقامت دین کی جدوجہد کے ذریعے سے اللہ تعالی کی رضا حاصل کی جائے۔

1- دی چارٹر اینڈ بائی لاز اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ، چارٹر کی دفعات ۱تا۵۔

2- دستورِ جماعت اسلامی پاکستان، دفعات ۱تا۵۔

3- دستور جماعت اسلامی پاکستان، عہد رکنیت، ایک فرد رکنیت کا عہد کرتے ہوئے کہتا میں " خالصۃ للہ جماعت اسلامی میں داخل ہو رہا ہوں"۔

4- دی چارٹر اینڈ بائی لاز، ضمیمہ نمبر۱، ممبر شپ فارم۔

5- ایضاً، ضمیمہ نمبر ۲، اوتھ آف ممبر جنرل اسمبلی۔

پالیسی بیان

اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ غیر نسلی اور غیر فرقہ وارانہ تنظیم ہے اس میں ہر فرد شامل ہو سکتا ہے۔
کوئی بھی مسلمان مرد یا خواتین جو اکنا کے نصب العین اور پروگرام سے اتفاق کرکھتا ہو اس کا کی ممبر بن سکتا سکتی ہے
اکنا کی قیادت کا انتخاب خفیہ رائے دہی کی بنیاد پر ہوتا ہے اور فیصلے باہم مشورے سے کئے جاتے ہیں۔
اکنا کسی بھی حکومت یا اس کی ایجنسیوں کی رقوم قبول نہیں کرتی۔
اکنا کے مقاصد میں اولین مقصد لوگوں کا تعلق اپنے کالق سے قائم کرنا ہے۔
اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ (اکنا) کے دعوتی اثرات
اکنا کے کاموں میں ترجیح اول دعوت دین کو حاصل ہے۔اس غرض سے تنظیم درج ذیل سرگرمیوں کا انعقاد کرتی ہے۔

افراد سے رابطے

i. لوگوں کا تعلق مسجد سے قائم کرنا۔اس غرض سے ای میل کے ذریعہ سے انفرادی رابطہ رکھنا۔

ii. جیل میں قید افراد سے خط و کتابت کے ذریعے سے رابطہ رکھنا۔

iii. جیلوں کے کتب خانوں کو اسلامی کتب مہیا کرنا۔

iv. دعوتی ہاٹ لائن کی تشہیر کے لئے اتہاری بورڈ آویزاں کرنا۔

پروگرام

۱۔ WhyIslam ایک ٹیلی ویژن چینل قائم کرنے کے ہدف کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی پروگرام تیار کرنے کا منصوبہ ہے۔اب تک ۱۳ ایسے پروگرام تیار کرکے کیبل ٹی وی کے ذریعے پیش کئے جا چکے ہیں۔

۲۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لئے اسلامی کورس۔ یہ کورس اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور پولیس ڈیپارٹمنٹ کے سویلین ملازمین کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔اس کی طلب کو دیکھتے ہوئے اب اسے دیگر مقامی اور وفاقی اداروں کے لئے بھی ترتیب دینے کی تجویز زیر غور ہے۔

۳۔ "Whole-Way" House۔ یہ پروگرام ہنٹس ولی، ٹیکساس میں کامیابی سے جاری ہے۔ اس پروگرام کے ذریعے سے جیل سے رہا ہونے افراد کو معاشرہ کا مفید شہری بننے میں مدد مدد فراہم کی جاتی ہے

۴۔ بے گھر افراد کو کھانا کھلانا۔"WhyIslam" کے رضاکار مستحق افراد کو طے شدہ اوقات میں کھانا فراہم کرتے ہیں۔

۵۔ Out Reach ایک بہت ہی مفید اور متنوع پروگرام Why Islam کا ایک اہم منصوبہ ہے۔
اس میں دعوۃ بوتھ، سڑک پر چلنے والے افراد کو آڈیو کیسٹ اور سی ڈی تقسیم کرنا، انفرادی مکالمے کرنا، وسیع پیمانے پر خطوط ارسال کرنا اور بہت سے اقسام کی سرگرمیاں کی جاتی ہیں۔

۶۔ Why Islam، 877 کی جانب سے

۱: اپنے رضاکاروں کو تربیت فراہم کی جاتی ہے۔

۲: دعوۃ بوتھ قائم کرنے کے لئے مطلوبہ سامان (Kit) فراہم کیا جاتا ہے۔

۳: بل بورڈ ڈیزائن کئے جاتے ہیں۔

۴: سرکاری اسکولوں اور گرجا گھروں میں جا کر کام کرنے کے طریقے سکھائے جاتے ہیں[1]۔

۷: ادارہ علوم اسلامیہ (Institute of Islamic Sciences)

اس کے چار کیمپس مختلف علاقوں میں کام کر رہے ہیں۔ جہاں قرآن، حدیث، سنت، فقہ، اسلامی تاریخ اور اسلامی لٹریچر پر مشتمل ایک سال کا کورس کرایا جاتا ہے۔ اس کورس کی تکمیل کرنے والا پہلا گروپ جون 2003ء میں فارغ ہوا۔ اس وقت چار کیمپسوں میں 200 سے زائد طلبہ زیر تعلیم ہیں۔

شعبہ تربیت کی سرگرمیاں

۱۔ نیبر نیٹ

شعبہ تربیت کے تحت رہائشی حلقوں (Neighbor Net) کی بنیاد پر سرگرمیوں کے حوالے سے ممبران کو رہنمائی دی جاتی ہے۔ ایک نیبر نیٹ میں زیادہ سے زیادہ آٹھ افراد ہوتے ہیں جس میں ہر ہفتہ ایک دفعہ باہم مل کر ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات کو مستحکم کرنا قرآن، حدیث اور اسلامی لٹریچر کے اپنے اپنے مطالعے سے دوسرے ساتھیوں کو آگاہ کرنا اور اپنے رہائشی علاقے میں دعوت دین کی سرگرمیوں پر تبادلہ خیال اور منصوبہ بندی کرنا شامل ہے۔

-1 "An Introduction to ICNA"۔

۲۔ذاتی بہتری

شعبہ تربیت ممبران کی ذاتی صلاحیتوں میں اضافے کے لئے متعدد اقدامات تجویز کرتا ہے اور ان پر عمل درآمد کی گرانی کرتا ہے۔ ان اقدامات میں قرآن وحدیث اور اسلامی لٹریچر کے مطالعہ، نفل عبادات ی تلقین وغیرہ شامل ہے۔ شعبہ کی طرف سے ممبران کو ہر ماہ کا نصاب دیا جاتا ہے جس کا مطالعہ کرنا سب کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مطالعہ پر نظر رکھنا اور اس کی طرف متوجہ کرتے رہنا بھی شعبہ کی ذمہ داری ہے۔ نیوز لیٹر تحریک میں توجہ دلاتے ہوئے کہا گیا:

> شعبہ تربیت حلقہ اسلامی کی طرف سے رفقائے حلقہ کے لئے ماہوار نصاب مطالعہ مرتب کر کے روانہ کیا گیا تھا۔ امید ہے رفقاء نے مئی کا اجتماعی وانفرادی نصاب اب تک مطالعہ کر لیا ہوگا اس کی رپورٹ حلقہ کے اجتماع میں مقامی ناظم کو دی جانی چاہئے۔۔۔ یاددہانی کے لئے ماہ جون کا نصاب مطالعہ ذیل میں دیا جارہا ہے[1]۔

۳۔اسٹڈی سرکل

اس پروگرام میں تمام شرکاء کسی طے موضوع پر قرآن، حدیث اور دینی لٹریچر سے باقاعدہ تیاری کر کے شریک ہوتے ہیں اور اس موضوع پر حاصل مطالعہ اور اپنا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

۴۔کر کے سیکھنا (Learning by Doing)

اس میں دعوتی کام مثلاً دعوۃ فیلڈ وزٹ، اجتماعات کے انتظامات، میٹنگ منعقد کرنا، فنڈ جمع کرنا اور نیوز لیٹر نکالنا وغیرہ کی عملی تربیت دی جاتی ہے۔

۵۔ تعلیمی ورکشاپ

اس پروگرام کے تحت ممبران کو کسی موضوع پر لیکچر خطاب کرنے کی تیار کرنے، علمی مقالہ تحریر کرنے اور علمی مذاکروں کا اہتمام کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کا اہتمام ICNA کنونشن اور تربیتی کیمپ کے مواقع پر کیا جاتا ہے۔

1- تحریک، جمادی الثانی ۱۳۹۸ ہجری بمطابق مئی ۱۹۷۸، ص ۱۷۔

شعبہ خواتین(ICNA SISTERS WING)

اس شعبہ کے تحت درج ذیل یونٹ کام کر رہے ہیں:

۱۔ ذاتی بہتری

۲۔ دعوۃ

۳۔ مطبوعات

۴۔ خارجہ تعلقات

۵۔ نور رسالہ

۶۔ مسلمان بچے

ان یونٹوں کے کاموں کے علاوہ شعبہ کے تحت مرکزی طور پر درج ذیل سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں:

۱۔دعوت بذریعہ قرآن

ایک مسلمان کی کردار سازی میں بنیادی اہمیت قرآنی تاثیر کی ہونی چاہئے۔اسی سوچ کے پیش نظر یہ کام شروع کیا گیاہے۔اس میں تلاوت، تفسیر، عربی قواعد اور لفظی ترجمے کی کلاسیں لگا کر ممبر خواتین کی تربیت کی جاتی ہے۔

۲۔مطالعہ تفسیر

ماہ رمضان میں خواتین ترجمہ و تفسیر قرآن کی کلاسوں کا انعقاد کرتی ہیں۔ان میں ایک ماہ میں پورے قرآن کے ترجمہ و تفسیر کا دورہ مختلف مساجد میں کیا جاتا ہے۔اس وقت ایسا دورہ تفسیر 100 سے زائد مقامات پر ہوتا ہے۔

۳۔آن لائن کلاسیں

تمام دعوتی اور تربیتی کلاسیں آن لائن بذریعہ انٹرنیٹ بھی منعقد ہوتی ہیں۔

۴۔اقراء مہم

ایک ہفتہ پر محیط یہ مہم ہر سال چلائی جاتی ہے اس کا مقصد قرآن کے ساتھ لوگوں کے تعلق میں اضافہ کرنا ہے۔2003ء کی رپورٹ کی مطابق ایک سال میں قرآن کے موضوع پر 10 ہزار کتابچے اور کیسٹ تقسیم کئے گئے[1]۔

-1 اکنا سسٹرز ونگ کی ویب سائٹ کا پتہ یہ ہے: ,http://www.icnasisterswing.com

http://www.icna.org/icna/about_icna/index.php

ینگ مسلم برادرز(YM Brothers)

یہ 1990ء میں قائم کی گئی۔ مختلف علاقے میں نوجوان، نیبرنیٹ کے نام سے سرگرمیاں کرتے ہیں۔ یہ نوجوان اسلامی اصولوں کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ اس طرح نوجوانوں کوان کے ہم عمرافراد ہی کے اندراسلامی ماحول مہیار ہو جاتاہےاوراسلامی تعلیمات کو سمجھنے اوران پر عمل کرنے میں سہولت محسوس کرتے ہیں ان کی سرگرمیوں کی نوعیت مندرجہ ذیل ہوتی ہے۔

۱۔ ہفت ہوار اجلاس اور اسٹڈی سرکل

۲۔ سرگرم ممبران ایک طے شدہ نصاب کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ مختلف موضوعات پر گہری فہم حاصل کر سکیں۔

۳۔ سمر کیمپ اور ونٹر کاانعقاد

۴۔ کھیلوں اور تفریح پر مشتمل سرگرمیاں

۵۔ نوجوانوں سے متعلق اسلامی خطابات

۶۔ تربیتی سیمینار اور تربیت گاہیں

۷۔ نیبرنیٹ کوآرڈینٹروں کا سالانہ اجتماع

۸۔ کانفرنس اور کنونشن (اکنا کے سالانہ کانفرنس کے دوران ہی میں ایک YM برادرز کی کانفرنس بھی منعقد کی جاتی ہیے۔اس کے علاوہ مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کی کانفرنسوں میں بھی شرکت کی جاتی ہے)۔

۹۔ رمضان مہم

۱۰۔ مشاہیر اسلام کے تذکرہ کی مہم۔اس میں ایسے جلیل القدر افراد خصوصاوہ جنھوں نے احیائے اسلام کے لئے نمایاں کام کئے، کو یاد رکھنے کی تقاریب منعقد کی جاتی ہیں۔

۱۱۔ مقابلہ اسلامی معلومات

۱۲۔ مسجد میں شب بیداریاں[1]

1- اس کی ویب سائٹ یہ ہے: http://www.ymsite.com اور http://www.ymonline.org

ینگ مسلم سسٹرز(YM Sisters)

ینگ مسلم برادرز کے مقاصد واہداف کے حامل اس ادارہ میں تقریباً اسی نوعیت کی سرمیاں نوجوان لڑکیوں کے لئے منعقد کی جاتی ہیں[1]۔

4۔اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ

1960ء کے عشرے میں، جب امریکہ نے اسلامی ممالک کے افراد کے لئے ویزا اور سکونتی قوانین نرم کئے، سے پہلے بہت کم لوگ بالخصوص مسلمان امریکہ جاتے تھے جو مسلمان امریکہ جاتے وہ بھی زیادہ تر بہتر معاش کے حصول کی غرض سے جاتے تھے۔ قوانین میں نرمی کے بعد بہت سے نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے امریکہ پہنچے۔ یہ نوجوان مختلف ممالک سے آئے اور امریکہ ان سب کے لئے اجنبی جگہ تھی۔اس وقت نماز کی جگہ اور حلال غذا کا حصول بھی ایک اہم مسئلہ اور دشوار کام تھا۔ مختلف ممالک سے آئے ہوئے مسلمان طالب علم مختلف معاشرتی وثقافتی پس منظر رکھنے کے باوجود بہت سے مشترک امور کے حامل تھے۔یہی چیز ان کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ یکم جنوری 1963ء کو جب MSA کا قیام عمل میں لانے کے لئے اجلاس ہوا جس کی دعوت مختلف علاقائی تنظیموں کو دی گئی تھی تو اس اجلاس میں 10 سے کم مسلمان طلبہ تنظیموں نے تقریباً 20 افراد نے شرکت کی[2]۔

ان نوجوانوں کے پیشِ نظر تین اہم مقاصد تھے:

i. نماز جمعہ کا انتظام

ii. حلال غزا کا انتظام اور

iii. غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینا

امریکہ کی مختلف ریاستوں کی یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم طلبہ یکم جنوری 1963ء کو دو دنوں کے لئے اربانا

1- ۱۹۶۷ء سے اب تک یہ معلومات اکنا کے تعارفی کتابچے "An Intriduction to ICNA" اور اکنا کی ویب سائٹ www.icna.org,Retrieved,،20.02.2007 سے لے گئی ہیں۔ تعارفی کتابچے پر تاریخ اشاعت یا مرتب کا نام درج نہیں ہے البتہ یہ کتابچہ، اکنا کا دستور اور اکنا سے متعلق دیگر لٹریچر راقم کے دوست محترم سعد صدیقی نے، جو اکنا ہیڈ کوارٹر نیویارک میں کام کر رہے ہیں، ۲۹ ستمبر ۲۰۰۴ء کی ڈاک سے براہ راست راقم کو ارسال کیے ہیں۔

2- Bi-Monthly, "Islamic Horizon" – May-June, 2003, pp.18-19

چیمپین کی یونیورسٹی آف الی نوائس کے یونین آفس کے ایک چھوٹے سے کمرہ میں جمع ہوئے۔ انہوں نے ملکی سطح پر مسلمان طلبہ کی ایک تنظیم کے قیام کے امکانات پر غور و فکر کے بعد Muslim Students Association of thw US and Canada (MSA) کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اسی موقع پر سات افراد پر مشتمل دستور ساز کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جون کے اواخر میں تنظیم کا دستور مرتب کر لیا گیا۔ کمیٹی نے یوم محنت (Labour Day) کی چھٹی کے موقع کو استعمال کرتے ہوئے MSA کی انتظامیہ (Executive Committee) کے انتخابات کروائے۔ اسی وقت سے یہ روایت قائم ہے کہ MSA (اور اب ISNA) بھی کا سالانہ کنونشن لیبر ویک اینڈ پر ہوتا ہے۔ مہدی بہادری اس سے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ یہ اگلے سال دوبارہ صدر بنے۔ مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے تاسیسی ارکان نے اپنے اپنے تعلیمی اداروں میں اس کی شاخیں قائم کرنے کی کوشش کیں۔ اس طرح پہلے سال میں چند شاخین قائم ہوئیں اور اس کا سالانہ بکٹ صرف 200 ڈالر کے لگ بھگ تھا۔ اس نوخیز تنظیم کے سامنے اہم اہداف یہ تھے:

۱۔ مسلمان طلبہ کو دینی تعلیمات اور اس کے تقاضوں سے آگاہ کرنا

۲۔ دین پر عمل کے سلسلے میں مسلمان طلبہ کو معاونت فراہم کرنا

۳۔ تنظیم کی زیادہ سے زیادہ شاخیں قائم کرنا

۴۔ تنظیم کے مرکزی ناظم اور شاخوں کے درمیان ی رابطہ، رہنمائی اور تعاون کا نظام قائم کرنا۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے بانی ارا کین، الیاس بایونس (MSA کے چھٹے صدر)[1]، احمد حسین سکر، احمد توتونجی (MSA کے دوسرے صدر)، فاضل عابدی، فیصل مقوی، اسماعیل احمد، سیف السکر، ابراہیم کلیسی، مہدی بہادری، محمد ابو صالح، احمد نوربدی، سید حسین پاشا، طارق سویدان، گلزار حیدر، محمد بن یوسف اور محمد شریف وغیرہ نے دن رترات محنت کی اور طویل سفر کر کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مسلمان طلبہ کو اپنے اپنے مقام پر ایم ایس اے کی شاخیں کھولنے کی ترغیب دی۔ دو سال بعد 1965ء میں MSA کی چالیس کے قریب شاخیں قائم ہو چکی تھیں اور اس کا بجٹ بڑھ کر 20000 ڈالر سالانہ تک پہنچ گیا تھا۔ 1967ء میں اس کی اتنی شاخیں قائم ہو گئی تھیں کہ ایم ایس

1- الیاس بایونس گذشتہ (۱۵اکتوبر ۲۰۰۷ء) کو انتقال کر گئے۔ مرکزی دفتر سے راقم کو بذریعہ ای میل مورخہ ۱۷اکتوبر ۲۰۰۷ء کو اطلاع دی گئی۔

کے East Zone کی علاقائی کانفرنس منعقد کی گئی۔

اس وقت ISNA ایک سرپرست ادارہ کے طور پر کام کر رہی ہے جس کے دیگر شعبے اور تنظیموں کے علاوہ براہ راست ذیلی تنظیمیں یہ ہیں:

۱۔ مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن

۲۔ مسلم کمیونٹیز ایسوسی ایشن (MSA)

۳۔ اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن

۴۔ دی ایسوسی ایشن آف مسلم سائنٹسٹس اینڈ انجینیئرز

۵۔ دی ایسوسی ایشن آف مسلم سوشل سائنٹیسٹس

۶۔ دی کونسل آف اسلامک اسکول ان نارتھ امریکہ (CISNA)

۷۔ مسلم یوتھ آف نارتھ امریکہ (MYNA)

۸۔ اسلامک میڈیا فائونڈیشن (IMF)

۹۔ مسلم امریکن چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری (MACCI)

ISNA کی مجلس شوری کے پہلے ہی اجلاس میں طے کیا گیا ہے کہ MSA کے زیادہ تر کام اب ISNA کے ذمے ہوں گے۔ MSA کالج کے طلبہ میں دعوتی اور دیگر سرگرمیاں جاری رکھے گی۔ یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ MCA کی بنیادی ذمہ داری بچوں کو اسلامی تعلیم فراہم کرنا ہو گی۔ ISNA کا صدر مجلس شوری کا سربراہ ہو گا لیکن دوسرے ممبروں کی طرح اس کا بھی ایک ہی ووٹ ہو گا۔ آئی ایس این اے کی ملس منتظمہ، مجلس شوری کے آگے جواب دہ ہو گی اور مجلس شوری کے طے کردہ فیصلوں پر عمل درآمد کی پابند ہو گی۔ اس طرح آئی ISNA کی تشکیل مکمل ہو گئی۔

MSA ہی سے متعلق کچھ طلبہ جو زیادہ تر پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے تعلق رکھتے تھے اور حلقہ اسلامی کے نام سے اپنی غیر رسمی نشستیں کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک نئی تنظیم کی اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ ICNA کے نام سے رجسٹریشن کرالی۔ یہ اب ایک مستقل تنظیم کے طور پر سرگرم عمل ہے۔ اس وقت امریکہ میں ISNA کے بعد مسلمانوں کی دوسری بڑی تنظیم ICNA ہے۔

ISNA کے پہلے صدر ڈاکٹر الیاس بایونس تھے۔ جو 1983ء اور 1984ء میں صدر رہے۔ دوسرے صدر قطبی المہدی احمد تھے جو 1985ء تا 1987 ء صدر رہے۔ تیسرے صدر ڈاکٹر احمد ذکی حماد تھے۔ جو 1996 تک صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ چوتھے صدر عبداللہ ادریس تھے۔ جو 1992 سے 1996ء صدر رہے۔ چھٹے صدر ڈاکٹر محمد نور عبداللہ بنے جو ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۶ء تک صدر رہے۔ موجودہ ساتویں صدر ڈاکٹر انگرید میٹسن ہیں۔

مقصد(Vision)

شمالی امریکہ کی بے مثل متحدہ اسلامی تنظیم جو مسلمانوں کی بالخصوص اور پورے معاشرے کی بالعموم بہتری کے لئے سرگرم عمل ہے۔

مشن

ISNA مسلمان تنظیموں اور افراد پر مشتمل ایک ایسا ادارہ ہے جو اسلام کی دعوت اور تعلیمات پیش کرنے، مسلمان آبادیوں کو مدد فراہم کرنے اور تعلیمی، معاشرتی اور فکری مسائل حل کرنے کے لئے ایک پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔ یہ دوسری مذہبی برادریوں، شہری تنظیموں اور خدمتی اداروں کے ساتھ اچھے تعلاقت کی استواری کے لئے کوشاں رہتا ہے۔

شمالی امریکہ میں رہنے والا کوئی بھی بالغ مسلمان جو کہ اسلام کو مکمل نظام حیات کے طور پر اپنانا چاہتا ہو آئی ایس این اے کا رکن بن سکتا ہے۔ اسمیں کسی خاص فقہی مسلک، خاص رنگ نسل یا قومیت یا مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ اس وقت آئی ایس این اے کی صدر ایک سفید فام امریکی خاتون ہے یہ آئی ایس این اے ہی کی نہیں اسلامی تحاریک اور تنظیموں کی تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ ایک عام دینی تنظیم کی سربراہی کی خاتون کے حصے میں آئی ہو۔ انگرید میٹسن صدر بننے سے پہلے آئی ایس این اے کی نائب صدر تھیں۔ ان کو آئی ایس این اے کی پہلی نائب صدر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے [1]۔

1- ۲۰۰۳ء میں اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے قیام کو چالیس سال کی مدت پوری ہوئی (بشمول MSA کا عرصہ) اس موقع پر اسلامک ہورائزن نے مئی جون، جولائی اگست اور ستمبر اکتوبر کے تین شماروں کو اسنا کی تاریخ کے حوالے سے خصوصی نمبروں کے طور پر شائع کیا۔ یہ معلومات ان شماروں اور اسنا کی اپنی ویب سائٹ www.isna.net, Retrieved. 18.04.07 سے حاصل کی گئی ہیں۔

اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (اسنا) کے دعوتی اثرات

اسنا لیڈر شپ ڈویلپمنٹ سینٹر

امریکہ میں آباد مسلمانوں کی دینی و معاشرتی ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت اچھے اور باصلاحیت اماموں اور کمیونٹی لیڈروں کی دستیابی ہے۔ اسنا نے اس ضرورت کی تکمیل کے لئے لیڈر شپ ڈیولپمنٹ سینٹر قائم کیا ہے جو اسلامک سینٹروں، کمیونٹی لیڈروں اور اہل علم افراد کے مشورے اور تعاون سے اس فریضہ کو ادا کر رہا ہے۔

مقاصد

اس سینٹر میں تسلسل کے ساتھ مختلف دورانیوں کے پروگرام جاری رہتے ہیں۔ جن کے مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔ امام اور دینی معلم کے لئے معیاری پیمانے کا تعین اور ان معیارات کے حصول کے نقطہ نظر سے تربیتی پروگرام منعقد کرنا۔

۲۔ ایسے ائمہ کو جو ان معیاروں پر پورا اترتے ہوں سند دینا اور ان کی توثیق کرنا۔

۳۔ ائمہ کمیونٹی لیڈروں کی صلاحیتوں میں اضافے کے لئے مزید تعلیم فراہم کرنا اور انہیں کانفرنسوں، سیمینار، ورکشاپ اور دیگر پروگراموں میں شرکت کے مواقع فراہم کرنا۔

۴۔ ائمہ اور رہنمائوں کی تربیت کے نقطہ نظر سے مواد طبع کرنا۔

۵۔ تربیتی امور میں مدد فراہم کرنے کے لئے معاونات بشمول آڈیو اور ویڈیو، ٹی چارٹ وغیرہ کی تیاری اور تقسیم

۶۔ ایسے مربی تیار کرنا جو ائمہ اور کمیونٹی لیڈروں کی تربیت کر سکیں۔

۷۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے ساتھ مشترکہ پروگرام منعقد کرنا۔

مستفید ہونے والے

۱۔ اس کورس سے درج ذیل اقسام کے افراد استفادہ کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں امر کی افواج، اسپتالوں، جیلوں، اسلامک سنٹروں اور جامعات میں کام کرنے والے امام یا دینی معلمین یا وہ لوگ جو ان جگھوں پر ان حیثیتوں میں کام کرنے کے خواہش مند ہوں۔

۲۔ اسلام سینٹروں کے ڈائریکٹر اور بورڈ کے ممبران، کمیونٹی لیڈر، دعوۃ ورکر اور متحرک مسلمان

۳۔ وہ اساتذہ جو اپنے طلبہ میں قائدانہ صلاحیت پیدا کرنا یا ان میں اضافہ کرنا چاہتے ہوں۔

۴۔ مسلمان تنظیموں، خواہ وہ عام تنظیمیں ہوں یا نوجوانوں کی، کے ذمہ داران یا متوقع ذمہ داران۔

فقہی رہنمائی

اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کی خدمات میں سے ایک خدمت ذاتی، عائلی، معاشرتی، اور مذہبی معاملات میں لوگوں کے استفسارات کا قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دینا ہے۔ ایک مسلمان اپنی زندگی کے ہر پہلو میں یہ دیکھتا ہے کہ اس کا کوئی سوچ یا عمل شریعت کے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ دور جدید کی پیچیدگیوں میں اور غیر مسلم اکثریت کے درمیان رہتے ہوئے یہ معاملہ اور زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اِسنا کی خدمات کا یہ پہلو امریکہ کے مسلمانوں کے لئے ایک مفید سلسلہ ہے۔ یہ سوالات تحریری بھی کئے جاتے ہیں اور انٹرنیٹ اور ای میل کے ذریعے بھی۔

معاشرتی و فلاحی امور

مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کے ناطے مسلمانوں کے معاشرتی معاملات ہوں یا معاشرہ کے عام مسائل ،اس پر تنظیم اپنے موقف اور ان کے حل کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں میں شریک رہتی ہے۔ مغربی معاشروں میں سوشل سیکورٹی اور انشورنس افراد کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آج کل خاص طور پر امریکہ میں ایک سوال یہ زیر بحث ہے اور اسے ایک انسانی مسئلہ کے طور پر بطور مہم اٹھایا جارہا ہے۔ کہ وہ افراد خاص طور پر بچے جن کی انشورنس نہیں ہوئی ہے ان کا کیا قصور ہے کہ وہ بہت سے مراعات سے محروم رہ جائیں۔ اس سلسلے میں مذہبی تنظیموں کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم Interfaith community in support of uninsured children قائم کی گئی ہے۔ اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ اس کی ممبر ہے۔ 25 جولائی 2007ء کو اس کے تحت ایک پریس کانفرنس کی گئی جس میں ISNA کی نمائندگی سید محمد سعید نے کی[1]۔

اِسنا کی فلاحی خدمات کا دائرہ امریکہ کے باہر تک پھیلا ہوا ہے۔ بڑی آفات کے مواقع پر خاص طور پر تنظیم متحرک ہو کر دنیا کے کسی بھی خطے کے افراد کی امداد کے لئے لوگوں کو متوجہ کرتی ہے اور فنڈ وغیرہ جمع کر کے متعلقہ لوگوں تک پہنچاتی ہے۔ مثلاً سونامی ریلیگ، قطرینا ریلیف اور ارتھ کوئیک ریلیف وغیرہ کے نام سے اسلامک ہورائزن اور ویب سائٹ کے ذریعے کے ذریعے افراد اپیل کر کے رقم جمع کی اور پہنچائی جاتی رہی ہے البتہ اکنا ریلیف یا اسلامک ریلیف کی

1- سید محمد سعید MSA کے ابتدائی لوگوں میں سے ہیں جب MSA نے ISNA کی شکل اختیار کی تو سید محمد سعید اس کے بھی بنیادی افراد میں شامل تھے۔

طرح مختلف جگہوں پر پہنچ کر اپنے افراد یا نیٹ ورک کے ذریعے سے رقم کے علاوہ امدادی کاموں میں شریک ہونے کا پروگرام ان کے منصوبے شامل نہیں ہے۔

ڈومیسٹک وائلنس فورم کے نام سے ایک ادارہ اسنا کے تحت کام کر رہا ہے۔ اس کی تفصیل بھی اسنا کی ویب سائٹ کے ذریعے سے دستیاب ہے۔ یہ گھریلو تشدد کی روک تھام کے لئے کام کرنے والا ادارہ ہے۔ گھر کے اندر ہونے والے تشدد سے بالعموم یہ مراد لی جاتی ہے کہ شوہر بیوی پر تشدد کرتا ہے۔ مغربی طرز بود و باش کے لحاظ سے کسی دوسرے فرد کو کسی کام سے منع کرنا بھی اس کی شخصی آزادی میں مداخلت ہے اس لئے وہاں تشدد کا مطلب محض مار پیٹ نہیں بلکہ روک ٹوک ہے۔ اسنا کی ویب سائٹ پر موجود مضمون Ending Domestic Violence in Muslim Families میں دیے گئے اعداد و شمار کے مطابق 37 فیصد امریکی خاتون گھریلو تشدد کا شکار ہیں جن میں سے 7 فیصد کو مار پیٹا بھی جاتا ہے[1]۔

گھریلو تشدد کی ایک اور قسم ہے جس کا ذکر کم کیا جاتا ہے لیکن مغربی معاشرہ میں وہ بھی جرم ہے۔ وہ بچوں پر تشدد ہے۔ جسے ڈومیسٹک وائلنس کے بجائے چائلڈ ابیوز کے الگ زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔

اِسنا کی فلاحی خدمات کے ذیل میں ایک شعبہ Aging and Counselling ضعیف العمری اور مشاورت بھی ہے البتہ اگر اسنا کی ویب سائٹ پر موجود اس کی تفصیل میں جائیں تو وہاں اس کے ضمن میں تجہیز و تکفین کے مسائل ہی بیان کئے گئے ہیں۔

رشتے ناتے زندگی کے اہم معاملات میں سے ہیں۔ لہذا اِسنا کے پروگرام میں یہ کام شروع سے شامل رہا ہے بلکہ اِسنا کے قیاسم سے پہلے بھی ایم ایس اے نے اس مسئلے کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامک ہورائزن میں اس سلسلے میں معلومات کے تبادلے کی خدمات انجام دیں۔ اس خدمت کا آغاز مئی 1976 سے کیا گیا[2]۔ اس وقت سے اب تک یہ سلسلہ اسلامک ہورائزن کے صفحات کی مدد سے جاری ہے۔ مئی 1976 کے رسالے میں تین رشتوں کا ذکر ہے جن کی شادی مطلوب تھی۔ انہیں M2, M1 اور M3 نمبر دیئے گئے ہیں۔ اب اس کی مزید منظم کر دیا گیا ہے اور اس کے اشتہار کی باقاعدہ فیس مقرر کر دی گئی ہے۔ ویب سائٹ آنے کے بعد سے اب یہ خدمات ویب سائٹ کے ذریعے سے

1- www.isna.net, Retrieved, 18-04-2007 پر موجود شریفہ الخطیب کا مذکورہ بالا مضمون۔

2- اسلامک ہورائزن، جلد ۵، شمارہ ۵، مئی ۱۹۷۶ء۔

بھی پیش کی جاتی ہے۔

ان کے علاوہ بھی اِسنا کی کئی مستقل اور کئی حسب موقع وضرورت خدمات ہیں، اِسنا کی ذیلی تنظیموں کی اپنی اپنی فلاحی سرگرمیاں ان کے علاوہ ہیں۔

دوماہی اسلامک ہورائزن

اسلامک ہورائزن اِسنا کا ترجمان رسالہ ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے کہ اسنا دراصل مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس لئے اس کے افراد، اس کا کنونشن اور اس کا رسالہ بھی اسنا کے افراد، کنونشن اور رسالے میں تبدیل ہوگئے۔ پہلے یہ MSA کے نیوز لیٹر کے طور پر شائع ہونا شروع ہوا۔ اس وقت یہ آٹھ صفحات پر مشتمل یک رنگا رسالہ تھا۔ اس کا پہلا شمارہ 1976 میں شائع کیا گیا۔ ابتداء میں اس پر ادارتی عملے وغیرہ کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔ اکتوبر 1976 سے اسکا تذکرہ ہونے لگا اس وقت کے ایڈیٹر کوکب صدیقی اور ایسوسی ایٹ ایڈیٹر سید زین العابدین اور حسین پاشا تھے۔ پھر اپریل 1977 سے تین رکنی ایڈیٹوریل بورڈ نے یہ کام سنبھال لیا۔ یہ بورڈ انور بیگ، محمود رشدان اور انیس احمد پر مشتمل تھا۔ بعد میں یہ ایم ایس اے کی بجائے اِسنا کا نیوز لیٹر بن گیا اور پھر ترقی کرتے کرتے اب یہ 64 صفحات پر مشتمل ایک مجلے کی شکل اختیار کر چکا ہے جو آرٹ پیپر پر مکمل چار رنگا رسالہ ہے۔ البتہ اب یہ ماہانہ کے بجائے دوماہی رسالے کے طور پر نکل رہا ہے۔ یہہ تنظیم کے نیوز لیٹر کی ضرورت بھی پوری کر رہا ہے اور اس میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے مضامین خبریں اور تبصرے بھی شائع ہوتے ہیں۔ ایم ایس اے کے نیوز لیٹر کی جگہ اِسنا کے مجلے کی شکل میں تبدیل ہونے پر اس کا جلد نمبر اور شمارہ نمبر نہیں تبدیل ہوا بلکہ پچھلے نمبروں کی تسلسل ہی میں ہے[1]۔

سالانہ کنونشن

تنظیموں کے سالانہ کنونشن ان کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس میں تنظیم سے وابستہ افراد، تنظیم کے ہم خیال لوگ، اس کے شعبہ جات، مرکزی ذمہ داران اور برادر تنظیمیں سب ایک جگہ جمع بھی ہوتے ہیں ان کی کارکردگی بھی معلوم ہوتی ہے اور آئندہ کے منصوبوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ اسی سے تنظیم کے افرادی قوت اور استعداد کار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

1- مثلاً نومبر دسمبر ۲۰۰۴ء کا جلد نمبر ۳۳ (۱۹۷۲ء سے ۲۰۰۴ء)۔

5۔الرسالہ: دعوتی تحریک

5.1۔ مولانا وحید الدین خان کے احوال اور دعوتی فکر و خدمات

مولانا وحید الدین خان یکم جنوری 1925ء میں اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک دور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوئے۔ جب ان کی عمر چار سال تھی تو والد انتقال کر گئے، ان کی پیدائش چونکہ ایک گاؤں میں ہوئی تھی اس لئے شخصیت اور نظریہ میں بھی وہی فطری رنگ نظر آتا ہے جو ایک گاؤں کی زندگی میں ہوتا ہے جس کا اظہار وہ خود ان الفاظ میں کرتے ہیں:

میری ابتدائی زندگی اس دور افتادہ گاؤں میں گزری، یہاں تمدن جیسی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ میرے گاؤں کے پاس ایک ندی بہتی تھی جو گویا یہ خاموش پیغام دے رہی تھی کہ زندگی ایک مسلسل حرکت کا نام ہے نہ کہ جمود کا۔ دن کے وقت سورج کی حیات بخش روشنی اور رات کو ستاروں کی مسحور کن جگمگاہٹ، کائنات کی معنویت کا تعارف کراتی تھی، گاؤں کے چاروں طرف دور تک پھیلے ہوئے باغ اور کھیت کی ہریالی بتاتی تھی کہ زندگی ایک نمو پذیر حقیقت کا نام ہے۔تازہ ہوا کے جھونکے اور چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں، سمع و بصر اور فواد، کے لئے مسلسل طور پر روحانی غذا کا ذریعہ بنی تھی۔ یہ گویا فطرت کی تعلیم تھی، اس تعلیم گاہ کے اندر میری شخصیت بنی، میرا ذوق ہر اعتبار سے فطری ذوق بن گیا۔ میری سوچ اپنے آپ وہ سوچ بن گئی جس کو آفاقیت اور حقیقت پسندی کہا جاتا ہے۔ ابتدائی دور میں میرا یہ، صحرائی تجربہ، ہر قسم کے منفی تصورات سے خالی تھی، غالباً یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف کی چلائی "الرسالہ تحریک" دور جدید کی وہ اسلامی تحریک تھی جو کسی رد عمل کے تحت شروع نہیں ہوئی بلکہ وہ مکمل طور پر مثبت ذہن کے تحت شروع ہوئی۔1

ابتدائی تعلیم

ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں کے ایک مدرسہ میں حاصل کی۔ اس مکتب میں ایک ہی استاذ تھے جن کا نام مولانا فیض الرحمن اصلاحی (وفات 1972ء) تھا۔ اگرچہ اس وقت مولانا کے خاندان میں انگریزی زبان کو اہمیت دی جاتی تھی جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے چچازاد بھائی اقبال احمد سہیل (وفات 1955ء)

1۔ ماہنامہ تذکیر، ج۱۹، ص ۳۔۲، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۶ء

نے علی گڑھ کالج کے اولین بیچ میں ایم ۔اے انگلش کی ڈگری حاصل کی۔ مگر مولانا نے انگریزی کی بجائے اپنی ابتدائی تعلیم مدرسے میں قرآن اور اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی زبان بھی سیکھی۔ مولانا چونکہ بچپن سے ہی باپ کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔اس لئے ان کی کفالت ان کے چچا صوفی عبدالمجید خان (وفات 1947ء) نے کی۔ انہی کے اصرار پر 1938ء میں انہیں عربی کی مشہور درس گاہ مدرسہ الاصلاح (سرائے میر) میں مبتدی طالب علم کی حیثیت سے داخل کرادیا گیا۔ یہاں آکر مولانا کی زندگی کے رخ کو جس واقعے نے متعین کیا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے، زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے وہ یہ ہے۔غالباً1940ء کا واقعہ ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی (وفات 1998ء) اس وقت مدرستہ الاصلاح کے صدر مدرس تھے۔ایک دن کلاس میں قرآن کی یہ آیت زیر بحث آئی۔اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَت 1 آیت کی تفسیر کرتے ہوئے انہوں نے طلبا سے ایک سوال کیا۔انہوں نے پوچھا کہ اونٹ کے سم پھٹے ہوئے ہوتے ہیں یا جڑے ہوئے کلاس میں اس وقت بیس سے زیادہ طالب علم تھے مگر کوئی بھی یقین کے ساتھ اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔اس کے بعد انہوں نے ایک تقریر کی انہوں نے عربی مقولہ لاادری نصف العلم (میں نہیں جانتا، کہنا، آدھا علم ہے) کا فلسفہ بیان کیا۔انہوں نے کہا کہ اپنے نہ جاننے کو جاننا، تعلیمی سفر کی پہلی منزل ہے۔ آدمی اگر اپنی لاعلمی سے بے خبر ہو تو اس کے اندر جاننے کا شوق پیدا نہیں ہوگا، وہ بدستور بے خبر پڑا رہے گا۔انہوں نے طلبا سے کہا کہ آپ لوگ اونٹ کے سم کے بارے میں اپنے ''لاادری'' سے بے خبر تھے، اگر آپ کو اس معاملے میں اپنے لاادری کو جانتے تو اونٹ دیکھ کر آپ اس کو معلوم کر لیتے۔ لیکن اپنے لاادری کو نہ جاننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بار بار اونٹ دیکھنے کے باوجود آپ اونٹ کے سم کے بارے میں بے خبر رہے۔میری ابتدائی زندگی کا یہ واقعہ گویا میرے تفکیری سفر کیلئے ایک رجحان ساز (trend setter) واقعہ بن گیا۔یوں مولانا صاحب نے اپنی تعلیم مدرستہ الاصلاح سے مکمل کی اور مدرستہ الاصلاح کا ایک خاص پس منظر اور خاص فکر ہے۔ جو مولانا صاحب پر بالواسطہ اور بلاواسطہ اثر انداز ہوا۔2

دعوتی سفر

1950ء میں پچیس سال کی عمر میں۔ من انصاری الی اللہ۔ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، پھر اسی مقصد کیلئے

1۔ سورۃ الغاشیہ ۸۸:۱۷

2۔ ماہنامہ تذکیر، ج۱۹، ص ۳۔۲، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۶ء

ادارہ اشاعت اسلام کے نام سے اپنے دعوتی سفر کو جاری رکھا۔ مولانا صاحب سب سے پہلے جس تحریک سے متاثر ہوئے وہ جماعت اسلامی تھی۔ یہاں مولانا کی زندگی کا ایک الگ ہی رنگ تھا۔ بالکل سادہ منش آدمی کے طور پر اپنی اس زندگی کا آغاز کیا۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے جماعت اسلامی کے ایام کا تذکرہ پروفیسر عدنان ہاشمی نے کچھ یوں کیا ہے۔[1]

یادش بخیر: یہ وہ دور ہے جب خان صاحب جماعت اسلامی ہند کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے شعبہ نشر اشاعت کے انچارج ہیں۔ سادگی کے پیکر، صوفی منش، اقامت دین کی عظیم ذمہ داریوں کا احساس اس قدر غالب ہے کہ تن بدن کا ہوش نہیں۔ پیروں لکڑی کے تلے اور بڑ کی پٹی والی قدیم طرز کی کھٹپٹی، لباس معمولی، بال بکھرے ہوئے، ہر وقت ایک ہی دھن کہ دین حق کو بھولا ہوا، اس سے دور، اس کے عظیم برکتوں اور نعمتوں سے محروم آج کا انسانی معاشرہ، راہ حق کے مختصر سے قافلہ کی محنت، لگن ایثار و قربانی سے اگر راہ مستقیم پر آجائے اور اللہ کا دین مغلوبی و محکومی کی پستی سے نکل کر فرد، معاشرہ اور نظام کے اندر جاری و ساری، اس پر نافذ اور غالب ہو جائے تو یہ اس قافلے کی بھی خوش بختی و سعادت قرار پائے اور ملک و وطن کے انسان بھی اس دین کے فیوض و برکات سے بہرہ ور ہوں۔ یہ تھا اقامت دین کا اعلیٰ وارفع تصور جو جماعت کے تمام متوسلین، ارکان، کارکنان اور ذمہ داران کی طرح خان صاحب کو بھی بے چین کئے رکھتا تھا۔ لیکن یہ امتیازی کیفیت صرف خان صاحب کی ہی تھی جو اپنے نصب العین کے حصول کی فکر میں اس طرح جذب ہو کر رہ گئے تھے کہ بقول ڈاکٹر عبد الباری شبنم سبحانی خان صاحب کی اس مجذوبیت اور دھن کی کیفیت دیکھ کر آدمی ان کا عقیدت مند ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا مرکزی دفتر کا کوئی کارکن شیروانی پہن کر، سارے بٹن سلیقے سے بند کر کے آتا تو محبت بھری ڈانٹ پڑتی کہ اس طرح نستعلیق، ہو کر آپ اقامت دین کا فریضہ انجام دیں گے؟ کسی کے پیروں میں اچھے یا نئے جوتوں کا جوڑا دیکھتے تو ناراض ہوتے کہ اس رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ اقامت دین کی جدوجہد کیا خاک کریں گے۔ کسی کارکن نے برسات میں چھتری خرید لی تو ناراض ہو کر نصیحت کی کہ دیکھو میاں! ضروریات ربڑ کی طرح ہوتی ہیں انہیں جتنا ہی کھینچو گے، بڑھتی جائیں گی۔ لہذا انہیں کھینچ کھینچ کر بڑھاؤ مت، بڑھتی ہوئی ضروریات کا اسیر شخص اقامت دین

1۔ ماہنامہ تذکیر، ج ۱۹، ص ۳-۲، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۶ء

جیسا پتہ ماری کا کام نہیں کر سکتا۔ سادگی، قناعت توکل علی اللہ اور حصول مقصد کیلئے ایثار و قربانی کی انتہا تھی۔1

جماعت اسلامی سے علیحدگی

جماعت اسلامی کے سیاسی عزائم کی وجہ سے مولانا مودودی سے فکری اختلافات پیدا ہوئے جس کی بنا پر جماعت اسلامی چھوڑ کر تبلیغی جماعت سے وابستہ ہوگئے۔ مگر بہت جلد انہیں اندازہ ہوگیا کہ تبلیغی جماعت جو اپنے آپ کو خدا کے پیغام کو پھیلانے والی جماعت کہلواتی ہے، اصل میں اپنی الگ سی ایک شریعت رکھتی ہے۔ جس کا نام 'فضائل اعمال' ہے۔ اسلام تو قرآن و سنت کی پیروی کی تعلیم دیتا ہے جب کہ تبلیغی جماعت فضائل اعمال اور سنت کی پیروی کا حکم دیتی ہے سنت بھی صرف ان کے اپنے بزرگوں کی۔ یہاں آکر انہیں احساس ہوا کہ تبلیغی جماعت میں اختلاف رائے یا اپنی عقل کو استعمال کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں بات وہی چلے گی جو بزرگوں نے کہہ دی ہوگی۔ قرآن کو اس لئے نہیں پڑھا جاسکتا کیونکہ اس کو پڑھنے کے لئے پہلے انسان کو اس کے پڑھنے کا اہل ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اگر اہل ثابت کر بھی لے تو صرف اتنا ہی پڑھنے کی اجازت ہے جتنا اس کو آگے پھیلا سکے۔ کیوں کہ پڑھنے کے بعد لازمی ہے کہ پڑھنے والا اس کو دوسروں تک پہنچائے گویا قرآن صرف پڑھ کر آگے پھیلانے کی چیز ہے خود اس پر غور وفکر نہیں کیا جاسکتا۔ ان اختلافات کی وجہ سے مولانا نے تبلیغی جماعت کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ اس کے بعد مولانا صاحب ندوۃ العلماء (لکھنو) کے ساتھ وابستہ ہوگئے، مگر یہاں خدا پرستی کی بجائے شخصیت پرستی عام تھی اور مولانا صاحب شخصیت پرستی کے خلاف تھے اس لئے اس کو بھی چھوڑ کر جمعیت علماء ہند میں چلے گئے مگر یہاں بھی ان کے ساتھ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا معاملہ ہوا۔ کیونکہ شخصیت پرستی سیاست کو جنم لیتی ہے اور جمعیت علماء ہند تو تھی ہی سیاسی جماعت بھلا یہاں مولانا صاحب کا دل کیسے لگ سکتا تھا۔ لہذا اسے بھی داغ مفارقت دیکر 1976ء میں ماہنامہ 'الرسالہ' جاری کیا جو کہ صرف رسالہ نہ تھا بلکہ ایک مشن تھا۔ اس ساری جد وجہد کو مولانا ماہنامہ 'تذکیر' میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"میرے ذہن میں اول روز سے یہ تھا کہ مجھے اپنی کوئی علیحدہ جماعت بنانا نہیں ہے بلکہ موجودہ جماعتوں اور اداروں سے مل کر کام کرنا ہے۔ اس سلسلے میں اکثر بڑی جماعتوں اور اداروں کے ساتھ تنظیمی طور پر وابستہ ہوا۔ مگر تجربے کے بعد

1۔ ڈاکٹر محسن عثمانی، مولانا وحید الدین خان علماء اور دانشوروں کی نظر میں، ص ۱۰۵

معلوم ہوا کہ ہر جماعت اور ہر ادارہ، گروہی عصبیت کا شکار ہے۔ میرے جیسا آدمی کسی بھی ادارے یا جماعت کے ساتھ زیادہ فعال انداز میں کام نہیں کر سکتا۔"

مثلاً میں اس معاملے میں جماعت اسلامی ہند سے وابستہ ہوا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ جماعت اسلامی کی فکر کا سرچشمہ حقیقتاً قرآن وسنت نہیں ہے بلکہ وہ قرآن وسنت کی ایک منحرف سیاسی تعبیر ہے۔ چنانچہ میں زیادہ دیر تک جماعت اسلامی کے ساتھ نہ چل سکا۔ اسی طرح کچھ عرصے کیلئے میری وابستگی تبلیغی جماعت سے ہوئی، مگر اس سے قریب ہو کر معلوم ہوا کہ تبلیغی جماعت بھی اصلاً قرآن وسنت پر نہیں کھڑی ہوئی ہے۔ بلکہ وہ اپنی، جماعتی انجیل، پر کھڑی ہوئی ہے، جس کا نام، فضائل اعمال، ہے۔ اسی طرح میں چند سال کیلئے ندوۃ العلماء (لکھنو) سے وابستہ رہا، مگر میں نے پایا کہ یہاں کے ماحول میں خدا پرستی سے زیادہ شخصیت پرستی کا غلبہ ہے۔ یہ بلاشبہ ایک مبتدعانہ مزاج تھا۔ میں اس مزاج کے ساتھ مصالحت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس سے بھی میرا تعلق ٹوٹ گیا۔ یہی معاملہ جمعیت علماء ہند کے ساتھ پیش آیا۔ اس کے ساتھ میں چند سال تک وابستہ رہا مگر آخر کار معلوم ہوا کہ جمعیت علماء ہند کا سارا زور ملی سیاست پر ہے اور ملی سیاست میرے دعوتی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ان تجربات کے بعد آخر کار میں نے 1976ء میں ماہانہ ،الرسالہ، جاری کیا۔ الرسالہ اپنی ابتدا ہی سے صرف ایک ماہنامہ نہیں تھا بلکہ مشن تھا۔ الرسالہ کا مقصد اسلام کو مسلمانوں کی قومی سیاست سے الگ ہو کر خالص دعوتی حیثیت سے زندہ کرنا تھا۔ خدا کی توفیق سے الرسالہ اسی نہج پر قائم ہے۔ کوئی بھی شخص الرسالہ کے شماروں کا مطالعہ کر کے اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔[1]

علمی زندگی

ان کی علمی زندگی، عملی یا دعوتی زندگی سے مختلف نہیں ہے کیونکہ جو ان کی دعوتی زندگی ہے وہی ان کی علمی زندگی ہے۔ مولانا صاحب کی علمی زندگی دو ادوار میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

(1) 1976ء سے پہلے کا زمانہ (2) 1976ء سے بعد کا زمانہ

1976ء سے پہلے کا زمانہ

عربی زبان تو مولانا نے بچپن ہی سے پڑھنا شروع کر دی تھی اور بعد میں مدرستہ الاصلاح میں پڑھنے کی وجہ سے ان کے اندر جو مذہبی رجحان تھا اس کو اور تقویت ملی، ان کے پہلے مضمون، قرآن کا مطلوب انسان، جماعت اسلامی کے سہ

1۔ ماہنامہ تذکیر، ج۱۹، ص ۳۔ ۲، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۶ء

روزہ اخبار، دعوت، کے شمارہ میں 1955ء میں چھپا۔ 1955ء کے بعد سے ان کے مضامین بہت سے اردو اخباروں اور رسالوں میں چھپنے شروع ہوئے۔ ان میں زیادہ مشہور نگار، شاعر، پیام تعلیم، عصمت، ندائے ملت، الفرقان، دعوت اور زندگی وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ سہ روزہ، الجمعیۃ، میں ایڈیٹر کی حیثیت سے 1967ء سے 1974ء تک کام بھی کرتے رہے۔

اس دور میں مولانا صاحب کیلئے کوئی خاص راہ متعین نہ تھی جہاں کہیں بھی دین کا کوئی کام ہوتا دیکھتے اس کا ساتھ دینے کی کوشش کرتے۔ اسی سلسلے میں مولانا نے مختلف مذہبی و سیاسی جماعتوں کے ساتھ ملکر کام کیا اور اسی دور میں ہی مولانا نے انگزیری زبان سیکھی اور مغربی مفکرین کا مطالبہ کیا۔ 1963ء میں مولانا نے دوبارہ نئے سرے سے دین کا مطالعہ از سر نو کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسلام کی اساسات کو جاننے کے لئے اس کے اصل مصادر و مراجع کی طرف رخ کیا۔ ان دنوں مولانا صاحب کے تین ہی شوق تھے پہلا انگریزی سیکھنا، دوسرا مغربی مفکرین کے نظریات کا مطالعہ کرنا اور تیسرا اور آخری دین کو نئے سرے سے اس کے اصل ماخذ کے ساتھ پڑھنے میں مشغول رہنا، ان تینوں میں مولانا میں جنون کی کیفیت پائی جاتی تھی جس کا ذکر مختلف جگہوں پر وہ خود کرتے ہیں مثلاً انگریزی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

انگریزی سیکھنے کا شوق

میں اعظم گڑھ میں اپنے بڑے بھائی عبدالعزیز خان کے ساتھ مقیم تھا۔ عجیب بات ہے کہ کوئی بھی شخص مجھے حوصلہ افزائی کرنے والا نہیں ملا۔ میرے بڑے بھائی نے جب یہ دیکھا کہ میں انگریزی زبان سیکھنے کی کوشش کررہا ہوں تو انہوں نے کہا۔ بڈھا طوطا کیا پڑھے گا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں باقی منزل (اعظم گڑھ) میں انگریزی اخبار ہندوستان ٹائمز کھول کر اسے دیکھ رہا تھا کہ مولانا شہباز اصلاحی وہاں آگئے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ۔ کچھ سمجھ بھی ہے یا یوں ہی انگریزی اخبار لیکر بیٹھے ہوئے ہو، اس زمانے میں میرا یہ حال تھا کہ ہر وقت میں انگریزی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ میری اس عادت پر میری ماں غصہ ہوتی تھیں اور کہتی تھیں کہ تم کسی نہ کسی دن سڑک پر کسی گاڑی سے ٹکرا جاؤ گے۔[1]

انگریزی کے بعد مغربی مفکرین کو پڑھنے کا شوق چڑھا تو گھنٹوں مہتاب لائبریری میں بیٹھ کر جدید دور کے مغربی سکالرز کی کتابیں پڑھنے بیٹھ گئے۔ یہاں مختلف سکالرز کی کتابیں روزانہ گھنٹوں بیٹھ کر پڑھتے۔ مغربی سکالرز کو

1۔ ماہنامہ تذکیر، ج ۱۹، ص ۳-۲، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۶ء

پڑھنے کے بعد عام آدمی لازمی طور پر ان سے متاثر ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی فلسفیانہ باتیں عام آدمی کے مسائل کا سطحی حل بتاتی ہیں اور جہاں انسان کو اس کے مسائل کا حل ملے پھر اسی کے گیت گاتا ہے اور دین چونکہ انسان کی آزمائش چاہتا ہے اور آزمائش ہمیشہ مشکل ہی ہوتی ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی دین سے دور ہوتا جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ خود کو کلی طور پر مار دیتا ہے یا جزوی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آرام کرنے کے لئے بھیج دیتا ہے۔ مگر مولانا کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ وہ جوں جوں ان کا مطالعہ کرتے گئے توں توں ان کا ایمان اللہ پر مضبوط ہوتا گیا۔ وسعت مطالعہ نے ان کے ذہن کے سوتے کھول دیئے تاکہ دین ذہن کی آبیاری کر سکے۔ مغربی سکالرز کے رد عمل کو مولانا یوں بیان کرتے ہیں۔

یہ 1966ء کی بات ہے میں نے طے کیا کہ میں برٹرینڈ رسل (1970-1972ء) کو پڑھ ڈالوں۔ خوش قسمتی سے میرے قریب شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کی لائبریری میں مجھے رسل کی کتابوں کا پورا سیٹ مل گیا۔ مگر جب میں ان کتابوں کو لے کر گھر پہنچا تو میری بیوی ان کو دیکھ کر بہت متوحش ہوئیں۔ اب آپ ضرور گمراہ ہو جائیں گے، انہوں نے کہا۔ رسل اس دور میں معروف ترین ملحد ہے۔ اس لحاظ سے اس کی تصنیفات کو پڑھنا عام دینی ذوق کے مطابق خطرے سے خالی نہ تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ میں رسل کی دنیا میں داخل ہو کر اس طرح سے نکلا کہ میرا ایمان پہلے سے زیادہ پختہ ہو چکا تھا۔[1]

جدت کا فائدہ

جدیدیت کا نقصان ہونے کی بجائے الٹا مولانا صاحب کو فائدہ ہوا۔ کیونکہ اب وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ اسلامی تعلیمات کو عصری اسلوب میں پیش کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے اندر یہ احساس بھی شدت سے جاگا کہ انہیں دوبارہ دین کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ پھر مولانا نے بڑے زور و شور کے ساتھ اسلام کا مطالعہ از سر نو شروع کیا اور اس شدت سے شروع کیا کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئے۔ اپنی اس کیفیت کا اظہار اپنی کتاب، تعبیر کی غلطی، میں کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ مختلف اخبارات و جرائد میں لکھتے رہے۔ ان میں سے بیشتر مضامین اسلام اور عصر حاضر کے عنوان کے متعلق ہوتے تھے۔ اس کے بعد اس موضوع پر ان کی پہلی مفصل کتاب، علم جدید کا چیلنج، 1966ء میں شائع ہوئی اور اسلام کے مفصل مطالعے کے بعد جو کتاب ان کی طرف سے منظر عام پر آئی وہ 1975ء

1۔ وحید الدین خان، مذہب اور سائنس، ص ۲۳

میں چھپنے والی کتاب،اسلام، تھی۔

2۔1976 کے بعد کا زمانہ

الرسالہ کا اجراء

اکتوبر 1976ء میں ،الرسالہ، کا پہلا پرچہ جاری ہوا۔ یہاں سے مولانا کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا، ایک نئی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ ان کی زندگی جس مقصد کے حصول کیلئے بھٹک رہی تھی اس کو بالآخر الرسالہ کے ساتھ ہی وہ مقصد مل گیا۔ اس رسالے کا نام ڈاکٹر ظفر الاسلام خان (پیدائش 1948ء) نے تجویز کیا۔ شروع میں یہ رسالہ محض ایک ماہنامہ تھا مگر بہت جلد ہی ایک مشن کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کے ذریعے مولانا نے مغربی دنیا تک اسلام کو جدید انداز میں پھیلانا شروع کیا اور یہ کام آج تک جاری و ساری ہے۔ مولانا کا ایک خاص فلسفہ ہے جس کے تحت ان کا ذہن کام کرتا ہے اس میں اہم چیز خدا کا تصور ہے اور انداز آخرت کی دعوت ہے۔ باقی نبوت اور اجتماعیت ایک ثانوی حیثیت سے ان دونوں مقاصد کے حصول کیلئے کام کرتی ہیں اور یہی خاص رنگ ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے یہ بات ان کی تفسیر میں بھی نظر آتی ہے چونکہ ان کی فکر میں اجتماعیت کا تصور نہیں صرف انفرادیت ہی انفرادیت ہے اس لئے ان کی بات مغربی ممالک کو ناگوار نہیں گزرتی اور وہ ان کی بات سن لیتے ہیں۔ اپنے اس نظریے کو مولانا خود اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"میں اپنے تفصیلی مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کی تعلیمات مکمل طور پر خدا اور آخرت کے مرکزی تصور پر مبنی ہیں۔ اسلام میں دعوت دراصل انداز آخرت کی دعوت ہے۔ انسان کے اندر متقیانہ ذہن بنانا اور اس کے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کرنا، یہی اسلام کی دعوت کا اصل نشانہ ہے۔ یہی میرا ذہن آج بھی ہے۔"[1]

اس ،الرسالہ، ہی کی بدولت مغربی دنیا کے اندر مولانا کی فکر پہنچی، پھر ان کے نقطہ نظر کو جاننے کیلئے مختلف ممالک سے دعوت نامے آنے شروع ہو گئے۔ مختلف کانفرنسوں میں انہیں بلایا جانے لگا۔ بلایا تو پہلے بھی جاتا تھا مگر صرف ملکی سطح پر ہونے والی کانفرنسوں میں مگر اس اشاعت کے بعد پوری دنیا میں ان کو پذیرائی ملی جس کا اقرار وہ خود بھی کرتے ہیں۔ 1976ء سے اس سلسلے میں میری زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ اس سال میں نے ایک

1۔ وحیدالدین خان، تعبیر کی غلطی، ص ۱۵

مسلم، کرسچن ڈائیلاگ میں شرکت کی جو لیبیا کی راجدھانی طرابلس میں ہوا تھا۔اس میں اسلام کی طرف سے جامعۃ الازہر (قاہرہ) نے شرکت کی اور ویٹکن (روم) نے مسیحیت کی طرف سے نمائندگی کی۔ان کی دعوت پر میں نے اس میں شرکت کی اور زیر بحث موضوع پر ایک مقالہ (انگریزی زبان میں) پیش کیا میری اس شرکت کی تفصیل ،سفر نامہ، جلد اول میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اس کے بعد عالمی سفروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ملک کے اندر اور ملک کے باہر مسلسل طور پر مختلف مذاہب کی عالمی کانفرنسیں ہوتی رہتی ہیں۔مجھے ان کانفرنسوں میں ہر جگہ بلایا جانے لگا۔اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میرے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ وہ مسلم علما میں معتدل اور سائنٹفک ذہن کے آدمی ہیں اور اسلام کی پر امن تشریح پیش کرتے ہیں۔اس طرح مجھے یہ موقع مل گیا کہ میں ہر جگہ جاکر عالمی اجتماعات میں اسلام کی تعلیمات کو مثبت انداز میں پیش کروں۔یہ اسفار جو تادم تحریر جاری ہیں ان کا مختصر تذکرہ میرے ان سفروں میں دیکھا جاسکتا ہے جو برابر الرسالہ میں چھپتے رہتے ہیں۔

ان سفروں کے تجربات بہت سبق آموز ہیں مثلاً میں نے غیر مسلموں کے ایک اجتماع میں اسلام کا تعارف پیش کیا۔اس میں میں نے کہا کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے اندر انسانی خیر خواہی کا مزاج پیدا کرتا ہے۔وہ اہل ایمان کو انسان دوست بناتا ہے۔آخر میں ایک غیر مسلم نے کھڑے ہو کر کہا آج میں نے اسلام کا سچا تعارف حاصل کیا۔اب میں نے یہ طے کیا کہ آج سے میں نہ صرف انسان فرینڈلی بنوں گا بلکہ اس کے ساتھ میں اسلام فرینڈلی بھی بنوں گا۔1

خدمات

مولانا کی شخصیت اور خدمات علماء اور سکالرز کی نظر میں مختلف فیہ ہیں۔اگر حقیقت نظر سے دیکھا جائے تو جہاں مولانا میں خامیاں ہیں وہاں خوبیاں اس سے کہیں زیادہ ہیں، اگر وہ قرآن کا تذکیری پہلو کیلئے استعمال کرتے ہیں ساتھ ہی ساتھ وہی مسلمانوں کو خدا سے جوڑتے بھی ہیں۔اگر ان کی وجہ سے کسی کی دل آزاری ہوتی ہے تو یہ بہت تھوڑے ہیں مگر جن کے زخموں پر انہوں نے مرہم رکھا ہے اور ان کے دلوں میں مولانا کی محبت ہے تو ان کی تعداد کروڑوں میں نہیں تو لاکھوں میں تو ضرور ہے۔ویسے بھی مشہور ہے کہ انسان ساری عمر برا ہی رہتا ہے مرنے کے بعد ہی اس برے کی رپر "ٹ"

1۔ ماہنامہ تذکیر، ج۱۹، ص ۳۔۲، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۶ء

کا شوشہ ڈلتا ہے۔ مولانا کی علمی اور دعوتی خدمات اسلام کیلئے بے شمار ہیں ان سے کوئی ذی شعور انسان انکار نہیں کر سکتا۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

ا۔ انہوں نے سیاسی مقاصد سے ہٹ کر خالص مذہبی بنیادوں پر کام کیا ہے۔

۲۔ الرسالہ ایک ایسا مشن ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

۳۔ سینٹر فار پیس اینڈ اسپر یچو لٹی جو کہ ہفتہ وار کلاس ہے، انگریزی طبقے سے متاثر نوجوانوں کو اسلام کی تبلیغ کیلئے ایک مرکز ہے۔ قابل ستائش عمل ہے۔

تصانیف

اب تک مولانا صاحب کی دو سو سے زیادہ کتب چھپ چکی ہیں۔ جن کے انگریزی، عربی اور کئی علاقائی زبانوں میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ ان میں چند ایک کا مختصر تعارف پیش کریں گے کیونکہ اگر تمام کتب کا تعارف پیش کیا تو اس کے لئے الگ سے مقالہ لکھنا پڑھے گا۔

1۔تذکیر القرآن

یہ قرآن پاک کی دعوتی انداز میں لکھی گئی تفسیر ہے۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی زبان نہایت آسان اور شیریں ہے اور پڑھنے والے کو مکمل ابلاغ دیتی ہے۔ تمام نحوی، صرفی، فقہی، ادبی اور صوفی انداز سے ہٹ کر لکھی گئی اپنی نوعیت کی واحد تفسیر ہے۔ اس کا مطالعہ ایسے شخص کے لئے موزوں ہے جو آخرت کے حوالے سے خدا کا تصور جاننا چاہتا ہو۔

2۔ماہنامہ الرسالہ

الرسالہ کے نام سے 1976ء سے تاحال ایک ماہ وار شمارہ جاری ہے۔ یہ چالیس پچاس صفحات کا ایک شمارہ ہے جس میں صرف مولانا صاحب کی تحریریں ہوتی ہیں۔ اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ چھپتا ہے اور پاکستان میں یہ ،تذکیر، کے نام سے بالکل اسی ،الرسالہ، کی کاپی ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ تر موضوع قرآن کی کسی آیت کی تشریح، مولانا کے اسفار اور ان کے تجربات پر مشتمل ہوتے ہیں اور عام طور پر مضمون چند صفحات سے زیادہ کا نہیں ہوتا جس کی وجہ سے عام قاری بھی اپنی دلچسپی کھوئے بغیر جہاں سے جی چاہے وہاں سے پڑھنا شروع کر سکتا ہے۔

3۔ علم جدید کا چیلنج

یہ اسلام اور عصر حاضر کے موضوع پر مولانا کی سب سے پہلی کتاب ہے۔اس میں سائنسی ایجادات کے قرآن و عقل کے ذریعے جوابات دیئے گئے ہیں۔ یہ شاید اس موضوع پر اپنی طرز کی پہلی اردو کتاب ہے کیونکہ یہ 1966ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔اس کے بعد انہی سوالات کو لے کر اور لوگوں نے بھی اس موضوع پر کتب لکھی ہیں۔اس کا مطالعہ ایک ایسے شخص کے لئے بہت ضروری ہے جو ہر چیز کو سائنسی انداز میں پرکھنے کا قائل ہو۔

4۔الاسلام

دین کی تعبیر و تشریح کے اعتبار سے مولانا کی سب سے پہلی مفصل کتاب ہے جو 1975ء میں مکمل ہو کر شائع ہوئی۔اس میں مولانا صاحب دین کو جس نظر سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں اس کی مکمل وضاحت موجود ہے۔ جیسے ہر بڑے عالم کے نزدیک اسلام کا ایک تصور ہے اور وہ اسی تصور میں پورے اسلام کو دیکھتا ہے بالکل اسی طرح،الاسلام، مولانا کے تصورات دین کی عکاسی ہے۔جو حضرات مولانا صاحب کے تصورات دین پڑھنا چاہتے ہیں یا ان کے بارے میں تنقید کرنا چاہتے ہیں ان کیلئے اس کتاب کا مطالعہ مفید رہے گا۔

5۔مذہب اور سائنس

مذہب اور سائنس کے موازنے کے بارے میں یہ بہت اچھی کتاب ہے۔اس کتاب میں مولانا صاحب کے تمام سائنسی تصورات کا قرآن سے موازنہ کر کے بتایا گیا ہے کہ سائنس مذہب سے الگ کوئی چیز نہیں۔ بلکہ سائنس تو قرآن کی عملی تصویر ہے۔ وہ تصورات جو قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے دیئے تھے ان کی تصدیق سائنس نے آج کی ہے۔

6۔ تعبیر کی غلطی

اس کتاب میں مولانا صاحب نے ان غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جو ان کی نظر میں دوسرے علماء (خصوصاً مولانا مودودی) سے ہوئیں۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ مولانا صاحب کی فکر کے مطابق ان علماء نے بات کو صحیح نہیں سمجھا اور ان کو چاہیے کہ وہ ان اعتراضات کی روشنی میں اپنے نظریات کا از سر نو جائزہ لیں جیسا کہ مولانا نے خود کیا ہے۔انہوں نے اپنی پہلے کی زندگی اور بعد کی زندگی کا موازنہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کہ انسان غلطیاں کرتا رہتا ہے اگر وہ اپنی اصلاح کر لے تو وہ غلطی، غلطی

نہیں رہتی بلکہ خوبی بن جاتی ہے لیکن اگر غلطی واضح ہو جانے کے بعد بھی اپنی غلطی پر قائم رہے تو یہ اسکا بڑا پن نہیں بلکہ علم کی کمی ہے۔

7۔پیغمبر انقلاب

یہ سیرت النبی ﷺ پر لکھی جانے والی کتاب ہے۔اس کو ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔اس میں زیادہ تر انہوں نے نبی ﷺ کی مکی زندگی کو بیان کیا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ بھی نبی ﷺ کی مکی زندگی کو اپنا شعار بنائیں کیونکہ وہ ابھی تک مکی زندگی کا دور جی رہے ہیں۔اس میں مسلمانوں کو یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مدنی دور کا باسی تصور کرتے ہیں حالانکہ بات اس کے برعکس ہے۔انہیں نبی ﷺ کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے صلح حدیبیہ کو مد نظر رکھنا چاہیے۔

8۔ڈائری

یہ مولانا صاحب کی مختلف سیمینار اور مختلف ممالک کے اسفار پر مشتمل کتاب ہے۔یہ قسط وار ہر سال چھپ رہی ہے۔اس میں بیرون ملک پیش آنے والی کانفرنسوں کے حالات اور لوگوں کے رویوں کا ذکر ملتا ہے۔اصل میں یہ مولانا صاحب کی ذاتی ڈائری ہے جو ایک کتاب کی شکل میں ہر سال چھپتی ہے۔

9۔راز حیات

اس کتاب میں مختلف حلقہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ترقی کے اسباب قصوں کی شکل میں تحریر کئے گئے ہیں اور اس کے بعد ان کی مثال کو سامنے رکھ کر قاری کو تلقین کی جاتی ہے کہ اگر وہ کامیاب زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ ان واقعات سے سبق حاصل کرے اور بندہ مومن وہی ہوتا ہے جو دوسروں کو بھی جینے دے اور خود بھی امن سے جئے۔یہ زندگی سے مایوس یا ایسے افراد جن کے سامنے زندگی کا کوئی رخ متعین نہیں ان کیلئے ایک بہترین کتاب ہے۔

10۔مطالعہ حدیث

یہ کتاب حدیث رسول ﷺ کے متعلق مولانا کا جو نقطہ نظر ہے اس کی جامع عکاسی کرتی ہے۔اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ حدیث دین کے سمجھنے اور زندگی کے شرعی مسائل کے حل کیلئے کس طرح معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی مولانا کی بہت سی کتب چھپ چکی ہیں جن کی تعداد جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ دو سو سے زیادہ ہے۔

11۔الرسالہ کی تحریک

الرسالہ نامی ایک ماہ نامہ جو اردو اور انگریزی زبان میں شائع کیا جاتا ہے۔الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے،اور الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد اسلام کی دعوت کو عام انسانوں تک پہنچانا ہے،دور جدید میں الرسالہ کی تحریک،ایک ایسی اسلامی تحریک ہے جو مسلمانوں کو منفی کاروائیوں سے بچ کر مثبت راہ پر ڈالنے کی کوشش جاری رکھے ہوئی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ ۱۹۷۶ء میں الرسالہ کے اجراء کے بعد سے جو کام میں کر رہا ہوں،اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ میں مسلمانوں کو یہ سبق دے رہا ہوں، کہ وہ منفی سوچ سے اوپر اٹھیں اور مثبت سوچ کا طریقہ اختیار کریں۔[1]

الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن مولانا کی دختر محترمہ ڈاکٹر فرید خانم کی تنہا کوششوں سے 1984ء میں جاری ہوا، اور اب تک جاری ہے، مولانا کی اردو کتب کے جو انگریزی ترجمے شائع ہوئے وہ تمام ڈاکٹر فریدہ خانم کی تنہا کوششوں کا نتیجہ ہے۔جس کا اعتراف مولانا نے اپنی ڈائری (1990-1989)ء کے صفحہ 85 میں کیا ہے۔

12۔سفر نامے

آپ کے سفر نامے کافی مشہور ہیں، جیسے سفر نامہ غیر ملکی اسفار جلد اول، دوم، سفر نامہ اسپین و فلسطین، اسفار ہند وغیرہ ۔

تفسیر ''تذکیر القرآن'' کی دعوتی وامتیازی خصوصیات

مولانا وحید الدین خان کے نزدیک تفسیر کا مقصد، تقاضے اور تذکیر القرآن کی خصوصیات

قرآن اگرچہ ایک اعلیٰ ترین علمی کتاب ہے،اس میں فطری حدود کے اندر علم و عقل کی پوری رعایت رکھی گئی ہے مگر قرآن میں کسی بات کو ثابت کرنے کیلئے معروف علمی اور فنی انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے۔قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ فنی آداب اور علمی تفصیلات کو چھوڑ کر اصل بات کو موثر دعوتی اسلوب میں بیان کیا جائے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا

1۔ ماہنامہ تذکیر، ج۱۹، ص ۱۴، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۶ء

مقصد علمی مطالعہ پیش کرنا نہیں، اس کا مقصد تذکیر و نصیحت ہے اور تذکیر و نصیحت کے لئے ہمیشہ سادہ اسلوب کار آمد ہوتا ہے نہ کہ فنی اسلوب۔

تاہم یہ ایک طالب علم کی ضرورت ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک آدمی قرآن کے بیانات کی علمی تفصیلات اور اس کے فنی پہلوؤں کو جاننا چاہے۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ قرآن کی تفسیر کے لئے کیا انداز اختیار کیا جائے۔ قرآن کی تفسیر اگر اس کے اپنے سادہ دعوتی اسلوب میں کی جائے تو اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ تفسیر میں نصیحت اور تذکیر کی فضا باقی رہے گی جو قرآن کا اصل مقصود ہے مگر ایسی صورت میں خالص علمی تقاضوں کی رعایت نہ ہو سکے گی اور دوسری طرف اگر علمی و فنی پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفصل تفسیر لکھی جائے تو بعض خاص طبیعتوں کو وہ پسند آسکتی ہے مگر عام لوگوں کے لئے وہ ایک خشک دستاویز بن کر رہ جائیگی۔ مزید یہ کہ قرآن کے اصل مقصد، تذکیر و نصیحت کو مجروح کرنے کی قیمت پر ہوگا۔

اس مسئلہ کا ایک سادہ حل یہ ہے کہ تفسیر اور معلومات کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ قرآن کے ساتھ جو تفسیر شائع کی جائے وہ خود تو نصیحت اور تذکیر کے انداز میں ہو۔ اس کے بعد اس سے الگ ایک مستقل کتاب قاموس القرآن یا قرآنی انسائیکلوپیڈیا کے طور پر مرتب کر کے شائع کی جائے۔ اس دوسری کتاب میں وہ تمام فنی بحثیں اور علمی اور تاریخی معلومات ہوں جو قرآنی حوالوں کو تفصیلی انداز میں سمجھنے کے لئے ضروری ہیں مثلاً حضرت ابراہیمؑ سے متعلق آیات کے ذیل میں جو تفسیر لکھی جائے اس میں آنجناب کی زندگی کے صرف قابل عبرت پہلوؤں کی وضاحت ہو جن کی طرف قرآن میں اشارے کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے بارے میں جو تاریخی اور اثریاتی معلومات ہیں ان کو قاموس القرآن میں جمع کر دیا جائے جن کو آدمی لفظ ابراہیم کے تحت دیکھ سکے۔ اسی طرح نحوی، فقہی، کلامی اور طبیعیاتی مسائل کی تفصیلات بھی قرآن کی انسائیکلوپیڈیا میں درج ہوں نہ کہ قرآن کی تفسیر میں۔ تذکیر القرآن اسی نہج پر قرآن کی ایک خدمت ہے۔ تذکیر القرآن کو ہم نے اصل مطالب کی یاددہانی تک محدود رکھا ہے اور جہاں تک دیگر علمی و فنی معلومات کا تعلق ہے وہ ان شاء اللہ علیحدہ کتاب کی صورت میں مرتب کر کے شائع کی جائیں گی۔

یہ انداز عین وہی ہے جو خود قرآن نے اختیار کیا ہے۔ قرآن میں طبیعیات اور فلکیات کے حوالے ہیں مگر ان کی تفصیلات کو اللہ نے چھوڑ دیا کہ بعد کے زمانہ کے اہل علم انہیں خود دریافت کر کے ان کو مدون کریں۔ قرآن

میں قدیم شخصیتوں کا ذکر ہے مگر اللہ نے یہ کام آئندہ آنے والے ماہرین اثریات کے لئے باقی رکھا کہ وہ ان کی تحقیق کریں اور ان کی تاریخی تفصیلات سے دنیا کو آگاہ کریں۔ خدا قرآن میں خود ان تمام واقعات کو شامل کر سکتا تھا۔ مگر وہ صرف اس قیمت پر ہوتا کہ قرآن میں عبرت اور نصیحت کی فضا ختم ہو جائے چنانچہ خدا نے ہر چیز سے باخبر ہونے کے باوجود، سارا زور صرف نصیحت کی باتوں پر دیا اور بقیہ تفصیلات کو دوسروں کیلئے چھوڑ دیا۔ قرآن میں ایک طرف معلومات کی بے شمار تفصیلی باتوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ دوسری طرف بنیادی نصیحت والی باتوں کو بار بار دہرایا گیا ہے حتی کہ بہت سے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ قرآن مین مضامین کی تکرار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا یہ مقصد نہیں کہ لوگ اس کو معلومات کی ایک کتاب سمجھ کر پڑھ لیں۔ قرآن خداا ور آخرت کی باتوں کو لوگوں کی روح کی غذا بنانا چاہتا ہے۔ کسی چیز کو آدمی معلوماتی طور پر پڑھے تو اس کی تکرار اس کو ناگوار ہو گی۔ مگر جو چیز آدمی کی زندگی میں روح کی غذا بن کر داخل ہو جائے اس کی ہر تکرار آدمی کو نئی لذت دیتی ہے۔ جہاں لذات ہوں وہاں تکرار کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن میں یہ انداز اس لئے اختیار کیا گیا تاکہ وہ لوگ چھٹ کر الگ ہو جائیں جو معلومات اور تکرار کی اصطلاحوں میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ انسان چن لئے جائیں جن کیلئے قرآنی حقیقتیں لذت روح کا درجہ حاصل کر چکی ہوں۔

قرآن ایک دعوتی کتاب

قرآن عام طرز کی علمی تصنیف نہیں، وہ ایک دعوتی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول میں ایک خاص قوم کے اندر اپنا نمائندہ بنا کر کھڑا کیا اور اس کو اپنے پیغام کی پیغمبری پر مامور فرمایا۔ اس پیغمبر نے اپنے ماحول میں یہ کام شروع کیا اور اسی کے ساتھ قرآن کا تھوڑا تھوڑا حصہ حسب ضرورت اس کے اوپر اترتا رہا۔ یہاں تک کہ 23 سال میں پیغمبر کے دعوتی کام کی تکمیل کے ساتھ قرآن کی بھی تکمیل ہو گئی۔

قرآن اگرچہ اللہ کی ابدی رہنمائی ہے مگر مذکورہ ترتیب نے اس کے ساتھ ساتھ اس کی تاریخی کتاب بھی بنا دیا ہے۔ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ابدی رہنمائی کو تاریخ کے سانچہ میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ ایسی حالت میں بعد کے زمانہ میں قرآن کی تفسیر کرنا آدمی کو ایک نئے مسئلہ سے دوچار کر دیتا ہے۔ قرآن کی تفسیر الگ اس ابتدائی پس منظر کی روشنی میں کی جائے جس میں قرآن کے احکام اترے تھے۔ تو قرآن قدیم زمانہ

کی ایک تاریخی کتاب معلوم ہوگی۔اس کے برعکس قرآن کی تفسیر اگر اس کی ابدی اہمیت کو بنیاد پر کی جائے تو اس کا تاریخی پہلو مجروح ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔اس مسئلہ کی وجہ سے بعد کے زمانہ میں قرآن کی تفسیر کرنا ایک ایسا کام بن گیا ہے جس میں دوگونہ پہلوؤں کو نبھانا ضروری ہو۔ تذکیر القرآن میں یہی دوگونہ انداز اختیار کیا گیا ہے اس میں تاریخی پس منظر میں مختصر طور پر دکھایا گیا ہے مگر اس طرح نہیں کہ قرآن ایک تاریخی کتاب معلوم ہونے لگے۔اسی طرح اس میں قرآنی تعلیمات کو آج کے حالات کے مطابق کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔مگر ایسا نہیں کہ قرآن اپنی تاریخی بنیاد سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔قرآن آدمی کو جو مشن دیتا ہے وہ حقیقتاً کوئی ،نظام، قائم کرنے کا مشن نہیں ہے بلکہ اپنے آپ کو قرآنی کردار میں ڈھالنے کا مشن ہے۔قرآن کا اصل مخاطب فرد ہے نہ کہ سماج۔اس لئے قرآن کا مشن فرد پر جاری ہوتا ہے نہ کہ سماج پر۔تاہم افراد کی قابل لحاظ تعداد جب اپنے آپکو قرآن کے مطابق ڈھالتی ہے تو اس کے سماج نتائج بھی لازماً نکلانا شروع ہوتے ہیں۔یہ نتائج ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے بلکہ حالات کے اعتبار سے ان کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔قرآن میں مختلف انبیاء کے واقعات انہیں سماجی نتائج یا سماجی رد عمل کے مختلف نمونے ہیں اور اگر آدمی نے اپنی آنکھیں کھول رکھی ہیں تو وہ ہر صورت حال کی بات قرآن میں رہنمائی پاتا چلا جاتا ہے۔قرآن فطرت انسانی کی کتاب ہے۔قرآن کا وہی شخص بخوبی طور پر سمجھ سکتا ہے جس کے لئے قرآن اس کی فطرت کا حصہ بن جائے۔

مولانا کے نزدیک تذکیر القرآن کی خصوصیات

مولانا صاحب نے تذکیر القرآن کی خصوصیات تفسیر کے مقدمہ میں یوں بیان کی ہیں:

ا۔ یاد دہانی یا نصیحت

تذکرالقرآن کا خاص مقصد قرآن کی یاددہانی ہے۔قرآن کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ نصیحت ہے۔تذکیرالقرآن کی ترتیب میں سے زیادہ اسی پہلو کا لحاظ کیا گیا ہے کہ وہ پڑھنے والے کے لئے نصیحت بن سکے۔

۲۔ تذکیری غذا میں تسلسل

قرآن عام انسانی کتاب کی طرح ابواب کے انداز میں نہیں ہے بلکہ شذرات کے انداز میں ہے اگرچہ قرآن کی سورتوں اور عبارتوں میں ایک گہری ترتیب بھی ہے۔مگر اس کا عام انداز یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے ٹکروں میں ایک پورا پیغام ہے۔ایک ایک ، پیراگراف، میں ایک ایک بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

تذکیر القرآن میں اسی شذراتی انداز کو تشریح کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی قرآن کا ایک ٹکڑا یا ایک پیرا گراف، لے کر اس میں جو بات کہی گئی ہے اس کو مسلسل مضمون کی صورت میں بیان کیا گیا ہے ایسا اس لئے کیا گیا ہے تاکہ متعلقہ تشریح کو پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں معانی کا سلسلہ نہ ٹوٹے اور وہ قرآن کی تذکیری غذا مسلسل لیتا چلا جائے۔

خود آزمائی

۱۔ مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی دعوتی فکر بیان کریں۔

۲۔ تبلیغی جماعت کا طریقہ کار اور بنیادی اصولوں کی وضاحت کریں۔

۳۔ دعوت اسلامی کے مقاصد تحریر کریں۔

۴۔ امریکہ میں دعوتی تنظیموں کے کردار اور صورتِ حال بیان کریں۔

۵۔ مولانا وحید الدین خان کے احوال و آثار بیان کریں۔

۶۔ تحریک الرسالۃ کے نمایاں خدوخال بیان کریں۔

یونٹ نمبر 8

مکالمہ، مفہوم، نوعیت، حدود و شرائط اور
دعوت دین میں اہمیت و مقاصد

تالیف:

ڈاکٹر محمد سجاد

فہرست

صفحہ نمبر

یونٹ کا تعارف 344

یونٹ کے مقاصد 344

1۔ مکالمہ کا مفہوم 346

2۔ آداب مکالمہ 348

3۔ مکالمے کی نوعیت وجہات 349

4۔ مکالمہ کی حدود و شرائط اور آداب 349

4.1۔ احترام بین المذاہب 349

4.2۔ عظمت آدمیت کا تحفظ 350

4.3۔ مساوات انسانی 351

4.4۔ پُرامن بقائے باہمی 351

4.5۔ بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ 352

4.6۔ وحدتوں کی تلاش 352

4.7۔ تہذیبوں سے واقفیت 353

4.8۔ غلط فہمی کا ازالہ 353

4.9۔ تقریب بین الایان 354

4.10۔ حق کو قبول کرنے کی صلاحیت 354

4.11۔ یکسانیت اور فرق کا ادراک 355

4.12۔ مذہبی شخصیات کو مجروح کرنے سے گریز 355

4.13۔ سچائی کو بے باکی مگر ہمدردی سے پیش کرنا 356

4.15۔ فردِ مقابل کا ذاتی احترام 356

4.15۔اصل اور مستند مآخذ سے استفادہ 356
5۔ مکالمہ کے مقاصد 357
5.1۔عصری تہذیبی تصادم کا خاتمہ 357
5.2۔عدل اجتماعی کا قیام 357
5.3۔عالمی امن 358
5.4۔استفادہ باہمی 359
5.5۔رواداری کی فضا کا قیام 359
5.6۔بین الاقوامی عالمی اتحاد کے نبوی ﷺ اسوۂ کا فروغ 359
6۔ مکالمہ: دعوتی اہمیت، قرآن حکیم اور احادیث نبویہ ﷺ میں مکالماتی اسلوب 360
6.1۔مکالمہ کی دعوتی اہمیت 360
6.2۔قرآن حکیم میں مکالماتی اسلوب 363
6.3۔دعوت نبوی ﷺ میں مکالماتی اسلوب 375
7۔ مکالمہ کے اثرات ونتائج 390
7.1۔ مسلم نظریات کا فروغ 390
7.2۔ مشترک اقتدار اور فکری ہم آہنگی 391
7.3۔ بین الاقوامی، سیاسی و ثقافتی روابط کا استحکام اور تہذیبی تصادم کا خاتمہ 391
7.4۔ عالمی برداشت کے کلچر کا فروغ 393
خود آزمائی 394

یونٹ کا تعارف

مکالمے کا مطلب کسی مسئلے یا صورتِ حال میں اتفاقِ رائے کے حصول کے لیے باہمی افہام و تفہیم کی کوشش ہے۔ مکالمہ وقت کی ضرورت ہے، مکالمے کا مقصد سماج میں موجود مختلف طبقات کے درمیان عملی راہ ہموار کرنا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کے لیے زحمت اور تکلیف کا باعث بننے کے بجائے سماج کی تعمیر و ترقی اور امن و آشتی کے لیے معاون و مددگار بن سکیں۔ مکالمے سے مراد مختلف ثقافتوں، مذاہب، عقائد، پس منظر کے امن پسند لوگوں اور اداروں کے مابین تنازعات کے حل پر مرکوز تعمیری فکر بھی ہے۔ لہٰذا مکالمے کی مدد سے مختلف مذاہب، ثقافتوں اور طبقات کے درمیان افہام و تفہیم، مفاہمت اور قبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ بین المذاہب مکالمے کا مقصد نئے عقائد متعارف کروانا یا مختلف مذاہب کے نمائندوں کا اپنے اپنے مذاہب سے دست بردار ہونا نہیں بلکہ مختلف مذاہب کے نمائندہ افراد اور اداروں کا اپنے اپنے مذہب پر رہتے ہوئے ان کے درمیان پُر تشدد تنازعات کے خدشات کو ختم یا کم کرکے تعاون کی راہیں روشن کرنا ہے۔

اسلام ایک آفاقی دین ہے اور حضور نبی کریم ﷺ رحمت عالم ہیں۔ آپ ﷺ کی دعوت ہر زمانے، ہر خطے اور ہر رنگ و نسل کے لوگوں کے لیے ہے۔ اسی لیے مسلمان اقوامِ عالم سے دور نہیں رہ سکتے۔ تمام انسانوں تک براہِ راست یا بالواسطہ اسلام کا پیغام پہنچانا ہر مسلمان کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ وہ تمام اقوام جو مسلمانوں کی مخالف یا دشمن ہیں وہ بھی مسلمانوں کے مخاطب ہیں۔ اسی لیے اِن اقوام کے ساتھ محبت و مودت سے پیش آنا اور بااخلاق طریقے سے اِن تک اسلام کا پیغام پہنچانا اہل ایمان کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ لیکن اگر کسی قوم اور تہذیب کو اسلام اور مسلمانوں سے کسی غلط فہمی یا تعصّب کی وجہ سے عناد اور بغض پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ایسی قوم اور تہذیب کا اسلام سے قریب آنا اور حضور نبی کریم ﷺ کے پیغام کو سمجھنا مشکل یا ناممکن ہو گیا ہے تو ایسی اقوام اور تہذیبیں اس بات کی زیادہ مستحق ہیں کہ اُن کے دل و دماغ کی تسخیر کی کوشش کریں اور اس کے لیے مکالمہ کو بحیثیت ایک مؤثر ذریعہ کے اپنایا جائے۔ کیونکہ مستقل مکالمہ اور تعامل (Interaction) مخاطبین کے دلوں سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے دشمنی کو ختم کرکے اُن کے دلوں کو پیغام حق کی قبولیت کے لیے تیار کردے گا۔ ارشادِ الٰہی ہے

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾[1]

(اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی، اور برائی کو بہتر (طریقے) سے دور کیا کرو سو نتیجتاً وہ شخص کہ تمہارے اور جس کے

1۔ سورۃ فصلت ۴۱: ۳۴

درمیان دشمنی تھی گویا وہ گرم جوش دوست ہو جائے گا)۔

اسلام نظریاتی اختلاف کو قبول کرتا ہے۔ برداشت، احترام اور محبت کی پالیسی کو تبھی تشکیل دیا جاسکتا ہے جب دوسرے کے نظریات کو احترام دے کر اختلاف کو قبول کیا جائے۔ اچھے معاشرے کی تشکیل کے لئے اختلافات کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پرامن معاشرے کی تشکیل کے لئے تضادات کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے، اختلافات کو سمجھنے کے بعد ہی دوسرے عقائد اور مذاہب کا احترام جنم لیتا ہے اور اس طرح ہی مختلف مسالک اور مذاہب کے لوگوں کو قریب لایا جا سکتا ہے۔

اسلام میں مذاہب کی بجائے مذہبی افراد کے مابین Harmony کی ضرورت ہے کیونکہ مذاہب کے درمیان فرق کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کے دیئے ہوئے اس زریں اصول کی آج دنیا کو ضرورت ہے۔ ہر مذہب کے پیروکاروں کے اپنے عقائد ہیں اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے کے مذہب یا عقائد کے حوالے سے زبان کھولے۔ اختلافات کو سمجھ کر مذاہب کے مشترکات کو جمع کر کے آگے بڑھا جاسکتا ہے۔ عالمی اور علاقائی سطح پر دہشت گردی کے خاتمے کے لئے مختلف مسالک اور مذاہب کے پیروکاروں کو اپنے معاشروں میں برداشت، محبت امن اور سلامتی کے ساتھ رہنے کے لیے ایک ہونا ہوگا اور آپس میں ڈائیلاگ و مکالمہ کے دروازے کو ہمیشہ کھلا رکھنا ہوگا۔ اس یونٹ میں مکالمہ کے مختلف مفاہیم، جہات اور دعوت دین مین اس کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی مصادر یعنی قرآن حکیم اور احادیث نبویہ میں مکالماتی اسلوب کی مثالیں بھی دی کی گئیں ہیں:

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ مکالمہ کی معنی مفہوم جان سکیں۔
2۔ مکالمہ کے بارے اہل علم کی آرا کا مطالعہ کر سکیں۔
3۔ مکالمہ کی نوعیت اور جہات کو سمجھ سکیں۔
4۔ مکالمہ کے آداب، حدود و شرائط سے واقف ہو سکیں۔
5۔ مکالمہ کے اغراض و مقاصد اور دعوتی اہمیت جان سکیں۔
6۔ قرآن حکیم اور احادیث نبویہ میں مکالمہ کے اسالیب کا مطالعہ کر سکیں۔
7۔ مکالمہ کے اثرات و نتائج کا مطالعہ کر سکیں۔

1. مکالمہ کا مفہوم

مکالمہ ایک خاص اصطلاح ہے جو عربی زبان کے سہ حرفی لفظ ''ک ل م'' سے مشتق ہے جس کا مطلب لفظ، بات چیت، جملہ، قصیدہ یا خطبہ ہو سکتا ہے اور کلام کے معنی بات کے ہیں۔[1] اس سہ حرفی لفظ کے معانی ابن فارس نے ''بات کرنا'' اور ''زخمی کرنا'' بیان کیے ہیں[2]۔ اس سے ثلاثی مزید ''کالمہ یکالمہ مکالمۃ'' ہے جس سے مراد گفتگو۔ اس کا اہم مترادف جو قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے وہ ''حوار - '' ہے جو ایک جامع اصطلاح ہے۔

نواب صدیق حسن خان نے کہا کہ ک۔ل۔م کی خاصیت شدت اور قوت ہے۔[3]

مکالمہ سے مراد دو یا دو سے زیادہ افراد، فریقین، گروہوں، نظریوں، ثقافتوں، تہذیبوں، تمدنوں اور حکومتوں کے درمیان تبادلہ خیالات اور تبادلہ افکار کا نام ہے۔ مکالمہ بات چیت کی وہ قسم ہے جو دو اشخاص یا دو گروہوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اس میں خیالات کا تبادلہ برابری کی بنیاد پر ہوتا ہے اور کسی ایک فریق کو دوسرے پر فوقیت نہیں ہوتی۔ جھگڑے اور تعصب و عناد سے دور رہ کر باہمی دوستانہ ماحول میں تبادلہ خیال ہوتا ہے۔ مکالمہ کے معنی دو یا دو سے زائد لوگوں کی باہم گفتگو، ناول یا ڈرامہ کے کرداروں کی بات چیت یا کسی خاص مذہبی یا سیاسی مسئلے پر اتفاق رائے کے لیے باہم تبادلۂ خیالات کرنے کے ہیں۔

Today, dialogue is used in classrooms, community centers, corporations, federal agencies, and other settings to enable people, usualy in small groups, to share their perspectives and experiences about difficult issues. It is used to help people resolve long standing conflicts and to build deeper understanding of contentious issues. Dialogue is not about judging,weighing or making decisions, but about understanding and learning. Dialogue dispels stereotypes, builds trust, and enables people to be open to perspectives that are very

---

1 - الزبیدی ، تاج العروس من جواہر القاموس، بیت العلوم العربیۃ،ج ٣٣، ص ٣٦٩

2 - ابن فارس،زکریا، معجم مقاییس اللغۃ، دارالفکر ، ، ج٥،ص ١٣١

3- نواب صدیق حسن خان، العلم الخفاق فی علم الاشتقاق، ص ٦٣

different from their own."

مکالمہ کے لئے عربی زبان میں حوار کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس حوالے سے محمد راشد دیماس کہتے ہیں:

هو نوع من الحديث بين شخصين، يتمُّ فيه تداول الكلام بينهما بطريقة ما، فلا يتأثَّر به أحدهما دون الآخر، ويغلب عليهما الهدوء والبُعد عن الخصومة والتعصُّب[1]

یہ بات چیت کی ایک قسم ہے جس میں فریقین آپس میں کسی موضوع پر بات کرتے ہیں اور دوران گفتگو کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاتی، نیز ساری گفتگو دوستانہ ماحول میں ہوتی ہے جو ہر قسم کے نزاع اور تعصب سے پاک ہوتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمن النحلاوی کی رائے میں مکالمہ سے مراد:

ان يتناول الحديث طرفان او اكثر عن طريق السوال والجواب، بشرط وحدة الموضوع او الهدف، فيتبادلان النقاش حول امر معين، وقد يصلان الى نتيجة وقد لا يقنع احدهما الاخر ولكن السامع ياخذ العبرة ويكون لنفسه موقفا[2]

"دو یا دو سے زیادہ افراد سوال جواب کے اسلوب میں ایک دوسرے سے بات چیت کریں۔ بشرطیکہ موضوع اور مقصد ایک ہی ہو اور کسی مخصوص موضوع پر بحث ہو رہی ہو چاہے یہ گفتگو کسی نتیجہ پر پہنچے یا نہ پہنچے اتنا ضرور ہوتا ہے کہ فریقین ایک دوسرے کی آراء کو اہمیت دیتے ہیں اور ایک دوسرے کے موقف کی گہرائی سے توجہ دیتے ہیں"۔

مکالمہ کی اس لغوی و اصطلاحی تشریح کے بعد درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ مکالمے کے ذریعے لوگ اپنے افکار و تجزیات کو دوسروں کے ساتھ Share کرتے ہیں۔

۲ - باہمی بات چیت سے طویل مدتی اختلافات کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

۳ -مکالمے کے ذریعے سے متنازع مسائل کا گہرا فہم حاصل ہوتا ہے۔

۴ -مکالمہ، افکار و نظریات کا منطقی و مفید تبادلہ خیال ہے۔

۵۔ افکار کے منطقی تبادلے کی حقیقی بنیاد دو عناصر ہیں، اول کہنا اور دوم سننا

1۔ دیماس، محمد ارشد، فنون الحوار والاقناع، دار ابن حزم، ص۱۱

2۔ النحلاوی، عبدالرحمن، اصول التربية الاسلامية وأساليبها، ط۲، دار الفكر، ۱۹۹۵، ص ۲۰۶

۶۔ مکالمہ، غلط فہمیوں کو ختم کرتا ہے اور اس سے باہمی اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

۷۔ مکالمے سے لوگوں میں اپنے افکار و خیالات سے مختلف افکار و خیالات کو سمجھنے اور ان خیالات کے حاملین کے ساتھ جینے کا شعور پیدا ہوتا ہے

۸۔ مکالمہ متفق پہلوؤں اور مشترک نکات کے تعین ہی کا نام ہے۔

2۔ آداب مکالمہ

مکالمہ بہت سے اعلیٰ اوصاف کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے لیے بہت سے اخلاقی آداب اور علمی خوبیوں کی ضرورت ہے۔ ماہرین نے کامیاب مکالمے کے لیے بہت سے آداب و شرائط لکھے ہیں جن میں چند اہم یہ ہیں:

۱ - مکالمے کا موضوع طرفین کے ذہن میں بالکل واضح ہو۔

۲۔ غلطی واضح ہونے پر ہر فریق اعتراف خطا کے لیے تیار ہو۔

۳۔ ہر فریق دوسرے کے لیے ایسے ہی الفاظ استعمال کرے جیسے وہ اپنے لیے دوسروں سے سننا چاہتا ہے۔ یعنی گفتگو میں سطحی جملے اور سوقیانہ الفاظ و تعبیرات سے مکمل اجتناب ہو اور مخاطب کا احترام ملحوظ رہے۔

۴۔ ہر فریق دوسرے فریق کے فکر و خیال کا احترام کرے، اس کے عقائد کا احترام کرے اور اس کی نفسیات کا خیال رکھے۔

۵۔ مکالمے کا اصل محرک ہر فریق کے نزدیک تحقیق حق اور حقیقت حال تک رسائی ہو

۶۔ مکالمے کے دوران اعتدال و توازن پر قائم رہنے اور غصہ اور اس کے عوامل سے مکمل احتراز کرنے کی کوشش ہو ۔

۷۔ ہر فریق بیان واظہار کی قدرت رکھتا ہو۔

۸۔ گفتگو میں سنجیدگی اور شائستگی ہو۔

۹۔ ہر فریق دوسرے کی بات غور سے سنے، اس کی اچھی باتوں سے مستفید ہو۔ کیوں کہ دوسرے کی بات غور سے سننا، اسے سمجھنے کی کوشش کرنا ادب کی اساس ہے۔

3۔ مکالمے کی نوعیت وجہات

مکالمہ بین المذاہب(Interfaith Dialogue) کی اصطلاح کا مطلب مذاہب، مختلف عقائد اور مختلف نظام ہائے الٰہیات کے درمیان بات چیت کرنا ہے۔اسلامی نقطۂ نظر سے مکالمے کی پانچ نوعیتیں یا جہات ہو سکتی ہیں۔

۱۔ دعوت اسلام اور کسی غیر مسلم کا اپنے افکار کے حق میں بحث ومباحثہ پیش کرنا جیسے: انبیاء کرام کے حالات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد، قوم اور نمرود سے مکالمہ یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے مکالمہ۔

۲۔ مختلف مذاہب کے لوگوں کا اپنے اپنے مذہب کے حق میں دلائل دینا، قرآن کریم نے اس کے لیے مجادلہ کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے۔

۳۔ ایک معاشرہ میں اکٹھے رہنے کی صورت میں باہمی معاملات کی حدود طے کرنا، جیسے میثاق مدینہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ یہ تینوں صورتیں شرعی نقطۂ نگاہ سے قابل قبول ہیں۔

۴۔ عصر حاضر میں مکالمے کی ایک صورت موجودہ عالمی، سیاسی، معاشی، عسکری، فکری اور ثقافتی کشمکش ہے۔ یہ کشمکش بین المذاہب نہیں ہے بلکہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان ہے۔

۵۔ اہل کتاب مثلاً یہود ونصاریٰ یا مجوس وغیرہ سے مکالمہ کا اسلوب وانداز اور موضوعات جُدا ہوں گے جب کہ غیر الہامی مذاہب مثلاً ہندو مت، بدھ مت اور سکھ مت وغیرہ سے انداز اور ہو گا۔

۶۔ مذہب پسند طبقہ اور مذہب مخالف لوگوں سے مکالمہ کے اصول وشرائط جدا ہوں گے۔

4۔ مکالمہ کی حدود و شرائط اور آداب

مکالمہ اگر کسی ضابطۂ اخلاق، آداب اور حدود وشرائط کا پابند نہیں رہے گا تو ایک بیکار محنت سے زائد کچھ نہ ہو گا۔ لہذا فریقین کو مشترکہ متفقہ ضابطۂ اخلاق تشکیل دے کر مکالمے کا آغاز کرنا ہو گا۔اس ضمن میں درج ذیل باتوں کو بنیادی اہمیت دینا ہو گی:

4.1۔احترام بین المذاہب

بین المذاہب مکالمے کی فضا کو سازگار اور خوشگوار بنانے اور رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ فریقین بین الاقوامی

سطح پر مذاہب، ان کی کتابوں اور ان کے رہنماؤں کے لیے باہمی احترام کا ایک ایسا کلچر ترتیب دیں جس میں کسی مذہبی فکر، مذہبی کتابوں اور مذہبی رہنماؤں کی کردار کشی، تحقیر اور تضحیک کا کوئی پہلو نہ نکلتا ہو۔ دین ابراہیمی سے متعلق مذاہب اور انبیاء علیہم السلام کا احترام تو مسلمانوں پر واجب ہے ہی اسلامی تعلیمات کے مطابق کسی غیر آسمانی مذہب کے روحانی پیشوا کے لیے بھی کوئی نازیبا اور ناشائستہ طرز کلام اختیار نہیں کیا جا سکتا حتیٰ کہ ان کے معبودوں کو بھی کسی برے لقب کے ساتھ پکار نہیں سکتے۔ ان کی عبادت گاہوں کے احترام کی تلقین کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں اہل کتاب (ابراہیمی مذاہب) کے ساتھ مکالمے کے لیے تو بالخصوص قرآن کریم میں مستقل احکام ملتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [1]

اور (اے مومنو!) اہل کتاب سے بحث و مباحثہ بہت ہی بھلے (مکالمہ) طریقہ سے کرو۔

اسی طرح غیر مسلموں بالخصوص غیر آسمانی مذاہب کے معتقدات، ان کے مذہبی رہنماؤں، پرستش کے مقامات اور بتوں وغیرہ کے سلسلے میں مسلمانوں کو بدکلامی سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ [2]

(اور (اے مسلمانو!) تم ان (جھوٹے معبودوں) کو گالی مت دو جنہیں یہ (مشرک لوگ) اللہ کے سوا پوجتے ہیں پھر وہ لوگ (بھی جواباً) جہالت کے باعث ظلم کرتے ہوئے اللہ کی شان میں دشنام طرازی کرنے لگیں گے۔)

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

"نبی ﷺ کے پیروکار اپنی تبلیغ کے جوش میں اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرے اور بحث و تکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبودوں کو گالیاں دینے تک نوبت پہنچ جائے کیونکہ یہ چیز ان کو حق سے قریب لانے کے بجائے اور زیادہ دور پھینک دے گی"۔ [3]

4.2۔ عظمت آدمیت کا تحفظ

اسلام کے نزدیک اس کائنات کی حسین اور افضل ترین مخلوق انسان ہے۔

1۔ سورۃ العنکبوت: ۲۹: ۴۶

2۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۷۴ء، ج ا، ص ۵۷۱

3۔ سورۃ الانعام: ۶: ۱۰۸

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ﴾[1]

(اور بیشک ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی)

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾[2]

(بے شک ہم نے انسان کو بہترین تخلیق سے نوازا۔)

مکالمے کے ذریعے انسانی شرف کی پامالی کو روک کر اس کے تحفظ کے لیے اجتماعی کوششیں کی جائیں۔

4.3۔ مساوات انسانی

اسلام مساوات انسانی کا تصور پیش کرتا ہے اور تمام انسانیت کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دیتا ہے۔

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا﴾[3]

(اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا فرمایا اور ہم نے تمہیں (بڑی بڑی) قوموں اور قبیلوں میں (تقسیم) کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔)

اس ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم فرماتے ہیں:

گویا دنیا بھر کے انسانوں کے درمیان دو وحدتیں مشترک ہیں ایک وحدتِ خالق اور دوسری وحدتِ آدم، روئے زمین پر جتنے بھی انسان بس رہے ہیں وہ سب خدا کی مخلوق ہیں لہذا باہم مساوی اور آدم و حوا کی اولاد، لہذا آپس میں بھائی بھائی ہیں۔[4]

بین المذاہب مکالمے کے لیے ہمیں ہر قسم کے رنگ، نسل، زبان، عقیدے یا ثقافت کے بارے میں احترام کا رویہ اپنانا ہوگا اور ہر نوع کی تحقیر کے رویوں کو عملاً ختم کرنا ہوگا۔

4.4۔ پُرامن بقائے باہمی

موجودہ دور عالمگیریت کا دور ہے۔ کوئی قوم الگ تھلگ رہ کر اپنا وجود قائم نہین رکھ سکتی لہذا عہد جدید کا تقاجا

1۔ سورۃ الاسراء: ۱۷: ۷۰

2۔ سورۃ التین: ۹۵: ۴

3۔ سورۃ الحجرات: ۴۹: ۱۳

4۔ ڈاکٹر اسرار احمد، قرآن اور امن عالم، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۹۳، ص ۱۱

ہے کہ پرامن بقائے باہمی کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ بہترین تعلقات قائم کئے جائیں۔ مکالمہ کے ذریعہ یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

4.5۔بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ

دنیا میں زندہ رہنے ، مال کی ملکیت اور آزادی ہر جان کے لیے ضروری ہے۔ مذہب کا بنیادی کام اور ہدف انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرانا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر انسان کی ذاتی زندگی سے لے کر بین الاقوامی سطح پر اس کے ان حقوق کا تحفظ اجتماعی شعور کے ساتھ ہونا چاہیے۔ شریعت اسلامیہ کے بنیادی مقاصد خمسہ یعنی، تحفظ دین، تحفظ جان، تحفظ مال، تحفظ نسل وعزت وآبرو، تحفظ عقل کو پورے دین کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے۔ اسلامی ریاست ان سب کا تحفظ کرتی ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم شہری میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مرتے دم تک غیر مسلموں کا خیال تھا،آپ کی وصیت تھی کہ

"میں اپنے بعد والے خلیفہ کو اہل ذمہ کے بارے میں وصیت کرتا ہوں کہ وہ ان سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کرے اور ان کی حفاظت کے لیے لڑے اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دے"۔

4.6۔وحدتوں کی تلاش

قرآن مجید اس امر کی پوری صراحت کرتا ہے کہ خدا کی طرف سے نوع انسان کے لیے ہمیشہ ایک ہی دین بھیجا گیا ہے اور وہ ہے اسلام، یعنی خدا کے آگے سر اطاعت جھکا دینا۔[1] دنیا کے مختلف حصوں اور مختلف قوموں میں جو انبیاء بھی خدا کے بھیجے ہوئے آئے تھے وہ اپنے کسی الگ دین کے بانی نہیں انھوں نے دین اسلام کی ہی تبلیغ کی۔

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ﴾[2]

(اس نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرّر فرمایا جس کا حکم اس نے نوح (علیہ السلام) کو دیا تھا اور جس کی وحی ہم نے آپ کی طرف بھیجی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ و عیسیٰ (علیہم السلام) کو دیا تھا (وہ یہی ہے) کہ تم (اِسی) دین پر قائم رہو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو)۔

1۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، دین اسلام کی حقیقی تصویر، اسلامک سروسز سوسائٹی لاہور، س۔ن، ص ۵

2۔ سورۃ الشوریٰ: ۴۲: ۱۳

تمام نبیوں کی طرف سے اس دین کی وحدت و اقامت کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین اپنی اصل و اساس کے اعتبار سے پہلے انسان اور پہلے پیغمبر سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر آخری نبی ﷺ تک ہمیشہ سے ایک اور متحد رہا ہے۔ سلطان احمد اصلاحی کے مطابق

''عقائد و عبادات، رشتے ناطے کے حقوق، انسانوں کی خدمت، حلال و حرام کے اصول، عدل و انصاف کے قیام اور معاشرے کی سیاسی اور معاشی تنظیم وغیرہ کے جہاں تک اصول و اساسیات کا تعلق رہا ہے۔ یہ کسی اختلاف و انقطاع کے بغیر ہر نبی کی دعوت میں یکساں طور پر موجود رہے ہیں''۔[1]

چنانچہ آج ان عالمی مذاہب میں وحدتوں کی تلاش کا کام کیا جانا چاہیے اور ان مماثلتوں کے نتیجہ میں ایک دوسرے کے قریب ہونا چاہیے۔ مکالمہ اس کے لیے بہترین اُسلوب ہے۔

4.7۔ تہذیبوں سے واقفیت

ذرائع نقل و حمل کی ترقی اور وسائل مواصلات کی نت نئی ایجادات کے نتیجے میں دنیا بہت چھوٹی ہو چکی ہے۔ اس دور میں خاص لوگ ہی نہیں بلکہ عام لوگ بھی دور دراز کا سفر کرتے رہتے ہیں۔ اخبار ورسائل، ریڈیو، ٹی وی اور سوشل میڈیا وغیرہ کے ذریعے گھر بیٹھے پوری دنیا کی معلومات حاصل ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مختلف علاقوں کے مذہبی عقائد اور تہذیبوں سے صحیح واقفیت ہو تاکہ ان کے ساتھ ملنے جلنے اور گفتگو کے درمیان پہلے سے ہی کچھ معلومات حاصل ہوں تاکہ اپنے اور دوسرے لوگوں کے مذہب سے متعلق وثوق کے ساتھ گفتگو کر سکیں۔

4.8۔ غلط فہمی کا ازالہ

بعض مرتبہ دوسری مذہبی اکائیوں سے متعلق محض لاعلمی کی وجہ سے غلط فہمی واقع ہو جاتی ہے جس کے ہوتے ہوئے نہ اُن مذاہب کے سلسلے میں ہم صحیح فیصلہ کر پاتے ہیں اور نہ ان کا صحیح مرتبہ طے کر پاتے ہیں۔ چنانچہ ہم دوسرے مذہبی گروہوں سے گفتگو کرنے سے کتراتے ہیں اور اگر کسی موقع پر گفتگو کرنا ناگزیر ہو جائے تو صحیح گفتگو نہ کر پانے کی وجہ سے دوسروں کو قائل بھی نہیں کر پاتے۔ مکالمہ کے ذریعے سے ایسی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔

---

[1]۔ سلطان احمد اصلاحی، وحدت ادیان کا نظریہ اور اسلام، دار التذکیر اردو بازار لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۱

4.9۔ تقریب بین الادیان

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾[1]

(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو یکساں ہے ہمارے اور تمہارے درمیان۔

یہ قرآنی دعوت تمام اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان یکسانیت کی تلاش کا داعیہ پیدا کرتی ہے۔ اس طرح قرآن کی یہ اطلاع کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم اور ہر زمانے میں ہادی بھیجے ہیں۔ ہمیں یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ ہر قوم میں انبیائی تعلیمات ضرور موجود ہوں گی۔ چنانچہ ان مشترک تعلیمات کی تلاش کے ذریعہ ہم غیر مسلمین کو اپنے قریب کر سکتے ہیں۔ ہم یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی کم فہمی کی وجہ سے اپنے اور ان کے درمیان فاصلوں کا اندازہ کس حد تک صحیح یا غلط کیا ہے۔

4.10۔ حق کو قبول کرنے کی صلاحیت

جو لوگ حق کو قبول کرنے کے ارادے سے نہیں سنتے ان کو قرآن کریم میں اندھا گونگا اور بہرا کہا گیا ہے۔ ایک مسلمان معلومات کا محض خزانہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک عالم ہوتا ہے اور ایک عالم علم کو قبول کرنے میں کبھی بخیل نہیں ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اسلام خود حق ہے اور حق پسند بھی ہے مگر دوسری مذہبی اکائیوں کے جملہ تصورات میں بھی کچھ سچائیاں ہو سکتی ہیں۔ ان کو سچائی کی حیثیت سے قبول نہ کرنا دیانت کے خلاف ہوگا۔ کسی مذہب میں موجود سچائی کو محض اس بناء پر ردّ کر دینا، یا اس پر غیر ضروری تنقید کرنا کہ وہ بنیادی سچائیوں کو قبول نہیں کرتا، یا اس میں بنیادی سچائیوں میں ملاوٹ کر دی گئی ہے، فاصلوں کو بڑھانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتا۔ بنیادی عقیدوں میں کھوٹ کی نشاندہی کرتے ہوئے دوسرے مذہب کی سچی باتوں کو فراخدلی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے اور ان سچائیوں پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے اس مذہب کے ماننے والوں کو عزت دینی چاہیے۔ تمام مذاہب انسانیت دوست ہیں۔ اس معنی میں کہ انسانوں کی خدمت، ان کے دکھ درد میں کام آنے، ماں، باپ، استاد، مذہبی شخصیتوں کا ادب، جانوروں کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ وغیرہ کی تعلیم تمام مذاہب میں پائی جاتی ہے۔ البتہ ان اقدار پر عمل کرنے اور اہمیت دینے کے درجات مختلف مذاہب کے درمیان

1۔ سورۃ آل عمران ۳:۶۴

مختلف ہیں۔ چنانچہ ان معاملات میں مختلف مذاہب کے درمیان زیادہ بہتر، زیادہ معتدل، زیادہ انصاف پسند اور انسانی فطرت سے زیادہ قریب ہونے کے اعتبار سے تفریق تو کی جاسکتی ہے۔ مگر ایک سرے سے رد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اگر حق کو قبول کرنے کا ارادہ ہے تو معمولی فرق کو برداشت کرنے کا جذبہ ضرور کام کرے گا اور مکالمہ سود مند ثابت ہو گا

4.11۔ یکسانیت اور فرق کا ادراک

بین المذاہب مکالمے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دو یا تین یا زیادہ مذاہب کے درمیان کسی موضوع پر گفتگو کرنے والوں کو اس بات کی صحیح معلومات ہونی چاہئیں کہ اُس مخصوص موضوع میں ہر مذہب کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ مشترک نکات کیا ہیں، اختلاف کہاں ہے۔ مشترک نکات میں کہاں فرق ہے اور اس فرق کی نوعیت کیا ہے۔ یعنی مشترک نکات کس حد تک مشترک ہیں اور کہاں پہنچ کر وہ بظاہر مشترک معلوم ہوتے ہیں مگر تفصیل میں فرق ہے۔ اسی طرح بحث کرنے والوں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جو نکات مختلف ہیں اگر ان کو اصل کی طرف پھیرا جائے تو کیا اصل میں بھی اختلاف موجود ہے یا ایسا تو نہیں کہ وہ مذاہب کی اصل تو ایک ہی ہو مگر شاخوں کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہو کہ بس اختلاف ہی ابھر کر سامنے آئے۔

4.12۔ مذہبی شخصیات کو مجروح کرنے سے گریز

ہر مذہب کے ماننے والوں کے دل میں اپنی مذہبی شخصیات کے ساتھ بہت عقیدت، احترام اور محبت کے جذبات ہوتے ہیں۔ وہ ان شخصیتوں کو معیار تصور کرتے ہیں، ان کی ہر تعلیم اور ہر عمل کو نمونے کے طور پر لیتے ہیں۔ ان کی تعلیم اور نمونوں پر تنقید کو ان کے حق میں بے ادبی تصور کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان نمونوں میں حق کی بنیاد پر تنقید کرنا ضروری سمجھتا ہے تو تنقید کا انداز مشتعل کرنے والا نہیں ہونا چاہیے۔ جہاں تک ممکن ہو کوئی اچھی تاویل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مشرکانہ تصورات کی تنقید سے پہلے یہ بھی معلوم کرلینا چاہیے کہ ان کی تعلیم میں خالص توحیدی تعلیم بھی شاید ہو۔ اس صورت میں یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ شاید مشرکانہ تصورات بعد میں کسی غلط فہمی کی وجہ سے در آئے ہوں۔ مثلاً عرب کے لوگ فرشتوں کو پوجتے تھے۔ گویا ان کی حیثیت دیوتاؤں جیسی تھی۔ اللہ نے فرشتوں کا انکار نہیں کیا۔ البتہ ان کا صحیح مقام و مرتبہ متعین کر دیا۔ لہٰذا یہ مناسب نہیں ہے کہ دیگر مذاہب پر تنقید کی جائے اور اپنے مجادلوں کو ان کی مذہبی شخصیات کی تضحیک و توہین کے مقام تک پہنچایا جائے۔ قرآن کریم میں ہمیں اس کا بہترین نمونہ ملتا

ہے جس میں تمام پیغمبروں کو موحدین کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے نام لے کر بتایا گیا ہے کہ وہ مشرک نہیں تھے۔ یعنی روایات کی بنیاد پر کردار کشی کے بجائے ان کے کردار کو مزین کیا گیا ہے اور روایات کی تردید کی گئی ہے۔

4.13۔ سچائی کو بے باکی مگر ہمدردی سے پیش کرنا

بین المذاہب مکالمہ کے دوران سچائی کو بے باکی سے اور بے خوف وخطر پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بصورتِ دیگر مکالمہ محض تفنن اور ذہنی مشق ہو کر رہ جاتا ہے۔ محض ذہنی مشق کے طور پر اگر سچائی کو پیش کیا جائے تو خواہ جتنی بھی بے باکی اختیار کی گئی ہو، بے اثر ہوتی ہے۔ چنانچہ بے باکی کے ساتھ سوز دروں کے بغیر بین المذاہب مکالمے اکثر نشستن، گفتن اور برخواستن کا منظر پیش کرتے ہیں۔ فرد مقابل کو خاموش کرادینا اور سامعین، قارئین یا ناظرین سے دادِ تحسین کے تحفے وصول کرنا بین المذاہب مکالمے کا مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ جب تک مخاطبین کو سوزِ دل کے ساتھ خطاب نہ ہو اور اسی قدر طلب اور تڑپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا نہ ہو کہ وہ ہماری بات کو لوگوں کے دلوں میں اتار دے اور انہیں مرنے کے بعد کی زندگی میں عذاب سے نجات دلادے، بین المذاہب مکالمہ بے جان رہتا ہے۔

4.14۔ فردِ مقابل کا ذاتی احترام

مکالمہ خواہ نجی محفل میں ہو رہا ہو یا سٹیج پر، یا تحریری طور پر تبادلۂ خیال ہو، ہر حال میں یہ بات پیش نظر رہے کہ دونوں افراد ایک دوسرے سے احترام کے ساتھ گفتگو کریں۔ تلخ کلامی، ترش روئی اور لہجے کی کاٹ ہمیشہ دلوں کو جوڑنے کے بجائے توڑنے کا کام کرتی ہے۔ یوں بھی علمی مباحثوں میں ذاتیات کو موضوع سخن بنانے سے علم کی خدمت نہیں ہوتی، جذبات ہی برانگیختہ ہوتے ہیں، سنجیدہ لوگوں کو اس اندازِ گفتگو سے وحشت ہوتی ہے جبکہ عوام کی واہ واہ اسی وقت سود مند ہوتی ہے جب اس کا تعلق علمی وقار اور دلیل کی بالادستی سے ہو۔ فردِ مقابل کی کردار کشی، اس کی دلیلوں پر پھبتیاں کسنا اور مسخرا پن، مکالمے میں سوقیانہ کیفیات پیدا کرتا ہے جس سے احتراز ضروری ہے۔

4.15۔ اصل اور مستند مآخذ سے استفادہ

کسی بھی تحقیقی مکالمے کے لیے مستند مآخذ سے استفادہ ضروری ہوتا ہے۔ مکالمے کے دوران ان مآخذ کی روشنی میں جو بات بھی کہی جائے گی اس میں غلطی کا امکان ہوگا۔ اس لیے کسی بھی مذہب سے متعلق تصور قائم کرنے سے پہلے اس مذہب کے اصل اور مستند مآخذ سے استفادہ کرنا اولین شرط ہے۔ ہر معاشرے میں کچھ ایسی باتوں کا چلن ہوتا ہے جن کی ان کے اصل اور مستند مآخذ میں کوئی سند نہیں ہوتی۔ بعض روایتیں ایسی قائم ہو جاتی ہیں جو اصل مذہب کے بالکل

خلاف ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایسی روایتوں سے استناد مذہبی مکالموں کے لیے سود مند ہونے کے بجائے نقصان کا باعث ہو گا۔

5۔ مکالمے کے مقاصد

مکالمہ ایک ہمہ جہت حیثیت رکھتا ہے لہذا فرد، قوم، ملک، مذہب عالمی حالات، انسانی مسائل اور ان کا حل بہت سے مقاصد ہو سکتے ہیں اور ہر اعتبار سے اس کے مقاصد بھی جدا جدا ہوں گے لیکن یہاں نہایت اختصار سے صرف ان مقاصد کو زیر بحث لایا جا رہا ہے جن کے حصول سے عالمی سطح پر بین المذاہب بھی اور بین الانسان بھی مختلف انسانی معاشروں کو امن وسکون اور راحت نصیب ہو سکتی ہے۔

5.1۔ عصری تہذیبی تصادم کا خاتمہ

تہذیبوں کے تصادم نے خون ریزی اور نفرتوں کو جنم دیا ہے جب کہ مذہب انسانیت کی حرمت اور اس کے لیے محبتوں کا پیغام پیش کرتا ہے۔ اپنی تہذیب کو بزورِ بازو دوسروں پر مسلط اور غالب کرنے کے جذبے نے آج انسانوں کے درمیان نفرتوں کی جو آگ بھڑکا رکھی ہے اسے بجھانے کا واحد ذریعہ مذہب ہے جس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ اس وقت عالمی سطح پر شدت کے ساتھ یہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ تہذیبوں کے درمیان تصادم کے بجائے ہم آہنگی، رواداری، افہام و تفہیم کو رواج دیا جائے۔

5.2۔ عدل اجتماعی کا قیام

مسلمانوں نے خیر القرون میں اور اپنے عروج کے زمانہ میں عدلِ اجتماعی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں اقلیتوں اور غیر مسلموں کے ساتھ ہونے والے معاہدے اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلامی تاریخ عدل اجتماعی کی کوششوں سے مالا مال ہے۔ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں غیر مسلموں سے متعلق درج ذیل دفعات معاہدات میں شامل تھیں:

۱۔ ان کے اموال، نفوس اور اراضی پر ان کا قبضہ برقرار رہے گا۔

۲۔ انہیں نہ تو دین سے ہٹایا جائے گا اور نہ ان کی شریعت سے تعرض کیا جائے گا۔

۳۔ انہیں ہر سال ایک مرتبہ جزیہ ادا کرنا ہو گا۔ جس کے عوض ان کی حفاظت کی جائے گی۔

۴۔ جزیہ ہر شخص کی مالی وسعت کے مطابق ہو گا۔

۵۔ جزیہ کے مکلف بالغ مرد ہوں گے۔

۶۔ انہیں نووارد مسافروں کی رہنمائی کرنا ہوگی۔

۷۔ گزر گاہوں کی حفاظت ان کے ذمہ ہوگی۔

۸۔ مسلمان فوجی دستوں کی ایک دن کی مہمانی اور قیام کا انتظام کرنا ہوگا۔

۹۔ اگر انہوں نے کسی معاملہ میں دھوکہ دیا یا ان شرائط میں کمی کی تو امان کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔[1]

بین المذاہب مکالمہ کے لیے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ عادلانہ رویوں کے فروغ کے لیے بین الاقوامی کوششیں کی جائیں۔

5.3۔عالمی امن

دور حاضر میں امن وآشتی کی جس قدر ضرورت ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہ رہی ہو۔ اس وقت دنیا میں ہتھیاروں کا پھیلاؤ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے کھربوں روپے کے خطرناک ہتھیار بنائے اور چلائے جا رہے ہیں۔

مسلمان اس بات کے دعویدار ہیں کہ وہ پیغام امن کے امین ہیں جو تمام بنی نوع انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول ﷺ کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ یہ بے چین انسانیت کی دکھ بھری آواز کا خدائی جواب ہے۔

قاضی سلمان منصور پوری کے بقول:

حضور اکرم ﷺ کے اسوہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ معاشرے میں امن کے فروغ کے لیے کام کیا۔ آپ ﷺ نے دیگر قبائل اور مذاہب سے جس قدر معاہدات فرمائے، ان سب کا مقصد امن کا قیام ہی تھا۔ فتح مکہ کا دن ظاہراً بدامنی کا دن ہونا چاہیے تھا لیکن آپ ﷺ نے بدترین دشمنوں کے لیے بھی امن کے دروازے کھول دیئے۔[2]

لہٰذا امن کا نعرہ لگا کر فقط سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے بجائے اسلامی روح کے مطابق پیغمبر ﷺ کے اسوہ امن کو مشعل راہ بناتے ہوئے عالمی امن کے لیے مشترک جدوجہد کی ضرورت ہے۔

1- حمید اللہ، ڈاکٹر، سیاسی وثیقہ جات، ابو یحیٰ خان نوشہروی (مترجم)، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۲۶۵

2- منصور پوری۔ قاضی سلیمان، رحمۃ للعالمین، الفیصل ناشران وتاجران کتب، اردو بازار لاہور، ۱۹۹۱ء، ج ۲، ص ۳۲۱

5.4۔استفادہ باہمی

دور جدید میں بین المذاہب ہم آہنگی اور یگانگت کا فروغ اس لیے بھی ضروری ہے کہ دنیا اس وقت ایک عالمی بستی (Global Village) کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یہ دور تخصص اور مہارت کا دور ہے۔ ہر شخص اور ہر قوم کے بس میں نہیں کہ تمام علوم میں مہارت حاصل کر سکے اس لیے دیگر اقوام و ملل سے علمی میدان میں استفادہ ناگزیر ہے۔

5.5۔رواداری کی فضا کا قیام

عام طور پر جب اسلام کے حوالے سے لفظ رواداری بولتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف اقوام، مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ جو اسلامی حکومت کے زیر نگیں قیام پذیر ہوتے ہیں ان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا ہونا چاہیے۔ اسلام غیر مسلم اقوام کو اپنے پرسنل لاء کے مطابق زندگی گزارنے کی صرف اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ مکمل تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾[1]

انسانوں کے درمیان حقیقی اخوت تبھی پیدا ہو گی جب باہم رواداری کی وہ فضا پیدا نہ کر لیں جو اسلامی تاریخ میں مسلمانوں نے تمام مذاہب کے لوگوں کے ساتھ پیدا کی تھی۔

5.6۔بین الاقوامی عالمی اتحاد کے نبوی ﷺ اسوہ کا فروغ

نبی کریم ﷺ نے اپنی مکی و مدنی حیاۃ طیبہ میں دیگر مذاہب اور گروہوں جن میں یہود نصاریٰ، مشرکین اور منافقین شامل ہیں انسانی بنیادوں پر رواداری اور محبت و ہمدردی کا خوب اظہار کیا۔ صرف دو مثالیں میثاق مدینہ اور صلح حدیبیہ ہی انسانی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے بقول:

دنیا کا پہلا تحریری دستور، جس میں مدینہ کی حدود میں بسنے والے دیگر مذاہب کے باشندوں کے سیاسی، معاشرتی، قانونی اور مذہبی حقوق کا تحفظ کیا گیا۔[2]

1- سورۃ البقرہ: ۲:۲۵۶

2- محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، مجموعہ الوثائق السیاسیۃ فی العھد النبوی والخلافۃ الراشدہ، دار النفائس، بیروت ۱۹۸۳ء، ص ۶۲

چند دفعات قابل غور ہیں:

۱۔ یہود اور مسلمان اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہوں گے۔

۲۔ ان کے باہمی تعلقات خیر خواہی، خیر سگالی، نیکی اور بھلائی کے ہوں گے، جرم اور گناہ کے نہیں۔

۳۔ جو مظلوم ہو گا اس کی مدد کی جائے گی۔

۴۔ یثرب کی وادی میثاق کے فریقوں کے لیے واجب الاحرام ہو گی۔

۵۔ پڑوسی اور پناہ دینے والے کے وہی حقوق ہوں گے جو اپنی ذات کے۔ [1]

محمد حسین ہیکل کا تبصرہ بھی خوب ہے۔ فرماتے ہیں:

یہ وہ تحریری معاہدہ ہے جس کی بدولت حضرت محمد ﷺ نے آج سے چودہ سو سال قبل ایک ایسا ضابطہ اسلامی معاشرہ میں قائم کیا جس سے شرکاء معاہدہ میں ہر گروہ اور ہر فرد کو اپنے اپنے عقیدہ و مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہوا، انسانی زندگی کی حرمت قائم ہوئی۔ [2]

تبادلۂ خیال اور ڈائیلاگ انسانی زندگی اور تہذیب کے فروغ کا ذریعہ ہیں ان کا دروازہ کھلا رکھنا چاہیے۔
تاریخ میں ایک ایسا زمانہ بھی تھا جب خیالات و اقدار کو سیاسی قوت کے ذریعے دوسروں پر ٹھونسا جاتا تھا۔ دور حاضر آزادی اظہار اور آزادی ابلاغ کا دور ہے۔ چنانچہ مشرق و مغرب کی اقوام عالم کے درمیان صحت مند مکالمے کے ذریعے دنیا کو جنت ارضی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

6۔ مکالمہ: دعوتی اہمیت (قرآن حکیم اور احادیث نبویہ میں مکالماتی اسلوب)

6.1۔ مکالمہ کی دعوتی اہمیت

قرآن کریم میں بنی نوع انسان کے لئے ہر قسم کی ہدایت موجود ہے اور کلام الٰہی میں اسلوب مکالمہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ اللہ تعالی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ذریعے اہل کتاب کو مکالمہ کی طرف اس انداز میں دعوت دی ہے۔

1- حوالہ بالا

2- ہیکل، محمد حسین، حیاۃ محمد"، مطبعۃ النہضہ العصریہ، ۱۹۴۸، ص ۲۲۷

ارشادالٰہی ہے:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾[1]

ترجمہ: اے اہل کتاب آوایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اس کے ساتھ کسی شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم صرف خدا کی بندگی واطاعت کرنے والے ہیں۔

مولاناوحیدالدین خان مکالمہ کی دعوتی اہمیت بیان کرتے ہوے لکھتے ہیں:

"مکالمہ کا اسلام سے ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ اسلام ایک دعوتی مشن ہے۔ اور دعوتی مشن خود میں ایک مکالمہ ہے۔ دعوتی مشن میں لوگوں کے ساتھ ربط پیدا کرنے اور ان کے ساتھ گفتگو کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دعوتی مشن لوگوں پر دوسروں کی فکر کو ضروری قرار دیتا ہے۔ دعوتی سرگرمیوں کے بغیر آپ کا وجود تنہا ہے۔ لیکن جب آپ دعوت کو اپنا ایک مشن بنالیتے ہیں تو آپ بے شمار لوگوں کے ساتھ ربط میں آجاتے ہیں اور جب بہت سارے لوگ ایک ساتھ جمع ہوں تو پھر فطری طور پر مکالمے کا آغاز ہوتا ہے۔

قرآن نے دعوت کے لیے ایک انتہائی عملی منہج فراہم کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم فریقین کے درمیان مشترکہ اقدار تلاش کریں اور اسے ہی گفتگو اور مکالمہ کی ابتدائی بنیاد بنائیں، اس اصول کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: "آپ فرمادیں: اے اہلِ کتاب! تم اس بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، (وہ یہ) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہیں بنائے گا، پھر اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دو کہ گواہ ہو جاؤ کہ ہم تو اللہ کے تابع فرمان (مسلمان) ہیں"۔

اسلامی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں ہمیں مکالمہ کی ایک عملی شکل کا بھی پتہ ملتا ہے۔ اس مکالمہ کا انعقاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کیا گیا تھا۔ مسجد نبوی میں منعقد ہونے والے اس مکالمہ میں تین مذاہب کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ ان تینوں مذہبی نمائندوں کا تعلق بالترتیب اسلام، یہودیت اور عیسائیت سے تھا، دراصل یہ ایک سہ رخی مکالمہ

1۔ سورۃ آل عمران ۳: ٦٤

تھا۔ مکالمہ کا مقصد لوگوں کے مذہب کو تبدیل کرنا نہیں ہے بلکہ مکالمہ ایک ذاتی تجربہ ہے۔ ہر انسان اسی اعتقاد کے ساتھ زندگی گزارتا ہے کہ وہ سچے راستے پر ہے۔ مکالمہ کا مقصد مذہبی بقائے باہم اور مذہبی رواداری کی راہیں تلاش کرنا ہے۔ مکالمہ کا مقصد اختلافات اور تنوعات کا مٹانا نہیں ہے اور نہ ہی کسی ایسے معاشرے کی تعمیر کرنا ہے جہاں بالکل ہی کوئی اختلاف نہ ہو۔ جو لوگ تمام اختلافات اور تنوعات کو یکسر ختم کرنا چاہتے ہیں وہ ایک خیالی دنیا میں گم ہیں۔ خیالی دنیا کا وجود صرف ذہن میں ہی ہو سکتا ہے حقیقی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اختلافات اس کائنات فطرت کا حصہ ہیں۔ انہیں ختم کرنا یا مٹانا بالکل ناممکن ہے۔ مکالموں کا مقصد حقیقی باہمی تعلیم و تعلم ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے۔ مکالمہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان سماجی رشتوں میں اصلاح پیدا کرنے، اجتماعی طور پر معاشرے میں امن اور ہم آہنگی کو فروغ دینے اور ایک دوسرے کے تعلقات کو بہتر طریقے سے سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔ مکالمہ دعوت کے لیے بھی ضروری ہے۔ دوسروں کے ساتھ ایک دوستانہ تعلق پیدا کر کے ہی ہم ایک ہم اپنے مذہب کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن اس کا مقصد اختلافات کو ختم کرنا اور لوگوں کا مذہب تبدیل کرنا نہیں ہے۔"[1]

ڈاکٹر عبد الرب نواب الدین اسلام میں اعتدال اور مکالمہ کی تحریک کے موضوع پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں

"اسلام میں مکالمہ ایک دعوتی منہج اور ذریعہ ہے اس ذریعے کے استعمال کرتے ہوئے ایک طرف جاہلوں اور دشمنوں کی طرف سے اسلام پر لگائے جانے والے بھونڈے اعتراضات اور شبہات کا ازالہ کیا جاتا ہے تو دوسری طرف امت مسلمہ کے اندر موجود ایسے لوگوں کو سمجھایا جاتا ہے جو غفلت میں پڑے رہنے کی وجہ سے حقیقت سے ناآشنا رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مکالمہ شدت پسندی اور دہشت گردی کے علاج کے لئے تریاق کی حیثیت رکھتا ہے یہ اس بیماری کا نہ صرف علاج ہے بلکہ اس سے حفاظت کے لئے ڈھال ہے، مکالمہ دو مختلف تہذیبوں کے درمیان غلط فہمیوں کے ازالے کے لئے شاہ کلید ہے۔ مکالمے کے ذریعے نفوس پر پڑے تالے کھلتے ہیں لوگوں کو گھل مل کر ایک دوسرے کا موقف سننے کا موقع ملتا ہے عقیدے کی اصلاح ہوتی ہے آپس میں مکالمہ ہنو چاہئے امت مسلمہ کے اندر آپس میں مکالمات، اختلاف رائے رکھنے والوں کے ساتھ مکالمات، دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے مکالمات، جن دشمنوں سے صلح ہو چکی ہے

---

[1] http://www.newageislam.com/urdu-section/maulana-wahiduddin-khan,-tr-new-age-islam/dialogue-and-dawah-مکالمہ-اور-دعوت/d/56097

ان کے ساتھ مکالمات، الغرض مکالمہ ہر انداز میں ہر صورت میں ایک پر اثر علمی وسیلہ دعوت ہے اور یہ عملی زندگی پر گہرے نقوش ثبت کرتا ہے"[1]۔

6.2 قرآن کریم میں مکالماتی اسلوب

قرآن کریم میں بیسویں آیات مکالماتی اسلوب کی تعلیم دیتی ہیں۔ جن میں سراسر ہدایت ہی ہدایت ہے۔ اور مختلف الانواع مخلوقات کے ساتھ خود باری تعالی کے مکالمات اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ یہ بہترین قرآنی دعوتی اسلوب ہے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں خود مخلوقات سے جو مکالمات کئے ہیں ان پر غور کیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مکالمے کا دروازہ کسی صورت بند نہیں ہوتا اللہ تبارک وتعالی نے خود اشرف المخلوقات یعنی پیغمبروں سے مکالمات کیے اور اس کے ساتھ ساتھ ارذل الخلق یعنی شیطان اور ابلیس سے بھی مکالمات کئے ہیں اسی طرح فرشتوں سے جنوں سے اور دیگر مخلوقات سے جو مکالمات ہوئے ہیں ان کی تعداد تقریبا 143 سے زیادہ ہے۔

مکالمات الہی چونکہ قرآن میں وارد ہوئے ہیں اور یہ اللہ کا کلام ہے اس لئے اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ آیات سراسر ہدایت ورہنمائی کے لئے نازل ہوئی ہیں۔ جن سے دور حاضر کے ذرائع ابلاغ کے زمانے میں دعوت کے میدان میں بھرپور دائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ دعوتی میدان میں قرآنی تعلیمات سے استفادہ کرنا وقت کی ضروت بھی ہے اور عالمگیریت کے ماحول میں قرآن کے پیغام کو پہنچانے کا ذریعہ بھی۔

اللہ تعالی کا انبیائے کرام کے ساتھ مکالمہ

مکالمہ کے مفہوم کو وضاحت کے بعد اس کے تاریخی اور اسلامی پس منظر کے حوالے سے سب سے اہم امر اللہ تعالی کا اپنے انبیاء ورسل کے ساتھ مکالمہ جات اور اس کے آداب وکیفیات کا وجود ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

انبیاء ورسل کے ساتھ اللہ تعالی کے مکالمے پر چند آیات درج ذیل ہیں

اللہ تعالی اور سیدنا آدم علیہ السلام کے مابین مکالمہ

﴿وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلاَ مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا وَلاَ تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الْظَّالِمِينَ ۔ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُواْ

1۔ آل نواب، الدکتور عبد الرب، وسطیۃ الاسلام ودعوتہ الی الحوار، الجامعۃ الاسلامیہ بالمدینۃ المنورۃ ۱۴۲۵ھ، ص ۱

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ فَتَلَقَّى آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ قُلْنَا اهْبِطُواْ مِنْهَا جَمِيعاً فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ وَالَّذِينَ كَفَرواْ وَكَذَّبُواْ بِآيَاتِنَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾[1]

(پھر ہم نے آدم سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ مگر اس درخت کارخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں شمار ہوگے آخر کار شیطان نے ان دونوں کواس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹادیااور انہیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے، ہم نے حکم دیا کہ "اب تم سب یہاں سے اتر جائو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے"۔اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی جس کواس کے رب نے قبول کرلیا کیوں کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے، ہم نے کہا تم سب یہاں سے اتر جاؤ پھر جو میری طرف سے ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔)

اس کے علاوہ سورۃ الاعراف کی آیات نمبر ۱۹تا ۲۵ اور سورۃ طہٰ کی آیات نمبر ۱۱۷تا ۱۲۴ بھی قابل ذکر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مکالمہ

﴿وَإِذِ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي قَالَ لاَ يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْناً وَاتَّخِذُواْ مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَداً آمِناً وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلاً ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾[2]

(یاد کرو کہ جب ابراہیم کواس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا تواس نے کہا میں تجھے سب

1۔ سورۃ البقرۃ ۲: ۳۵ تا ۳۹

[2] سورۃ البقرۃ ۲ : ۱۲۴ تا ۱۲۶

لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔ ابراہیم نے عرض کیا: اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے''؟ اس نے جواب دیا: میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔ اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کو لوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیم جہاں عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے اس مقام کو مستقل جائے نماز بنالو، اور ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو، اور یہ کہ ابراہیم نے دعا کی: اے میرے رب، اس شہر کو امن کا شہر بنادے، اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں، انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔ جواب میں اس کے رب نے فرمایا: اور جو نہ مانے گا دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اسے بھی دوں گا، مگر آخر کار اسے عذاب جہنم کی طرف گھسیٹوں گا اور وہ بد ترین ٹھکانا ہے۔)

اس کے علاوہ سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۳۱ اور ۲۶۰ اہم ہیں

اللہ تعالی کا سیدنا عیسی علیہ السلام کے ساتھ مکالمہ

﴿إِذْ قَالَ اللهُ يَا عِيسى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَى وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلاً وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْراً بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الأَكْمَهَ وَالأَبْرَصَ بِإِذْنِي وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوتَى بِإِذْنِي وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُواْ مِنْهُمْ إِنْ هَذَا إِلاَّ سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾[1]

(پھر تصور کرو اس موقع کا جب اللہ فرمائے گا کہ: اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تجھے اور تیری ماں کو عطا کی تھی، میں نے روح پاک سے تیری مدد کی، تو گہوارے میں بھی لوگوں سے بات کرتا تھا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، میں نے تجھے کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی، تو میرے حکم سے مٹی کا پتلا پرندے کی شکل کا بناتا اور اس میں پھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا، تو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتا تھا، تو مردوں کو میرے حکم سے نکالتا تھا، پھر جب تو بنی اسرائیل کے پاس صریح نشانیاں لے کر پہنچا اور جو لوگ ان میں سے منکر حق تھے انہوں نے کہا کہ یہ نشانیاں جادو گری کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔)

اس کے علاوہ سورۃ المائدہ کی آیات نمبر ۱۱۴ تا ۱۱۹ قابل ذکر ہیں

---

1 سورۃ المائدۃ ۵: ۱۱۰

اللہ تعالیٰ کا سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مکالمہ

﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَى مُوسَى وَأَخِيهِ أَن تَبَوَّءَا لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتًا وَاجْعَلُواْ بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُواْ الصَّلاَةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ وَقَالَ مُوسَى رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالاً فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّواْ عَن سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَلاَ يُؤْمِنُواْ حَتَّى يَرَوُاْ الْعَذَابَ الأَلِيمَ قَالَ قَدْ أُجِيبَت دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا وَلاَ تَتَّبِعَآنِّ سَبِيلَ الَّذِينَ لاَ يَعْلَمُونَ﴾ [1]

(اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو اشارہ کیا کہ مصر میں چند مکان اپنی قوم کے لئے مہیا کرو اور اپنے ان مکانوں کو قبلہ ٹھہرالو اور نماز قائم کرو اور اہل ایمان کو بشارت دے دو۔ موسیٰ نے دعا کی اے میرے رب، تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے، اے رب، کیا یہ اس لئے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں؟ اے رب، ان کے مال غارت کردے اور ان کے دلوں پر ایسی مہر کردے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا، تم دونوں کی دعا قبول کی گئی، ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔)

﴿وَمَا أَعْجَلَكَ عَن قَوْمِكَ يَا مُوسَى قَالَ هُمْ أُولَاء عَلَى أَثَرِي وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَى قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِن بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ﴾ [2]

(اور کیا چیز تمھیں اپنی قوم سے پہلے لے آئی موسیٰ؟ اس نے عرض کیا وہ بس میرے پیچھے آ ہی رہے ہیں، میں جلدی کر کے تیرے حضور آ گیا ہوں اے میرے رب، تاکہ تو مجھ سے خوش ہو جائے، فرمایا: اچھا تو سنو! ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے انہیں گمراہ کر ڈالا۔)

اس کے علاوہ سورۃ طہٰ کی آیات نمبر ۱۱ تا ۴۸ اور سورۃ الشعراء آیات نمبر ۱۰ تا ۱۷ اور سورۃ النمل آیات نمبر ۸ تا ۱۲ اہم ہیں

اللہ تعالیٰ کا سیدنا نوح علیہ السلام کے ساتھ مکالمہ

﴿وَنَادَى نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابُنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلاَ تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنِّي أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ

---

1 سورۃ یونس ۱۰ : ۸۷ تا ۸۹

2۔ سورۃ طٰہٰ ۲۰ : ۸۵۔۸۳

الْجَاهِلِينَ قَالَ رَبِّ إِنِّيَ أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَإِلاَّ تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُن مِّنَ الْخَاسِرِينَ قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلاَمٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَى أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾[1]

(نوح نے اپنے پروردگار کو پکارا اور کہا کہ میرے رب میرا بیٹا تو میرے گھر والوں میں سے ہے یقینا تیرا وعدہ بالکل سچا ہے اور تو تمام حاکموں سے بہتر حاکم ہے۔ اللہ تعالی نے فرمایا اے نوح یقینا وہ تیرے گھرانے سے نہیں ہے اس کے کام بالکل ہی ناشائستہ ہیں تجھے ہر گز وہ چیز نہیں مانگنی چاہیے جس کا تجھے مطلقا علم نہ ہو میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں سے اپنا شمار کرانے سے باز رہے نوح نے کہا کہ اے میرے پالنہار میں تیری ہی پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ میں تجھ سے وہ مانگوں جس کا مجھے علم نہ ہو اگر تو مجھے نہ بخشے اور تو مجھ پر رحم نہ فرمائے گا تو میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔ فرما دیا گیا کہ اے نوح ہماری جانب سے سلامتی اور ان برکتوں کے ساتھ اتر جو تجھ پر ہیں اور تیرے ساتھ کی بہت سی جماعتوں پر اور بہت سی امتیں ہوں گی جنہیں ہم فائدہ تو ضرور پہنچائیں گے لیکن پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔)

عمومی طور پر قرآن مجید کی بے شمار آیات اس حوالے سے نقل کی جا سکتی ہیں جس میں اللہ تعالی کا انبیاء و رسل کے ساتھ مکالمہ کا ذکر ہے یہ چند آیات بطور نمونہ نقل گئی ہیں جن سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالی اور انبیاء کے مابین حوار اور گفت و شنید کی کیفیات موجود تھیں اگر کسی رسول یا نبی کو ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے مکالمہ کی راہ اختیار کی اور اسی طرح اللہ تعالی نے انبیاء کے ساتھ اپنے تعلق کی وجہ سے انہیں کسی موقع پر اکیلا نہیں چھوڑا بلکہ ہر مرحلہ اور ہر موقع پر رہنمائی مہیا کی اور ان مکالمہ جات میں سب سے اہم امر یہ نظر آتا ہے کہ کسی بھی مرحلہ پر نہ تو اللہ تعالی کی طرف سے ظلم کی کیفیت نظر آتی ہے اور نہ ہی رسولوں کی جانب سے بحث برائے بحث کا انداز ملتا ہے بلکہ حکم کے سامنے اطاعت و تسلیم کا رویہ سامنے آتا ہے اگر کسی مقام پر کوئی حکم سمجھ میں نہیں آیا تو اس کے بارے میں استفسار بھی انتہائی احترام و تعظیم کے ساتھ کیا گیا اور سبب واضح ہونے کے بعد قلب کی گہرائیوں کے ساتھ اسے تسلیم کیا۔

1۔ سورۃ ھود ۱۱: ۴۵تا۴۸

انبیاء علیہم السلام کا اپنی اقوام کے ساتھ مکالمہ

مکالمہ یعنی بات چیت کے ضمن میں سب سے زیادہ اہم مرحلہ وہ نظر آتا ہے جب قرآن مجید ان مواقع کی منظر کشی کرتا ہے جب انبیاء کرام علہیم السلام اپنی اپنی اقوام کو مخاطب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس مخاطبت میں ان کے مد نظر اصلاح کا پہلو تھا وہ اصلاح جس کا تعلق ان کی پوری حیات سے تھا۔انبیاء کرام علہیم السلام کا اپنی اقوام کے ساتھ مکالمہ جات کی کیفیات کو قرآن مجید نے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے کیوں کہ اس کا تعلق دعوت اسلام و توحید سے ہے تاکہ ہر دور کے داعی حضرات ان احوال اور کیفیات کو مد نظر رکھیں اور فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا قیام تا قیامت ممکن ہو سکے اور اس میں کسی بھی دور میں کوئی تعطل یا رکاوٹ آڑے نہ آسکے۔جن انبیاء کرام کی اپنی اقوام کے ساتھ گفتگو کو نقل کیا گیا ہے ان میں سیدنا ابراہیم، سیدنا شعیب، سیدنا صالح، سیدنا لوط، سیدنا موسی، سیدنا نوح، سیدنا ھود علہیم السلام قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ جن کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ بغیر نام کے کیا گیا ہے ہم بطور مثال چند آیات کا ذکر کریں گے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اس میں مکالمہ جات کی کیا کیفیات اور اسالیب موجود تھے۔

حضرت نوح علیہ السلامنے اپنی قوم کو دعوت توحید دی انہیں مشرک اور بت پرستی سے منع کیا مگر آپ کی ساڑھے نو سو سالہ کاوش کے نتیجے میں گنتی کے چند غریب اور کمزور افراد آپ پر ایمان لائے۔دوسرے خود سر لوگ نہ صرف کفر و شرک پر ڈٹے رہے بلکہ آپ کی تحقیر پر اتر آئے۔قرآن کریم نے آپ کے مجادلہ حق کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ذیل میں اختصار کے ساتھ ضروری امور کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿قَالَ يَا قَوْمِ اَرَاَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ۔ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ O وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ O وَلَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾[1]

(آپ نے فرمایا اے میری قوم! بھلا یہ بتاؤ اگر میرے پاس روشن دلیل ہو اپنے رب کی طرف سے اور اس نے عطا فرمائی

1۔ سورۃ ھود ۱۱: ۲۸ تا ۳۱

ہو مجھے خاص رحمت اپنی جناب سے پھر پوشیدہ کردی گئی ہو تم پر (اس کی حقیقت) تو کیا ہم جبراً مسلط کریں تم پر یہ دعوت درآں حالیکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو۔ اور اے میری قوم! میں طلب نہیں کرتا تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی مال۔ نہیں میرا اجر مگر اللہ تعالی کے ذمہ اور میں (تمہیں خوش کرنے کے لیے) ان کو نکالنے والا نہیں جو ایمان لے آئے ہیں۔ بے شک وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں البتہ میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم ایسی قوم ہو جو (حقیقت سے) ناواقف ہے۔ اور اے میری قوم! کون مدد کر سکتا ہے میری اللہ تعالی کے مقابلہ میں اگر میں نکال دوں اہل ایمان کو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سوچتے اور میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ تعالی کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں خود بخود جان لیتا ہوں غیب کو اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو تمہاری نگاہیں حقیر جانتی ہیں کہ ہر گز نہیں دے گا انہیں اللہ تعالی کچھ بھلائی۔ اللہ تعالی بہتر جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے (اگر میں ایسا کروں تو) میں بھی ہو جاؤں گا ظالموں سے۔)

الغرض حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال کی دعوتی سرگرمیوں کے دوران آزمائش وابتلاء کے مرحلے میں کوہِ استقامت ثابت ہوئے۔ آپ نے دعوت کے مختلف اسالیب کو اپنایا۔ حکمت وموعظت کے ساتھ ساتھ مجادلہ ومباحثہ کو بطریق احسن نبھایا اور اپنے مشن میں ہمیشہ کامیاب ہوئے اور معاندین ومشرکین اپنے منطقی انجام کو پہنچے۔ یقیناً حضرت نوح علیہ السلامنے کی دعوتی کاوشیں داعیانِ اسلام کے لیے درخشندہ مثال ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ کی ساری زندگی دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں سے عبارت ہے۔ آپ نے دین حق کی اشاعت کے لیے بے دریغ، پے درپے قربانیاں دیں۔ آپ جس قوم میں پیدا ہوئے وہ کفر وشرک اور بت پرستی میں ڈوبی ہوئی تھی اور تو اور آپ کا خاندان بت گری کا ماہر تھا۔ چنانچہ آپ نے سب سے پہلے اپنے گھر سے دعوتِ حق کا آغاز کیا۔ اس کے بعد قوم کو دعوت توحید دی اور پھر بادشاہ وقت کو بھی راہ راست پر لانے کے لیے دلائل سے مزین مجادلہ ومخاصمہ کیا۔ انبیائے کرام میں سے آپ کی دعوتی سرگرمیاں منفرد دکھائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

"دعوت الی اللہ کے سلسلے میں نوح علیہ السلامنے کے بعد جس شخصیت کو نمایاں مقام حاصل ہے وہ ابراہیم علیہ السلامنے ہیں۔ قرآن مجید کی ۲۵ سورتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلامنے کا ذکر کسی نہ کسی صورت میں آیا ہے۔ ان کی شخصیت کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انہیں ایک مثال اور ایک نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔) "

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کا اپنے باپ سے مکالمہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس گھر میں آنکھ کھولی اس کا ماحول بھی شرک کی آلودگیوں سے متعفن تھا۔ آپ کا باپ آزر نہ صرف بت پرست تھا بلکہ بت پرستوں کا منتظم بھی تھا۔ چنانچہ ضروری تھا کہ دعوتِ حق کا آغاز اپنے گھر سے بلکہ اپنے باپ سے کیا جائے۔ اس اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے کار دعوت کا آغاز ہی خاصا مشکل تھا تاہم آپ نے اسے بحسن وخوبی نبھایا۔

سورہ مریم میں ہے:

﴿إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِى عَنكَ شَيْـًٔا يَٰٓأَبَتِ إِنِّى قَدْ جَآءَنِى مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِىٓ أَهْدِكَ صِرَٰطًا سَوِيًّا يَٰٓأَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَٰنَ ۖ إِنَّ الشَّيْطَٰنَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا يَٰٓأَبَتِ إِنِّىٓ أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَٰنِ وَلِيًّا﴾ [1]

(اے میرے باپ! بے شک آیا ہے میرے پاس وہ علم جو تیرے پاس نہیں آیا، اس لیے تو میری پیروی کر میں دکھاؤں گا تجھے سیدھا راستہ۔ اے باپ! شیطان کی پوجا نہ کیا کر۔ بے شک شیطان تو رحمان کا نافرمان ہے۔ اے باپ! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تجھے پہنچے عذاب (خدائے) رحمان کی طرف سے تو تو بن جائے شیطان کا ساتھی۔)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے مجادلہ کرتے ہوئے صریح الفاظ میں اسے بتوں کی حقیقت سے آگاہ کیا اور دعوتِ توحید دی مگر آپ کے وعظ و نصیحت کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا بلکہ اس نے آپ کو دھمکی دے ڈالی۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ ۖ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ ۖ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا﴾ [2]

(باپ نے کہا کیا رو گردانی والا ہے تو میرے خداؤں سے اے ابراہیم! اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا اور دور ہو جا میرے سامنے سے کچھ عرصہ۔)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے تیور بدلتے ہوئے دیکھے تو انتہائی نرمی سے اس کی بات سنی اور بڑے تحمل سے اس کا جواب دیا:

1۔ سورۃ مریم ۱۹: ۴۲ تا ۴۴

2۔ سورۃ مریم ۱۹: ۴۶

﴿قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا﴾[1]

(ابراہیم نے (جواب میں) کہا سلام ہو تم پر! میں مغفرت طلب کروں گا تیرے لیے اپنے رب سے بے شک وہ مجھ پر بے حد مہربان ہے۔اور میں الگ ہو جاؤں گا تم سے اور (اُن سے بھی) جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور میں اپنے رب کی عبادت کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب کی عبادت کی برکت سے نامراد نہیں رہوں گا۔)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑے خوبصورت انداز میں بت پرستی کے بطلان، شیطان کی شر انگیزی، راہ راست کی تلقین اور خلاف ورزی کی صورت میں عذاب الٰہی کے متعلق بڑی جامع اور مدلل گفتگو کی۔ان آیات کے متعلق ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

"قرآن نے وہ پورا مکالمہ نقل کیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلاماور ان کے باپ کے درمیان ہوا۔اس میں دعوت کا استدلال بھی ہے اور دعوت کا رد عمل بھی۔دعوت کا راسلوب بھی اور مخالف کا غرور بھی۔احضرت ابراہیم علیہ السلا مکے ایک ایک لفظ سے ہمدردی، خیر خواہی اور دلسوزی ٹپکتی ہے جبکہ باپ کے رد عمل میں تکبر اور تعصب واضح طور پر نظر آتا ہے۔ان آیات کو داعی کا نصاب کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔)"

تاریخ دعوت میں حضرت ابراہیم علیہ السلا مکا یہ کارنامہ منفرد نوعیت رکھتا ہے کہ آپ نے کارِ دعوت کی ابتداء اپنے گھر سے کی اور دعوت کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھا۔ خصوصاً مجادلہ ومباحثہ میں بھی شائستگی کا دامن چھوٹنے نہیں دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم سے مجادلہ

اپنے باپ سے مجادلہ کرنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنا فرض منصبی سنبھالنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی قوم کو دعوت ہدایت دینا شروع کی۔ مراحلِ دعوت میں آپ کا اپنی قوم سے ایک مجادلہ کچھ یوں ہوا۔ سورۃ انبیاء میں ہے:

﴿اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ﴾[2]

1۔ سورۃ مریم ۱۹: ۴۷ تا ۴۸

2۔ سورۃ الانبیاء ۲۱: ۵۲

(یاد کرو جب آپ نے کہا اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہ یہ کیا مورتیاں ہیں جن کی پوجا پاٹ پر تم جمے بیٹھے ہو۔)

تو آپ کی قوم نے جواب دیا:

﴿قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ﴾[1]

(وہ بولے پایا ہے ہم نے اپنے باپ (دادوں) کو کہ وہ ان کے پجاری تھے۔)

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

﴿قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾[2]

(آپ نے فرمایا بلا شبہ مبتلا رہے ہو تم بھی اور تمہارے باپ داد بھی کھلی ہوئی گمراہی میں۔)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک اور قرآنی مجادلہ میں اس واقعہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے جب آپ کی قوم ایک مذہبی تہوار کے سلسلہ میں مصروف تھی تو آپ بت خانہ میں چلے گئے اور بڑے بت کو چھوڑ کر باقی سب بت توڑ پھوڑ دیئے اور اپنے دیوتاؤں کی یہ درگت بنی ہوئی دیکھی تو حضرت ابراہیم ؑ سے کہا:

﴿قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ﴾[3]

(لوگو نے پوچھا اے ابراہیم! کیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟)

تو آپ نے جواب دیا:

﴿قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْــَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ﴾[4]

(فرمایا بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ حرکت کی ہو گی سو ان سے پوچھو اگر یہ گفتگو کی سکت رکھتے ہوں۔)

یہ جواب سن کر آپ کی قوم لاجواب ہو کر آپس میں سرگوشی کرنے لگی اور پھر آپ سے کہا:

﴿لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ﴾[5]

1۔ سورۃ الانبیاء ۲۱: ۵۳

2۔ سورۃ الانبیاء ۲۱: ۵۴

3۔ سورۃ الانبیاء ۲۱: ۶۲

4۔ سورۃ الانبیاء ۲۱: ۶۳

5۔ سورۃ الانبیاء ۲۱: ۶۵

(تم خوب جانتے ہو کہ یہ بولتے نہیں۔)

یہی وہ نکتہ تھا جس پر آپ اپنی قوم کو لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب قوم نے ان بتوں کے کلام نہ کرنے کا اعتراف کر لیا تو آپ نے موقع شناسی سے کام لیتے ہوئے فرمایا:

﴿قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾[1]

(آپ نے فرمایا (نادانو!) کیا تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان (بے بس بتوں) کی جو نہ تمہیں کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ تمہیں ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ تف ہے تم پر نیز اُن بتوں پر جن کو تم پوجتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔)

یہ جواب ایسا تھا جس میں اختلاف کی گنجائش نہ تھی اس میں کوئی ابہام، الجھاؤ یا پیچ و خم نہ تھا۔ بس سچی اور سیدھی بات تھی جو آپ نے مجادلہ احسن کے ذریعے اتمام حجت کے طور پر اپنی قوم سے کہہ دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کی تبلیغی کاوشوں میں دعوت بالمجادلہ کا رنگ غالب اور منفرد نظر آتا ہے۔ آپ کا طرزِ استدلال عموماً اس نوعیت کا ہوتا ہے کہ جو حقیقت آپ مخاطب پر واضح کرنا چاہتے ہیں وہ خود اس کی زبان سے کہلواتے ہیں۔ امین احسن اصلاحی نے اس اسلوب دعوت کو استدراج کا نام دیا ہے۔ چنانچہ تدبر قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے مخصوص مزاج اور آپ کے دعوت انداز کے متعلق لکھتے ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم، جیسا کہ قرآن میں بیان کردہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، بڑی مناظرہ باز اور حجت طراز قوم تھی۔ اول تو لوگ بات سننے کے لیے آسانی سے تیار ہی نہ ہوتے اور اگر کبھی سنانے کا کوئی موقع نکلتا بھی تو بڑی جلدی بدک جاتے اور مباحثہ و مناظرہ کے لیے آستینیں چڑھا لیتے۔ اُن کے مزاج کی اس وحشت کے وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلامبحث و خطاب میں استدراج کا طریقہ زیادہ اختیار فرماتے۔ استدراج کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب پر اس راہ سے درجہ بدرجہ گھیرے ڈالتے جدھر سے اُس کو سان گمان بھی نہ ہوتا کہ وہ گھیرے میں آسکتا ہے۔)

حضرت ابراہیم علیہ السلامانے باپ اور قوم سے مجادلہ کرنے کے بعد بادشاہ وقت نمرود سے بھی مجادلہ فرمایا اور اپنے منفرد

1۔ سورۃ الانبیاء ۲۱: ۶۶ تا ۶۷

طرز استدلال سے اُسے بھی لاجواب کر دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کا بادشاہ وقت سے مجادلہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ بعثت میں نمرود بادشاہ وقت تھا جس نے خدائی کا دعویٰ بھی کرر کھا تھا۔ جب اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتی سرگرمیوں کی اطلاع ملی تو اسے اپنی بادشاہی خطرے میں نظر آنے لگی۔ چنانچہ جب آپ اس کے پاس تشریف لے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان جو مجادلہ ومباحثہ ہوا۔ وہ یہ تھا کہ نمرود نے پوچھا اگر میرے سوا کوئی اور رب ہو سکتا ہے تو وہ کون ہے؟ اس کے اوصاف بیان کرو۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

﴿إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ [1]

(جب کہا ابراہیم علیہ السلامنے (اسے) کہ میرا رب وہ ہے جو جِلاتا ہے اور مارتا ہے۔)

تو نمرود کہنے لگا:

﴿قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ﴾ [2]

(اس نے کہا میں بھی جِلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں۔)

پھر اپنے دعویٰ کی دلیل کے طور پر ایک بے گناہ شخص کو قتل کرادیا اور ایک سزائے موت کے مجرم کو آزاد کر دیا۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلامنے اسے موت وحیات کی حقیقت سمجھانے اور معاملے کی باریکیوں میں جانے کے بجائے مجادلہ احسن سے کام لیتے ہوئے ایک نئی دلیل پیش کر دی:

﴿قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾ [3]

(ابراہیم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے تو تو نکال لا اسے مغرب سے۔)

اس جواب کے بعد نام نہاد خدائی کا دعویدار، بادشاہِ وقت نمرود کی جو کیفیت ہوئی' وہ یہ تھی:

﴿فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ﴾ [1]

1۔ سورۃ البقرہ ۲:۲۵۸

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

(یہ سن کر) ہوش اڑ گئے اس کافر کے۔)

محمد سرور بن نایف زین العابدین ''منہج الانبیاء فی الدعوۃ الی اللہ'' میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دعوت و مناظرہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''آپ نے دعوت حق کے سلسلے میں اپنے باپ، اپنی قوم اور نمرود کے ساتھ بہت مناظرے کیے، ان تمام مناظروں میں آپ نے مدمقابل لوگوں کے منہ بند کرائیے۔ دلائل قاطعہ کے ساتھ ان کی زبانوں کو لگام دے دی اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ آہستہ آہستہ قوم کو دلائل میں اس طرح جکڑ لیتے کہ ان کے لیے سوائے کٹ حجتی کے اور کوئی راستہ باقی ہی نہ رہتا۔ بہرکیف ان تمام مناظروں میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامیابی عطا فرمائی۔) ''[2]

6.3۔ دعوت نبوی ﷺ میں مکالماتی اُسلوب: احادیث نبویہ وکتب سیرت کا مطالعہ

کسی انسان کو اپنی بات کی طرف متوجہ کرنے اور اس کو ذہن نشین کرانے کا ایک موثر ذریعہ اور اسلوب، باہمی گفتگو اور بات چیت ہے۔ ماہرین نفسیات نے توجہ مبذول کرانے کے جن طریقوں کی وضاحت کی ہے۔ ان میں مکالمانہ انداز اور سوال وجواب کا اسلوب مخاطب کے ذہن وفکر کو متوجہ کرنے میں کافی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں متکلم اور سامع دونوں کو متوجہ رہنا پڑتا ہے۔ ہر ایک پورے انہاک سے اپنی بات کہتا اور سنتا ہے۔ تقریر و تحریر کے مقابلے میں یہ انداز اثر انگیزی میں کہیں بڑھ کر ہے کیونکہ متکلم اور سامع کے درمیان براہ راست گفتگو ہوتی ہے۔ مزید برآں اس میں آمد کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

مکالمہ، متکلم کی شخصیت، اس کے مزاج، اس کے علم وفضل، فکر ونظر کی افتاد، اس کے ظاہر وباطن کے احوال غرضیکہ ہر پہلو کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ماحول کے تقاضوں کا بھی عکاس ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے افہام وتفہیم کا جو ماحول پیدا ہوتا ہے وہ کسی بھی دوسرے اسلوب وانداز سے ممکن نہیں اور یہ دعوت وتبلیغ کا موثر ذریعہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی دعوتی زندگی اور آپ ﷺ کے طرز اسلوب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے نہ صرف دین حق کی تفہیم وابلاغ کے لیے مکالماتی اسلوب اختیار فرمایا بلکہ صحابہ کرامؓ کی روزمرہ زندگی کے بارے میں وعظ ونصیحت اور تربیت میں بھی اس موثر اسلوب سے مدد لی۔ آپ ﷺ نے اپنی بات بہتر طور پر ذہن نشین کرانے

1۔ ایضاً

2۔ محمد سرور بن نایف زین العابدین ،منہج الانبیاء فی الدعوۃ الی اللہ

کے لیے کبھی تبادلہ خیال کے طرز کو اختیار فرمایا کبھی سوال وجواب کے انداز پر گفتگو کی۔ اس سے کئی فائدے حاصل ہوئے۔ مثلاًاس طرح مدعو ہمہ تن گوش ہو کر بات سنتا مخاطب گفتگو میں دلچسپی لیتا ہے۔ مدعو کو غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مکالماتی اسلوب کے ذریعے حقائق کو بہت ہلکے پھلکے انداز میں ذہنوں میں بٹھادیا جاتا ہے۔

دعوت و تبلیغ میں آپ کا واسطہ ہر قسم کے لوگوں سے تھا،اس میں مہذب و غیر مہذب، عاقل و گنوار، خواص اور عامی، امیر اور غریب سب شامل تھے۔ لیکن ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے۔ نہایت تحمل سے گفتگو فرماتے، جس سے پتھر دل بھی موم ہو جاتے۔ کئی لوگ دین کی معلومات حاصل کرنے کے لیے حاضر خدمت ہوتے، کئی مسائل دین سمجھنے کے لیے مختلف قسم کے سوالات کرتے۔ کفار اور مشرکین محض مزاحمت و مخالفت کی وجہ سے ایسے حیلے بہانے پیش کرتے جن کا مقصد ترغیب، تحریص، یا غم و غصہ کا مظاہرہ کرنا ہوتا۔ استفسارات کرنے والوں میں اجنبی، تاجر، مزدور، کسان، رؤسا، خطیب، شاعر، غرض ہر حیثیت کے لوگ شامل ہوتے۔ آپؐ ہر ایک کی ذہنی سطح، حالات، استعداد اور ماحول کے مطابق گفتگو فرماتے۔ جس سے مدعو غور سے سنتا اور اس کا قلب و ذہن اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔

دعوت کے مکی دور میں جب آپؐ انفرادی طور پر دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کر رہے تھے تو اس موقع پر آپؐ باہمی گفتگو، اور سوال وجواب کا ہی اسلوب اختیار کرتے۔ آپ سوال وجواب اور بات چیت سے مخاطب کو متوجہ کرتے اور پھر اثناء گفتگو ہی اصل مدعا بیان کر دیتے۔ بنی عبد الاشہل کے أَبُو الْحَيْسَرِ، أَنَسُ بْنُ رَافِعٍ چند نوجوانوں کے ساتھ جب مکہ آئے تاکہ خزرج کے مقابلے میں قریش مکہ سے اپنی حمایت پر حلف لیں، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے اور صورت حال دریافت کی اور فرمایا:

هَلْ لَكُمْ فِي خَيْرٍ مِمَّا جِئْتُمْ لَهُ؟

"کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز نہ بتاؤں جس کے لیے تم یہاں آئے ہو"

فَقَالُوا لَهُ: وَمَا ذَاكَ؟

انہوں نے کہا کہ وہ بہتر چیز کیا ہے؟

قَالَ:

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

أَنَا رَسُولُ اللهِ بَعَثَنِي إِلَى الْعِبَادِ، أَدْعُوهُمْ إِلَى أَنْ يَعْبُدُوا اللهَ وَلَا يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، وَأَنْزَلَ عَلَيَّ الْكِتَابَ. قَالَ: ثُمَّ ذَكَرَ لَهُمُ الْإِسْلَامَ، وَتَلَا عَلَيْهِمُ الْقُرْآنَ۔[1]

"جب آپ ﷺ نے ان کے سامنے اسلام کی حقیقت بیان کی اور قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔

ان میں ایک نوجوان، ایاس بن معاذ کہنے لگا۔

اے قوم واقعی یہ بات اس کام سے بہتر ہے جس کے واسطے تم آئے ہو"؟

قریش کے جو وفود، افہام و تفہیم اور مصالحت کے لیے آتے، ان سے آپ باہمی گفتگو میں دعوت پیش کر دیتے۔

جب قریش مکہ نے ابوالولید (عتبہ)[2] کو آپ ﷺ کے پاس بھیجا۔ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور گفتگو کا آغاز کیا۔

فَقَامَ إِلَيْهِ عُتْبَةُ حَتّٰى جَلَسَ إِلَى رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم - فَقَالَ يَا ابْنَ أَخِي، إِنَّكَ مِنَّا حَيْثُ قَدْ عَلِمْتَ مِنَ السِّطَةِ فِي الْعَشِيرَةِ وَالْمَكَانِ فِي النَّسَبِ وَإِنَّكَ قَدْ أَتَيْتَ قَوْمَكَ بِأَمْرٍ عَظِيمٍ فَرَّقْتَ بِهِ جَمَاعَتَهُمْ وَسَفَّهْتَ بِهِ أَحْلَامَهُمْ وَعِبْتَ بِهِ آلِهَتَهُمْ وَدِينَهُمْ وَ كَفَّرْتَ بِهِ مَنْ مَضَى مِنْ آبَائِهِمْ فَاسْمَعْ مِنِّي أَعْرِضْ عَلَيْكَ أُمُورًا تَنْظُرُ فِيهَا لَعَلَّكَ تَقْبَلُ مِنْهَا بَعْضَهَا.

میرے بھتیجے تم ہمارے درمیان جس حیثیت کے مالک ہو وہ تمہارے علم میں ہے تم نے اپنی قوم کو ایک ایسے فتنے میں مبتلا کیا ہے، جس نے ان کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔ تم نے ان کو ان کے آباء کو بیوقوف واحمق ٹھہرایا ہے۔ ان کے مذہب کی توہین کی ہے۔ ان کے معبودوں کو برا بھلا کہا ہے۔ میں کچھ باتیں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں، شاید تمہیں کوئی بات قبول ہو"۔

1۔ أخرجه أحمد: ٤٢٧/٥، ابن هشام في السيرة: ٤٢٧/١، ٤٢٨، وقال الهيثمي في المجمع: ٣٦/٦ رواه أحمد والطبراني ورجاله ثقات وسنده حسن، انظر الفتح الرباني: ٢٦٦/٢، والبيهقي في الدلائل: ٤٢٠/٢-٤٢١، والطبري في التاريخ: ٣٥٢/٢-٣٥٣، جميعًا من طريق ابن إسحاق وقد صرح بالتحديث، وقال ابن حجر في الإصابة: ١٠٢/١ رواه جماعة عن ابن إسحاق هكذا وهو صحيح من حديثه.

2۔ هو أبو الوليد عتبة بن ربيعة بن عبد شمس. كبير قريش، وأحد ساداتها في الجاهليّة. كان خطيباً موصوفاً بالرأي والحلم والفضل، وتوسط للصلح يوم حرب الفجّار بين هوازن و كنانة. أدرك الإسلام فعاداه، وقُتل يوم بدر، سنة ثنتين من الهجرة. انظر: الأعلام، الزركلي ٢٠٠/٤.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قُلْ يَاأَبَا الْوَلِيدِ أَسْمَعْ

اس کے بعد اس نے آپ ﷺ کے سامنے دولت، بادشاہت اور علاج کا خرچہ کی پیشکش کی، آپؐ غور سے سنتے رہے۔ جب وہ خاموش ہو گیا تو فرمایا:

قَالَ أَقَدْ فَرَغْتَ يَاأَبَا الْوَلِيدِ؟

"تم نے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے؟"

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا، جو کچھ تم نے میری بابت کہا، اس میں ذرہ برابر صداقت نہیں اس کے بعد آپؐ نے سورۂ فصلت کی چند آیات پڑھیں اور سجدہ تلاوت فرمایا: تلاوت کے بعد آپؐ نے فرمایا"ابوالولید میں نے جو کچھ کہنا تھا۔ تم نے سن لیا۔ اب تمہاری مرضی"۔

اس گفتگو کا جو اس پر اثر ہوا اس کا اظہار انھوں نے یوں کیا۔"

قَدْ سَمِعْتُ قَوْلًا وَاللّٰهِ مَا سَمِعْت مِثْلَهُ قَطّ، وَاللّٰهِ مَا هُوَ بِالشّعْرِ وَلَا بِالسّحْرِ وَلَا بِالْكِهَانَةِ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ، أَطِيعُونِي وَاجْعَلُوهَا بِي، وَخَلّوا بَيْنَ هَذَا الرّجُلِ وَبَيْنَ مَا هُوَ فِيهِ فَاعْتَزِلُوهُ فَوَاللّٰهِ لَيَكُونَنّ لِقَوْلِهِ الّذِي سَمِعْتُ مِنْهُ نَبَأٌ عَظِيمٌ فَإِنْ تُصِبْهُ الْعَرَبُ فَقَدْ كُفِيتُمُوهُ بِغَيْرِكُمْ وَإِنْ يَظْهَرْ عَلَى الْعَرَبِ فَمُلْكُهُ مُلْكُكُمْ وَعِزّهُ عِزّكُمْ وَكُنْتُمْ أَسْعَدَ النّاسِ بِهِ[1]۔

(میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ بخدا نہ وہ شعر ہے نہ جادو، نہ منتر، نہ کہانت، میری بات مانو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے حال پر چھوڑ دو)

آپؐ کا عتبہ کو یہ کہنا کہ (قل یا ابا الولید اسمع) اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ نے اس کے سارے مطالبات اور پیش کش کو غور سے سنا اور جب وہ کہہ چکا اور آپؐ کے جواب کا منتظر ہوا تو پھر آپؐ نے فرمایا:

قد فرغت یا ابا الولید؟ جب اس نے مثبت جواب دیا اور اس کو متوجہ پایا تو آپؐ نے دین حق کا پیغام بہترین اسلوب میں اس کے سامنے رکھ دیا۔ جس سے اس کا متاثر ہونا یقینی تھا۔ اس باہمی بات چیت اور گفتگو سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ

---

[1] ۔ ابن هشام السيرة النبوية١/٢٩٢۔ السيرة لابن كثير، ١/٥٥٠، ذكر فى الخازن ٤/١٢٣، والطبرى ١٤/١٩٣، وتفسير المراغى، ١٤/١٦١وابن كثير ٢/٥٩0، الألوسى، ١٤/٢٥٤

آپ ؐ نے عتبہ کو عمدہ نام سے یاد کیا جو اس کو محبوب تھا اور قریش کے ہاں اس کی جو قدر و منزلت تھی اس کا لحاظ رکھا۔

دعوت کے اولین دور میں ہی جب آپ عکاظ، ذوالمجاز اور ذوالمجنہ کے بازاروں میں قبائل عرب کو دعوت و تبلیغ کر رہے تھے، اس دوران عمرو بن عبسہ نے آپ ؐ کو عکاظ میں تبلیغ کرتے دیکھ لیا، جس کے وہ کئی برسوں سے متلاشی تھے۔ آپ ﷺ کو قدرے اکیلے پایا تو آپ ﷺ کے قریب گئے اور گفتگو کا آغاز فرمایا:

عَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ [1] قَالَ: أَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ نَازِلٌ بِعُكَاظَ

فَقُلْتُ: مَا أَنْتَ؟

قَالَ: "أَنَا نَبِيٌّ".

قُلْتُ: وَمَا النَّبِيُّ؟

قَالَ: "رَسُولُ اللَّهِ".

قَالَ: آللَّهُ أَرْسَلَكَ؟

قَالَ: "نَعَمْ".

قُلْتُ: بِمَا أَرْسَلَكَ؟

قَالَ: "بِأَنْ نَعْبُدَ اللَّهَ، وَنُكَسِّرَ الْأَوْثَانَ، وَدَارَ الْأَوْثَانِ، وَنَوْصِلَ الْأَرْحَامَ".

قُلْتُ: نِعْمَ مَا أَرْسَلَكَ بِهِ.

قُلْتُ: فَمَنْ تَبِعَكَ عَلَى هَذَا؟

قَالَ: "عَبْدٌ وَحُرٌّ يَعْنِي أَبَا بَكْرٍ وَبِلَالًا - فَكَانَ عَمْرٌو يَقُولُ: رَأَيْتُنِي وَأَنَا رُبُعُ - أَوْ رَابِعُ الْإِسْلَامِ [2]

قُلْتُ: وَمَا الْإِسْلَامُ؟

قَالَ: «طِيبُ الْكَلَامِ، وَإِطْعَامُ الطَّعَامِ»

قَالَ: قُلْتُ: مَا الْإِيمَانُ؟

---

1 ۔ وعمرو بن عبسة أبو نجيح هو ابن عامر بن خالد بن غاضرة. أسلم قديماً، وكان يقال: هو ربع الإسلام، قدم المدينة بعد مضى بدر وأحد والخندق، ونزل بالشام. وانظر مستدرك الحاكم ٣/٦٥-٦٦، ٢٨٥، و"أسد الغابة" ٤/٢٥١-٢٥٢.

2 ۔ معمر بن أبي عمرو راشد الأزدى (المتوفى: ١٥٣هـ) الجامع ،المحقق: حبيب الرحمن الأعظمى ،المجلس العلمى بباكستان، ١٤٠٣هـ (الأجزاء ١٠، ١١ ۔ ومسند ابن أبي شيبة ۔ عدد الأجزاء: ٢۔

قَالَ: «الصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ»

قَالَ: قُلْتُ: فَأَيُّ الْإِيمَانِ أَفْضَلُ؟

قَالَ: «مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ»

قَالَ: قُلْتُ: أَيُّ الْإِيمَانِ أَفْضَلُ؟

قَالَ: «خُلُقٌ حَسَنٌ»[1]۔

عمرو: آپ ﷺ کون ہیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: میں اللہ کا نبی ہوں۔

عمرو: کیا آپ کو اللہ نے مبعوث کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: بے شک میں خدائے واحد ولاشریک کا فرستادہ ہوں۔

عمرو: آپ ﷺ کی دعوت؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: خدائے تعالیٰ پر ایمان کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بت پرستی سے اجتناب اور اپنوں سے محبت۔

عمرو: کوئی شخص آپ ﷺ پر ایمان بھی لایا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ہاں، ایمان لانے والوں میں آزاد۔(ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ایک غلام (بلال رضی اللہ عنہ) دونوں شامل ہیں۔

عمرو: اسلام کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ہر شخص کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، مساکین سے اچھا سلوک کرنا۔

عمرو: اور ایمان کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اللہ کی راہ میں صبر ورضا سے کام لینا۔

عمرو: اسلام کا سب سے اعلیٰ درجہ کون سا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: نہ کسی کو زبان سے دکھ دو، نہ کسی کو بدنی ایذا پہنچائے۔

1۔ مسند الإمام أحمد بن حنبل، رقم الحديث: ۱۸۰۲۷

عمرو : ایمان کی رفعت کی کیا علامت ہے؟

رسول اللہ ﷺ: اخلاق حسنہ۔

عمرو: یا رسول اللہ ﷺ، میں آپؐ پر ایمان لاتا ہوں۔ آپ کی تعلیمات پر میرا ایمان ہے۔

اس مکالمے سے جہاں داعی اور مدعو کی ہمہ تن توجہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہاں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ مدعو کی نفسیات، حالات اور فکری و نظری رعایت کا کس قدر خیال فرماتے اور دعوت کو اس وقت جو صورت حال پیش تھی، اس کے مطابق آپؐ نے ان کے سوالات کے جوابات دیئے۔ جب انہوں نے ایمان کی بابت سوال کیا تو ایمان کا معنی و مفہوم آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ توحید پر استقامت اور اس راہ میں جو مشکلات و تکالیف در پیش ہیں ان پر صبر سے کام لینا ہے۔

انہی حضرت عمرو بن عبسہؓ سے ایک حدیث مروی ہے، جس میں ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کئے اور یہ استفسارات تقریباً وہی ہیں جو خود حضرت عمرو بن عبسہؓ نے مکی عہد میں دعوت نبویؐ کے پہلے دور میں آپؐ سے کیے تھے۔ ان سوالات کے جوابات آپؐ نے مخاطب کے حالات، نفسیات اور اس وقت کی "دعوتی صورتحال" کے مطابق دیئے۔ روایت کرتے ہیں کہ:

قَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللهِ، مَا الْإِسْلَامُ؟

قَالَ: "أَنْ يُسْلِمَ قَلْبُكَ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَأَنْ يَسْلَمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِكَ وَيَدِكَ".

قَالَ: فَأَيُّ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ؟

قَالَ: "الْإِيمَانُ".

قَالَ: وَمَا الْإِيمَانُ؟

قَالَ: "تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ، وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ".

قَالَ: فَأَيُّ الْإِيمَانِ أَفْضَلُ؟

قَالَ: "الْهِجْرَةُ".

قَالَ: فَمَا الْهِجْرَةُ؟

قَالَ: "تَهْجُرُ السُّوءَ".

قَالَ: فَأَيُّ الْهِجْرَةِ أَفْضَلُ؟

قَالَ: "الْجِهَادُ".

قَالَ: وَمَا الْجِهَادُ؟

قَالَ: "أَنْ تُقَاتِلَ الْكُفَّارَ إِذَا لَقِيتَهُمْ"،

قَالَ: فَأَيُّ الْجِهَادِ أَفْضَلُ؟

قَالَ: "مَنْ عُقِرَ جَوَادُهُ وَأُهْرِيقَ دَمُهُ"، قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "ثُمَّ عَمَلَانِ هُمَا أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ إِلَّا مَنْ عَمِلَ بِمِثْلِهِمَا: حَجَّةٌ مَبْرُورَةٌ أَوْ عُمْرَةٌ"[1]

ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور دریافت کیا۔

وہ شخص: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کیا چیز ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: تیرا قلب اللہ کے سامنے جھک جائے اور تیری زبان اور ہاتھ کی ایذا رسانی سے تمام مسلمان محفوظ رہیں۔

وہ شخص: اے اللہ کے نبیؐ اسلام کا افضل ترین جزو کون سا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ایمان۔

وہ شخص: ایمان کی حقیقت کیا ہے؟

رسول اللہ ﷺ: یہ کہ تو اللہ تعالی پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، بعث بعد الموت پر یقین رکھے۔ اس کے رسولوں پر دل سے ایمان لائے۔

وہ شخص: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کی بہتر خصوصیت کون سی ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ہجرت۔

وہ شخص: ہجرت کسے کہتے ہیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یہ کہ تو برے اعمال کو ترک کردے۔

وہ شخص: بہترین ہجرت کے متعلق ارشاد فرمایئے۔

---

[1]۔ حديث صحيح رجاله ثقات رجال الشيخين غير صحابيه فمن رجال مسلم إلا أن أبا قلابة- وهو عبد الله بن زيد الجرمي- لم يدرك عمرو بن عبسة. عبد الرزاق: "مصنف" عبد الرزاق برقم (۲۰۱۰۷)، ومن طريقه أخرجه عبد بن حميد في "المنتخب" (۳۰۱) وأورده الهيثمي في "المجمع" ۵۹/۱ و۲۰۷/۳، رواه أحمد والطبراني في "الكبير" بنحوه، ورجاله ثقات.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: جہاد۔ کافروں کے خلاف دل وجان سے جہاد کرنا۔

وہ شخص: اچھا تو بہتر جہاد کون سا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ایسے شخص کا جہاد کہ اس راہ میں جس کی سواری بھی زخمی ہو اور وہ بھی راہ حق میں مارا جائے۔اس کے علاوہ دو عمدہ عمل یہ بھی ہیں۔ حج۔ جس کے بعد گناہوں کا ارتکاب نہ کرے اور عمرہ کی ادائیگی۔

یہ تمام سوالات وہی ہیں جو خود حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے دعوت کے خفیہ دور میں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات پر کیے تھے۔ آپؐ نے اس وقت ان کے جوابات دیئے تھے اور اب جب عمرو بن عبسہؓ مدینہ میں آپؐ کے پاس حاضر ہوئے اور مختلف لوگ آپؐ سے اسلام اور دعوت حق کے بارے میں استفسارات کرتے تو وہ ان کو بغور سنتے۔ چنانچہ مذکورہ مکالمہ بھی انہوں نے آپ ﷺ سے سنا اور پھر اس کو روایت بھی کیا، کیونکہ اس میں جو سوالات ہوئے وہ آپؐ کے علمی ذوق کے مطابق بھی تھے۔ مگر اس مرحلے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سوالات کے جوابات قدرے مختلف دیئے۔اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ آپؐ مدعو کی نفسیات، علاقائی صورتحال اور ذہنی استعداد کا کس قدر خیال فرماتے تھے۔

انصار مدینہ سے عقبہ کی گھاٹی میں جو پہلی ملاقات ہوئی، اس میں آپؐ کا انداز بات چیت کا ہی تھا۔ جب آپؐ ان کے پڑاؤ پر تشریف لے گئے تو فرمایا:

مَنۡ أَنۡتُمۡ ؟

قَالُوا: نَفَرٌ مِنَ الۡخَزۡرَجِ.

قَالَ: "أَمِنۡ مَوَالِي يَهُودَ؟"

قَالُوا: نَعَمۡ.

قَالَ: "أَفَلَا تَجۡلِسُونَ أُكَلِّمُكُمۡ".

قَالُوا: بَلَى.

فَجَلَسُوا مَعَهُ فَدَعَاهُمۡ إِلَى اللهِ، وَعَرَضَ عَلَيۡهِمُ الۡإِسۡلَامَ وَتَلَا عَلَيۡهِمُ الۡقُرۡآنَ [1]۔

1۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۴۲۸/۱

پھر آپؐ ان کے سامنے بیٹھ گئے اور جب ان کو اچھی طرح مانوس کر لیا اور ان کو اپنی طرف متوجہ پایا تو پیغام حق کی دعوت دی اور جس کو انہوں نے فوراً قبول کر لیا مدنی دور میں جب دعوت پورے جزیرۃ نما عرب میں پھیل گئی اور مختلف قبائل سے وفود آپؐ کے پاس بیعت کے لیے حاضر ہونے لگے تو ان دعوتی و تبلیغی وفود سے عموماً آپؐ باہمی گفتگو کا اسلوب ہی اختیار فرماتے ان کے بعض استفسارات کا جواب دیتے ہوئے انہی سے سوال کر کے جواب طلب فرماتے اور اگر وہ جواب دین وشریعت کے مزاج کے مطابق ہوتا تو اس کی توثیق فرما دیتے۔ اس طرح سامع اور مدعو متوجہ رہتا اور بات کو پورے ذوق وشوق سے سنتا۔ ان وفود میں جن سے آپؐ نے مکالماتی اسلوب اختیار فرمائے۔ ان میں وفد عبدالقیس، وفد بنی طے، وفد ابورزین عقلی، وفد معاویہ بن حیدہ، وفد ازدی، وفد بنو حارث، وفد بنو ثقیف وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں مشہور مکالمہ بنو سعد سے تعلق رکھنے والے ضمام بن ثعلبہؓ کا ہے۔

اس مکالمے سے جہاں آپؐ کے عفو ودر گزر، شفقت ورافت، حلم اور تواضع کے اخلاق حسنہ کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہاں ایک بدوی مزاج اور نفسیات کی بھی عکاسی ہوتی ہے کہ مدعو ادب اور لحاظ کے بغیر، اور نہایت درشت لہجے اور اکھڑپن میں گفتگو کرتا ہے اور آغاز میں ہی کہہ دیا:

إِنِّي سَائِلُكَ فَمُشَدِّدٌ عَلَيْكَ فِي الْمَسْأَلَةِ فَلَا تَجِدْ عَلَيَّ فِي نَفْسِكَ[1] کہ میں آپؐ سے سوال کروں گا۔ میرا لہجہ سخت اور درشت ہے۔ سختی سے بات کروں گا۔ آپؐ اسے محسوس نہ کریں۔ پھر وہ سوال کرتا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت اطمینان سے اس کے ہر سوال کا جواب مرحمت فرماتے ہیں۔ حالانکہ پورے مکالمے میں سائل کا لہجہ درشت رہتا ہے۔ تعلیم اور تحمل کا یہ طریقہ اس طرح کارگر ثابت ہوا کہ وہ شخص بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

"اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو صادق نبی بنایا ہے، میں آپؐ کی بتائی ہوئی باتوں میں کمی بیشی نہیں کروں گا۔ میں آپؐ کا دین قبول کر چکا ہوں۔ میں اپنی قوم کا قاصد ہوں، میرا نام ضمام بن ثعلبہؓ ہے"[2]۔

---

[1]- ابن ماجه أبو عبد الله، محمد بن يزيد القزويني، (المتوفى: ٢٧٣هـ) سنن ابن ماجه. كِتَابُ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ، وَالسُّنَّةُ فِيهَا. بَابُ مَا جَاءَ فِي فَرْضِ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ وَالْمُحَافَظَةِ عَلَيْهَا

[2]- أحمد بن محمد بن حنبل، المسند ج ٤ ص حدیث کے الفاظ: حَتَّى إِذَا فَرَغَ قَالَ: فَإِنِّي أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلا اللهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ، وَسَأُؤَدِّي هَذِهِ الْفَرَائِضَ، وَأَجْتَنِبُ مَا نَهَيْتَنِي عَنْهُ، ثُمَّ لَا أَزِيدُ وَلَا أَنْقُصُ، قَالَ: ثُمَّ انْصَرَفَ رَاجِعًا إِلَى بَعِيرِهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ وَلَّى: " إِنْ يَصْدُقْ ذُو الْعَقِيصَتَيْنِ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ"

صحابہ کرامؓ کی تعلیم و تربیت میں بھی آپؐ بات چیت اور مکالمے کا انداز اختیار کرتے تھے۔ مثلاً حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہی سواری پر سوار تھا اور میرے اور آپؐ کے درمیان کجاوے کے پچھلے حصے کے سوا اور کوئی چیز حائل نہ تھی۔ (یعنی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بالکل ملا ہوا بیٹھا) کہ چلتے چلتے آپؐ نے مجھے پکارا اور فرمایا:

يَامُعَاذُبْنُ جَبَلٍ " قَالَ: لَبَّيْكَ يَارَسُولَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ، ثُمَّ سَارَ سَاعَةً،

ثُمَّ قَالَ: " يَامُعَاذُبْنَ جَبَلٍ "

قَالَ: لَبَّيْكَ يَارَسُولَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ، ثُمَّ سَارَ سَاعَةً،

فقَالَ: " يَامُعَاذُبْنَ جَبَلٍ "

قَالَ: لَبَّيْكَ يَارَسُولَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ،

قَالَ: " هَلْ تَدْرِي مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ؟ "

قَالَ: اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ،

قَالَ: " فَإِنَّ حَقَّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ أَنْ يَعْبُدُوهُ وَلَا يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا "،

قَالَ: " فَهَلْ تَدْرِي مَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ إِذَا هُمْ فَعَلُوا ذَلِكَ؟ "

قَالَ: اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ،

قَالَ: " فَإِنَّ حَقَّهُمْ عَلَى اللّٰهِ أَنْ لَا يُعَذِّبَهُمْ "[1]۔

معاذ بن جبل۔ میں نے عرض کیا، میں حاضر ہوں، ارشاد فرمائیں، پھر کچھ دیر چلنے کے بعد آپؐ نے فرمایا: معاذ بن جبل میں نے عرض کیا۔ لبیک یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسعدیک، پھر کچھ چلنے کے بعد آپؐ نے فرمایا: معاذ بن جبل میں نے عرض کیا، لبیک یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسعدیک۔ (اس تیسری دفعہ) آپؐ نے ارشاد فرمایا:

تم جانتے ہو کہ بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے؟

میں نے عرض کیا۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو زیادہ علم ہے۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا: پس اللہ تعالی کا حق اس کے بندوں پے یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں۔

1۔ البخاری، محمد بن إسماعيل، الجامع الصحيح كِتَاب بَدْءِ الْوَحِي باب مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللّٰهِ.

اس کے بعد کچھ دیر چلے اور پھر فرمایا:

تم جانتے ہو کہ جب بندے اللہ کا یہ حق ادا کریں، تو پھر اللہ پر ان کا کیا حق ہے؟

میں نے عرض کیا۔ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو زیادہ علم ہے۔

آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا: انہیں عذاب میں نہ ڈالے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد حضرت معاذ بن جبلؓ کو تین دفعہ مخاطب کیا اور پھر جو کچھ آپؐ فرمانا چاہتے تھے اس کا ایک حصہ آپؐ نے تیسری دفعہ میں ارشاد فرمایا اور دوسرا جز کچھ دیر توقف کے بعد چوتھی دفعہ میں فرمایا، اس کی توجیہہ میں محدثین اور شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ مخاطب کو متوجہ کرنے اور اس بات کی صحیح پہچان کرانے کے لیے یہ اسلوب آپؐ اختیار فرماتے تھے۔ یہاں آپ حضرت معاذؓ کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ فرمانا چاہتے تھے تاکہ وہ ہمہ تن گوش ہو کر پوری رغبت و توجہ اور غور و تامل کے ساتھ آپؐ کا ارشاد سنیں۔

سوال وجواب اور مکالمات کی اثر انگیزی مسلم ہے۔ اس پیرائیہ بیان میں جو بات کی جائے گی وہ ضرور اثر کرے گی اور تادیر سامع کے ذہن و قلب پر اس کے اثرات قائم رہیں گے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ رب العزت نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو آپؐ کے پاس سائل بنا کر بھیجا اور وہ حجۃ الوداع سے کچھ عرصہ پہلے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جہاں ان کی متعلمانہ آداب واستفسارات سے دعوتی و تربیتی اصولوں کو اخذ کیا جاسکتا ہے۔ وہاں آپؐ کے جوابات سے کئی ایک نفسیاتی و تربیتی اصول اخذ ہوتے ہیں۔ انہوں نے اسلام، ایمان، احسان اور قیامت کے بارے میں سوالات کیے اور جہاں امثال و تمثیل کی ضرورت پیش آئی آپؐ نے بات کو واضح کرنے کے لیے اس کو بھی اختیار فرمایا۔ صحابہ کرامؓ اس اجنبی سائل کے سوالات اور آپؐ کے جوابات بڑے غور اور توجہ سے سنتے رہے اور جب سائل چلا گیا تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

هَذَا جِبْرِيلُ جَاءَ لِيُعَلِّمَ النَّاسَ دِينَهُم [1]۔

یہ جبرائیل علیہ السلام تھے جو لوگوں کو دین سکھانے تشریف لائے تھے۔

---

[1] مسلم بن الحجاج القشيري ،الجامع الصحح ،كِتَابُ الإِيمَانِ باب بيان الإيمان والإسلام والإحسانوأشراط الساعة

ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

يَا عُمَرُ أَتَدْرِي مَنِ السَّائِلُ؟

اور پھر آپؐ نے فرمایا:

فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ [1]۔

اور ایک روایت میں ہے کہ:

أَرَادَ أَنْ تَعَلَّمُوا إِذْ لَمْ تَسْأَلُوا۔ [2]

کہ جب تم نے سوال نہ کیا، اس لیے جبرائیل علیہ السلام نے خود یہ سوالات کیے کہ تم اپنا دین سیکھ لو۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ مخاطب کی عقل وسمجھ اور مزاجی کیفیت کے پیش نظر سوال وجواب کی صورت میں مخاطب کو سمجھاتے اور تربیت فرماتے تھے یہ طریقہ نہایت مؤثر ثابت ہوتا تھا تاکہ خوبصورت انداز میں غلط بات کو اس کے دل سے نکال دیں، یا حق بات کو جس کا مخاطب کی حالت اور عادت کے پیش نظر اس کے دل سے نکالنا آسان ہوتا، بڑی حکمت عملی کے ساتھ اس غلط بات کی نفرت اس کے دل میں بٹھادیتے تھے، اس کی ایک حیرت انگیز مثال درج ذیل ہے:

امام احمدؒ اور طبرانیؒ نے حضرت امامہ باہلیؓ سے روایت کی ہے کہ "ایک نوجوان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے زنا کی اجازت دے دیجیے یہ سنتے ہی حاضرین اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کو ڈانٹا کہ (یہ کیا بدتمیزی کی بات کررہے ہو) چپ رہو لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قریب آجاؤ، چنانچہ وہ شخص آپؐ سے قریب آکر بیٹھ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا یہ بتاؤ کیا تم اپنی ماں کے لیے زنا پسند کرتے ہو؟ اس نے برجستہ کہا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ پر قربان جاؤں، خدا کی قسم اس کو قطعاً نہیں پسند کروں گا، تو آپؐ نے فرمایا ایسے ہی دوسرے لوگ بھی اپنی ماں کے لیے زنا کو نہیں پسند کرتے، آپؐ نے پھر سوال فرمایا! کیا تم اپنی بیٹی کے لیے زنا پسند کروگے؟ پھر اس نے جواب دیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر قربان

---

[1] ۔ ایضاً۔

[2] ۔ ایضاً۔

جاؤں میں اس کو کسی طرح گوارہ نہیں سکتا، آپؐ نے فرمایا تولوگ بھی اس کو اپنی بیٹیوں کے لیے نہیں پسند کرتے، آپؐ نے پھر پوچھا بتاؤ کیا تم اس کو اپنی بہن کے لیے پسند کروگے؟ اس نے عرض کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر قربان جاؤں، میں اس کو کسی طرح نہیں گوارا کر سکتا تو آپؐ نے فرمایا اسی طرح دوسرے لوگ بھی اپنی بہنوں کے لیے اس کو نہیں پسند کریں گے۔ آپؐ نے پھر سوال کیا اچھا بتاؤ اپنی پھوپھی کے لیے اس کو پسند کروگے؟ اس نے پھر وہی جواب دیا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر قربان جاؤں خدا کی قسم میں اسے کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ آپؐ نے فرمایا تو ایسے ہی دوسرے لوگ بھی اپنی پھوپھیوں کے لیے اس کو نہیں پسند کرتے۔

آپؐ نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پھر پوچھا کیا تم اپنی خالہ کے لیے اس کو پسند کروگے؟ اس نے جواب دیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر قربان جاؤں میں اس کو کیونکر گوارا کر سکتا ہوں آپؐ نے فرمایا تو دوسرے لوگ بھی اپنی خالاؤں کے لیے اس کو نہیں پسند کر سکتے، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ہاتھ رکھا، اور دعا فرمائی اے اللہ تو اس کے گناہ کو معاف فرمادے، دل کو پاک کردے، شرم گاہ کو محفوظ رکھ، راوی کا بیان ہے کہ وہ نوجوان اس کے بعد کسی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔[1]

غور فرمایئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نوجوان کے دل سے زنا کی علت کو کس حکمت عملی سے جڑ سے اکھاڑ دیا، اور یہ سب کرشمہ تھا نفسیاتی طور پر اس کے دل میں مثالوں کے ذریعہ زنا کی برائی کو بٹھانے کے لیے، اس موقع پر آپؐ نے زنا کی قباحت و برائی اور زانی اور زانیہ کی وعید میں جو آیات نازل ہوئی ہیں ان کا ذکر نہیں فرمایا اس خیال سے کہ اس وقت اس نوجوان کے ذہن کو اس طرح جھٹکا دے کر اور اس کے فہم وادراک کو بیدار کر کے نصیحت کا یہ انداز وطریقہ زنا کی برائی کو اس کے دل سے زیادہ نکالنے والا ہے۔

اس پورے واقعہ میں اساتذہ اور داعیوں کے لیے کتنی بڑی رہنمائی ہے کہ حاضرین کے ماحول میں ان کی ذہنی سطح کا خیال رکھتے ہوئے ان کی سطح کے اسلوب وانداز میں بات سمجھائی جائے، جیسے اس نوجوان کے سمجھانے کی مثال اوپر گزری کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلم وتدبر سے کام لیتے ہوئے کس خوبی سے اس کے دل میں زنا کی شناعت بٹھادی اور اس کو اس گناہ عظیم سے بچالیا۔

---

[1] - مسند الإمام أحمد بن حنبل، رقم الحديث: ٢١٦٢٨

کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ سے کسی چیز کے بارے میں پوچھتے تھے حالانکہ آپ اس بات کو جانتے تھے۔ ان سے سوالات کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ ان کی ذہانت اور قوت فکر کو بیدار کریں، دماغ کو حرکت دیں اور گفتگو کے انداز میں ان کو جام پیلائیں تاکہ یہ اندازہ لگاسکیں کہ ان کی قبولِ علم کی صلاحیت کتنی ہے"۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ایک روز ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ کھجور کا مغز لایا گیا، آپ نے کھجور کھاتے ہوئے فرمایا، درختوں میں ایک ایسا ہرا بھرا درخت ہے اس کی خیر و برکت اور نفع مسلمان کی خیر و برکت اور نفع کی طرح ہے۔ اس کا پتہ نہ گرتا ہے نہ ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا رہتا ہے۔ وہ مسلمان کی مثل ہے تم بتاؤ وہ کون سا درخت ہے؟

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ لوگوں کے ذہن صحرا کے درختوں کی سوچ میں پڑ گئے کہ ایسا کون سا درخت ہو سکتا ہے۔ کسی نے کسی درخت کا نام لیا کسی نے کسی درخت کا، میرے دل میں آیا کہ یہ کھجور کا درخت ہو سکتا ہے میرے دل میں آیا کہ کہوں لیکن پھر میں نے دیکھا کہ مجلس میں معمر لوگ موجود ہیں۔ لہٰذا کہنے میں لحاظ معلوم ہوا۔۔۔۔۔ حاضرین نے عرض کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ ہی بتائیں کہ وہ کون سا درخت ہے تو آپؐ نے فرمایا یہ کھجور کا درخت ہے۔[1]

داعی اور معلم کو چاہیے کہ عام حاضرین سے سوال کر کے ان کی سمجھ اور فہم کا اندازہ اور سوچنے اور توجہ کرنے کا شوق دلائے اور پھر جو بات وہ نہ سمجھ سکیں ان کی وضاحت کرے اور ان کو سمجھائے۔ دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ علم کو سمجھنے پر آمادہ کیا جائے۔ مثالیں اور تشبیہات بیان کر کے ان کی سمجھ کو بڑھایا جائے معانی کا نقشہ سامنے کر دیا جائے تاکہ وہ ذہن میں بیٹھ جائے اور کسی ایک ہی واقعہ پر قوت فکر کو مذکور کر دیا جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی بیشتر احادیث مکالماتی اسلوب پر مبنی ہیں۔ آپ کے مکالمات سے کتب تاریخ و سیرت اور کتب حدیث بھری پڑی ہیں۔ بخاری اور مسلم میں تقریباً 315 مکالمات ہیں جو متفق علیہ احادیث کا درجہ رکھتے ہیں۔ نیز حدیث کا ایک مفہوم ہی باہمی کلام ہے۔ آپ نے ہر نوع کے افراد سے مکالمات کئے ہیں ان میں دوست دشمن، گھر والے اور ناواقف بچے، بوڑھے، عورتیں مرد سب شامل ہیں آپ کے مکالمات کے موضوعات کا احاطہ ہی ناممکن ہے شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس کا دعوت دین سے تعلق ہے اور آپ نے اس پر مکالمہ نہ کیا ہو۔

---

[1]۔ البخاری، محمد بن إسماعيل، الجامع الصحيح كِتَابُ العِلْمِ بَابُ الحَيَاءِ فِي العِلْمِ

7۔ مکالمہ کے اثرات ونتائج

دعوت دین کے قرآنی اصول اس قدر جامع ومانع ہیں کہ ان کے مثبت اثرات ونتائج کا مرتب ہونا امر واقع ہے۔ مجادلہ بھی انہی میں سے ایک خوبصورت اصول ہے۔ دعوت کے مراحل میں جب مجادلہ کی ضرورت پڑتی ہے تو اسے قرآنی احکام وآداب کے ساتھ نبھانا داعی کی ذمہ داری ہے۔ عموماً ایسے مواقع پر جذبات غالب آجاتے ہیں، عقل منفی زاویوں کا رخ اختیار کرنے لگتی ہے اور انسان اپنی فطری بے صبری اور انتقام پسندی پر اتر آتا ہے۔ لیکن اصل مرد مجاہد وہ ہے جو ایسے نازک موقع پر دعوت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے قرآنی ہدایت کو پیش نظر رکھے، جذبات میں قابو میں رکھتے ہوئے ٹھنڈے دماغ سے کام لے اور پوری استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجادلہ احسن کے ذریعے دعوت کے مطلوبہ نتائج تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ عصر حاضر میں مجادلہ کے ممکنہ اثرات ونتائج کیا ہو سکتے ہیں؟ ذیل میں اس کا جائزہ تحریر کیا جاتا ہے۔

7.1۔ مسلم نظریات کا فروغ

مجادلہ کے بنیادی اثرات ونتائج میں سے ایک مسلم نظریات کا فروغ ہے کیونکہ مجادلہ کا دارومدار ٹھوس اور واضح دلائل پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر مخاطب عقل سلیم کا حامل ہو تو مجادلہ کے نتیجے میں ایسے نظریات کو تسلیم کرنے میں پاک محسوس نہیں کرتا جو مدلل اور مسلم ہوں۔ قرآن کریم بھی اہل ایمان کو پختہ اور صحیح بات کہنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا﴾[1]

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہا کرو اور ہمیشہ سچی (اور درست) بات کہا کرو۔)

حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ سے بھی یہی راہنمائی ملتی ہے کہ ہمیشہ درست اور صحیح بات کہی جائے۔ دین اسلام کے جملہ نظریات حقیقت پر مبنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے بنیادی نظریات کو ہر دور میں عالم انسانیت کی اکثریت نے سراہا اور اُسے قابل تقلید قرار دیا۔ چنانچہ داعی کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مضبوط دلائل سے مخاطب کے باطل نظریات کی تردید کرے۔ تاہم مخاطب کی نفسیات، اس کے مخصوص ماحول، اس کی ذہنی کیفیت اور قبول حق کی صلاحیت

---

[1]۔ سورۃ الاحزاب ۳۳: ۷۰

جیسے اُمور بھی پیش نظر رکھے، اُس کے ساتھ شفقت اور ہمدردی کا مظاہرہ کرے تاکہ اُسے اپنائیت کو احساس ہو اور وہ ذہنی و قلبی طور پر قبول حق کی طرف مائل ہو جائے۔

7.2۔ مشترک اقدار اور فکری ہم آہنگی

قرآن کریم نے مجادلہ کے جو اصول متعین کیے ہیں اُن میں اہل کتاب کے ساتھ مشترک اقدار پر فکری ہم آہنگی اور باہمی قربت کی ترغیب دی گئی ہے اور یوں انہیں اسلام کے قریب لانے کا ایک طریق وضع کیا گیا ہے۔ آج کے دور میں بھی اگر اُنہی اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے اور بین المذاہب ہم آہنگی کی فضا قائم کی جائے تو بہت سے عالمی مسائل خود بخود حل ہو سکتے ہیں اور اہل اسلام کو درپیش خطرات کا ازالہ کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے۔ اگر اس کام کو مزید وسعت دی جائے اور کتب سماوی کی مشترکہ تعلیمات کو انتہائی تحقیق اور عرق ریزی کے ساتھ یکجا کر دیا جائے اور مسلمان، عیسائی اور یہودی علماء باہمی اتفاق رائے سے اُس لٹریچر کو فروغ دیں تو یقیناً اس کے مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ کیونکہ مذہب کو بہر حال ہر قوم میں بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور اس کے اثرات سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام ہائے حیات پر مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ بین المذاہب ہم آہنگی آفاقی امن اور عالم رواداری کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔

7.3۔ بین الاقوامی، سیاسی و ثقافتی روابط کا استحکام اور تہذیبی تصادم کا خاتمہ

موجودہ جدید سیاسی فکر نے بین الاقوامی تعلقات اور بین الملکی روابط ثقافت کو قرار دیا ہے۔ ہر قوم کی اپنی نمایاں اور انفرادی ثقافتی شناخت ہوتی ہے۔ للذا جہاں کہیں ثقافتی اقدار میں اختلاف و تضاد واقع ہو گا، ثقافتی شناخت کو ترجیح دینے کے ناطے یہ تصادم پر منتج ہو گا۔ ثقافت کے اس کردار کا ذکر کرتے ہوئے ایک مغربی مصنف لکھتا ہے:

Toynbee's influence on Huntington is clear throughout his treatment of what civilization are and why thay are importent. Civilizations, Huntington explains, are broad cultural entities that unite individuals around common mores, traditions and institutions. As such, thay are "the most enduring of human associations", and are therefore the foundations of long-term historical continuity because civilizations are, after blood and tribe, the most important factors binding individuals together into

potential political identities, thay are naturally the most important actors in the field of global politics.(1)

”تہذیبوں کی نوعیت اور ان کی اہمیت بیان کرنے کے پورے عمل کے دوران Huntington پر ٹوائن بی کا اثر بڑا واضح ہے۔ Huntington کی وضاحت کے مطابق تہذیبیں وسیع ثقافتی حقیقتیں ہیں جو افراد کو مشترک سماجی اقدار طور طریقوں، روایات اور اداروں پر متحد کرتی ہیں۔ اس طرح سے یہ انسانی ہم آہنگی اور وابستگی کی دیرپا بنیادیں ہیں اور اس لیے یہ طویل المیعاد تاریخی تسلسل کی بنیاد بھی ہیں۔ چونکہ تہذیبیں خون اور قبیلے کے رشتے کے بعد افراد کو مخفی سیاسی شناخت میں منسلک کرنے والی سب سے مؤثر ترین عوامل ہیں۔ سو قدرتی طور پر یہ عالمی سیاست کے میدان میں بہت ہی اہم عوامل ہیں۔“

تاریخی ارتقا پر نظر رکھنے والے اہل علم سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ مغرب کے تصادم کا یہ تصور نیا نہیں بلکہ صدیوں پرانا ہے۔ ایک اور مغربی مفکر لکھتا ہے:

The clash thesis is not novel. It draws upon tradition that emerged in Europe at the birth of the nation-state and accompanied European expansion across the world. This was the idea that, notwithstanding the intense rivalry between such states, people of Europe held in common attributes superior to those of all otherhuman beings. Expressed in the "civilizing" missions of specifics states these gave meaning to colonialism and had the effect of complementing ideologies of nation which were of immense importance in cohering unstable domestic populations. The idea of a civilizing Europe was as important "at home" as it was abroad: it was indeed a "security" measure much like Huntington's defense of U.S. interests in the 1990s. Here "civilization" has an ideological function in the classical sense: it is part of a body ideas which endorse relations of inequality and of domination of a majority of people by a small number of others(1) .

”تصادم کا نظریہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس کی بنیاد اس روایت پر ہے جو یورپ میں قومی سیاست کی ابتدا سے وجود میں آئی اور دنیا پر یورپی توسیع کے ساتھ بڑھتی گئی۔ یہ تصور یوں تھا کہ ان ریاستوں کے مابین شدید رقابت کے

باوجود یورپ کے لوگوں نے بقیہ عالم انسانیت سے کچھ فائق خصوصیات اختیار کرلیں۔ کچھ خاص ریاستوں کے تہذیبی مشن کے اظہار کے مطابق انہوں نے نوآبادیت کو معنی دیا اور قوم کی تکمیل کرنے والے نظریات پر اس کا اثر ہوا جو کہ غیر مستقل مقامی آبادی کے باہمی ربط کے قیام میں نمایاں اہمیت کا حامل تھا۔ ایک تہذیب پذیر یورپ کا تصور جتنا اندرون ملک عام تھا اتنا بیرون ملک بھی۔ یہ بلاشبہ ایک طرح کا حفاظتی اقدام تھا۔ جیسا کہ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں Huntington نے امریکی مفادات کا دفاع کیا۔ یہاں کلاسیکل معنوں میں تہذیب کا ایک نظریاتی عمل ہے۔ یہ اُن تصورات پر مشتمل ہے جو غیر مساویانہ تعلقات اور اکثریتی آبادی پر دوسری قوم کے چند لوگوں کے غلبہ کی توثیق کرتے ہیں۔“

اندریں حالات یہ اندازہ کرنا کوئی مشکل امر نہیں کہ اگر موجودہ عالمی حالات آگے بڑھتے رہے تو اس عالمی تصادم کا انجام کیا ہوگا۔ آج انسانیت کو اپنی بقا کے لیے ایک ایسے عالمی نظام کی ضرورت ہے جس کی بنیاد تصادم کی بجائے مجادلہ ہو اور یہ ضرورت صرف اسلام پوری کر سکتا ہے جس نے پہلے دن سے (تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ) کا منشور عطا کر کے ایک وسیع بنیاد فراہم کر دی۔

7.4۔عالمی برداشت کے کلچر کا فروغ

دور حاضر کی جدید دنیا مختلف النوع انتہاپسندی کے رجحانات کے تحت برداشت کے کلچر سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ ان رجحانات میں ایک بنیاد پرستی بھی ہے جس کا سبب سیاسی، اقتصادی، سماجی اور مذہبی محرومیاں ہیں۔ تاہم یہ امر ایک ایسے سے کم نہیں کہ بین الاقوامی سطح پر انسانیت کو درپیش مسائل کا صحیح تجزیہ کرنے کی بجائے اسلام کو ثقافتی نزاع کا سبب قرار دیا جا رہا ہے۔ ایک مغربی مصنف لکھتا ہے:

In much of the post-cold war discourse on cultural conflict, it was Islam that came into the frame. Islam, seem to represent a particular source of conflict both as a homeland and as a diaspora. Certainly, Islamic peoples were locked in violent conflicts against adjoining civilizations and secular states across the Balkans, West and East Africa, the Middle East, the Caucasus, Central Asia, India, Indonesia, and the Philippines, with their efforts to promulgate Islamic law a particularly explosive issue(1) .

’’سرد جنگ کے بعد ثقافتی نزاع پر ہونے والے مباحثے میں اسلام ہی مرکز توجہ بنا۔ اسلام اندرون ملک اور ممالک سے باہر آبادی میں تنازع کے سبب کے طور پر سامنے آیا۔ یقیناً مسلمان متصل تہذیبوں اور سیکولر ریاستوں کے ساتھ بلقان، مغربی اور مشرقی افریقہ، مشرق وسطیٰ، قفقار، وسطِ ایشیا، انڈیا، انڈونیشیا اور فلپائن کے ساتھ شدید تنازعات میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس کوشش کے ساتھ کہ وہاں اسلامی قانون کو جو کہ سلگتا ہوا مسئلہ ہے ’فروغ دیں۔‘‘

ان مذکورہ بالا مسائل کا حل بنیاد پرستی اور غلط فہمیوں پر نظام کو فروغ دینے کی بجائے عالمی برداشت کے کلچر کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ گویا یہ صرف عالم اسلام ہی نہیں بلکہ عالم انسانیت کی بنیادی ضرورت ہے کہ مستقبل میں بقائے باہمی کے امکانات کو روشن کرنے کے لیے برداشت کے کلچر کو فروغ ملے جو سیرت الرسول ﷺ سے ملنے والی ہدایت سے ہی ممکن ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی تعلیمات اور اسوہ وسیرت کے ذریعے انسانیت کو وہ نظام زندگی، حقوق وفرائض، احکام وآداب اور اوامر ونواہی عطا فرمائے ہیں جن کو عملاً اپنانے اور نافذ کرنے سے مذکورہ بالا مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ عصر حاضر میں یہ سب کچھ مجادلۂ احسن کے ذریعے ممکن ہے جو کہ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔

خود آزمائی

1۔ مکالمہ کا معنی ومفہوم بیان کریں۔

2۔ مکالمہ کی نوعیت وجہات کی وضاحت کریں۔

3۔ مکالمہ کی شرائط، حدود وآداب بیان کریں۔

4۔ مکالمہ کے مقاصد تحریر کریں۔

5۔ مکالمہ کی دعوتی اہمیت بیان کریں۔

6۔ قرآن حکیم اور احادیث نبویہ میں مکالماتی اسالیب کے کون کون سے نمونے بیان ہوئے ہیں؟

7۔ مکالمہ کے اثرات ونتائج بیان کریں۔

یونٹ نمبر 9

عصر حاضر میں دعوت و تبلیغ کے ذرائع و وسائل

تالیف:

ڈاکٹر محمد سجاد

فہرست عنوانات

	صفحہ نمبر
یونٹ کا تعارف	404
یونٹ کے مقاصد	405
1۔ انفرادی ذرائع	408
1.1۔ تقریر	408
1.2۔ درس	408
1.3۔ توسیعی لیکچر	409
1.4۔ تحریر	410
2۔ اجتماعی ذرائع	410
2.1۔ علمی مجالس	410
2.2۔ تربیتی مراکز	411
2.3۔ علمی مذاکرے	411
2.4۔ معاشرتی مراکز	412
2.5۔ ہسپتال	412
2.6۔ جیلیں	414
2.7۔ سرائے	415
2.8۔ کاروباری ادارے	415
2.9۔ تفریحی مقامات	415
2.10۔ فلاحی ادارے	415

3۔ ادارتی ذرائع	417
3.1۔ ریڈیو	418
3.2۔ ٹیلی ویژن	419
3.3۔ انٹرنیٹ، سی ڈیز، ڈی وی ڈیز اور سٹیلائٹ ٹی وی چینلز کے وسائل	421
3.4۔ اشتہارات	423
خود آزمائی	425

یونٹ کا تعارف

دعوت و تبلیغ کے تقاضوں میں کچھ نظری ہیں تو کچھ عملی ۔ نظری طور پر داعی کا اللہ و رسول پر کامل ایمان ہو اور اپنے اسلام پر فخر ہو۔ مزید یہ کہ وہ صبر و اخلاص اور جرات سے متصف ہو' لوگوں میں گھلنے ملنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور مدعوین کے احوال اور ان کے ماحول سے خوب واقف ہو۔ معاشرتی اوصاف میں سب سے نمایاں یہ ہے کہ وہ خلوت و جلوت میں اسلامی زندگی گزارتا ہو اور صدق و صفا' جود و سخا' زہد و تواضع اور عفو و کرم جیسے اخلاق عالیہ سے آراستہ ہو۔ عملی تقاضا یہ ہے کہ وہ ذرائع ابلاغ اور وسائل دعوت تبلیغ کے استعمال کی صلاحیت رکھتا ہو مثلاً اگر وہ تقریر و خطاب کو دعوت و تبلیغ کا ذریعہ بناتا ہے تو اسے زبان و بیان پر قدرت' اسالیب خطاب کی معرفت اور ایک اچھے خطیب کی صفات و ممیزات سے واقفیت ہونی چاہئے۔ اس کے لئے عقل کو متوجہ کرنے والے دلائل اور دل کو متاثر کرنے والا انداز چاہئے اور اسے انسانی نفسیات سے خاطر خواہ باخبر ہونا چاہئے۔ عملی تقاضے کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ داعی کو حسب امکان اپنے چہرے مہرے' حرکات و سکنات اور لباس و انداز میں دلکش و باوقار ہونا چاہئے۔ تبلیغ دین کے لئے اپنے دور کے بہترین وسائل جن کے استعمال میں کوئی شرعی یا اخلاقی قباحت نہ ہو، اشد ضروری ہے۔ دعوت دین کے وہ طریقے جو قدیم ادوار میں مروج تھے، ان کا استعمال دور جدید میں ایسا ہی ہے جیسا کہ میدان جنگ میں ایٹم بم اور لیزر گائڈڈ میزائلوں کا مقابلہ تلوار اور نیزے سے کرنے کی کوشش کرنا۔ تعلیم و تبلیغ میں ایسے وسائل ایجاد ہو چکے ہیں جن کی مدد سے سالوں کا کام مہینوں میں اور مہینوں کا کام دنوں میں پہلے سے بہت اعلیٰ معیار کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ ان میں ٹیلی فون، ریڈیو، ٹیلی وژن، آڈیو اور وڈیو کیسٹ، پریس، ٹیلکس، فیکس، کمپیوٹر، ویب سائٹس، ای میل، انٹرنیٹ ڈسکشن گروپس، اور ٹیلی - ویڈیو کانفرسنگ شامل ہیں۔ دعوت دین کی ضرورت ہے کہ ان وسائل کو دینی کاموں میں بھی بھرپور طریقے سے استعمال کیا جائے۔ داعی اپنی دعوت پیش کرنے کے لئے ان میں سے کس ذریعے کو کہاں استعمال کرے، اس کا انحصار اس کے دعوتی مقاصد، دعوت کی وسعت، مخاطبین کی تعداد اور دعوتی پیغام کی نوعیت پر ہے۔ اس یونٹ میں کوشش کی گئی ہے کہ ان جدید وسائل دعوت کو بیان کیا جائے جو آج دعوت میں ایک موثر وسیلہ و ذریعہ ہیں۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ دعوت دین انفرادی وسائل وذرائع کا مطالعہ کر سکیں۔

2۔ دعوت دین کے اجتماعی وسائل وذرائع کا مطالعہ کر سکیں۔

3۔ دعوت دین کے ادارتی وسائل وذرائع کا مطالعہ کر سکیں۔

4۔ دعوت دین میں جدید برقی وسائل وذرائع کا مطالعہ کر سکیں۔

5۔ دعوت دین میں الیکٹرونک وسوشل میڈیا کے وسائل کا مطالعہ کر سکیں۔

دعوت یا تبلیغ کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے ایک اہم عنصر وہ وسائل یا ذرائع ہیں جن کی معاونت سے داعی مدعو تک اپنی دعوت پہنچائے گا۔اس ضمن میں اگر تاریخ دعوت کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انبیاء کرامؑ نے اپنے زمانوں میں تعلیم و تبلیغ کے لئے بدلتے ہوئے طریقوں اور ذرائع سے کام لیا ہے۔ مثلاً ابتدائی دور تمدن میں جب تک لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا۔انبیاء کی تعلیم بھی زبانی ہوتی تھی۔اور یہ تعلیم زبانی روایات کی صورت میں اگلی نسلوں کو منتقل ہوئی تھی۔اور جب انبیاء کے بتائے ہوئے اصول فراموش ہوتے تو اللہ دوسرا نبی بھیج دیتا۔لیکن جب تحریر کا فن ایجاد ہوا تو دعوت کے سلسلہ میں یہ ترقی یافتہ ذریعہ استعمال کیا گیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لکھی ہوئی الواح اپنی امت کو دیں۔اللہ نے امت مسلمہ پر بھی یہ احسان کیا۔

﴿اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾[1]

مولانا اصلاحی لکھتے ہیں "کہ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کا طریقہ تبلیغ کوئی جامد طریقہ نہیں بلکہ انسان کی علمی و ذہنی ترقیوں کے ساتھ اس میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ سائنس اور تمدن کی ترقی سے انسان کے وسائل کار اور ذرائع معلومات میں جو اضافے ہوئے ہیں۔ان سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا حق داعی حق کو ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ آج حق کی تبلیغ کے لئے ان ذرائع (پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما وغیرہ) پر قبضہ کیا جائے۔"[2]

بنیادی طور پر تبلیغ قول کے ذریعے کی جا سکتی ہے عمل کے ذریعے کی جا سکتی ہے اور داعی کی سیرت سے اثر لے کر بھی تبلیغ کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ تبلیغ کے پرانے ذرائع کے حوالہ سے تو درس تقریر، خطبہ یا لکھے ہوئے صحائف کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وقت اور حالات کے تبدیل ہونے کی وجہ سے جو ذرائع انسانوں کے عام استعمال میں آچکے ہیں ان سے دعوت کے لئے اگر کام نہ لیا جائے تو حماقت ہو گی۔ایک داعیٔ حق اس تصور کی ہرگز تائید نہیں کر سکتا کہ وہ صرف اُن طریقوں کو دعوت کے لئے استعمال کرے جن کو انبیاء نے استعمال کیا اور دیگر ذرائع کو مادیت کے الزامات لگا کر چھوڑ دے۔ عقلی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ جدید ذرائع ابلاغ نے تعلیم و تبلیغ کے کام کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے مثلاً ایک بڑی تقریر چند منٹوں میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچائی جا سکتی ہے۔

---

1 سورۃ علق ۹۶: ۳۔۴

2 دعوت دین اور اس کا طریق کار: ص ۸۸

جدید سمعی وبصری معاونات کے ذریعے مشکل امور کو عوام الناس کے ذہن نشین کرایا جاسکتا ہے۔ جدید ذرائع مواصلات کی وجہ سے دنیا کے فاصلے سمٹ گئے ہیں آج ایک بات ساری دنیا کو بالکل سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی طرح سنائی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان ذرائع کو استعمال نہ کرے اور صرف انبیاء کے استعمال کئے ہوئے ذرائع سے کام لینا چاہئے (حالانکہ انبیاء کے طریقے اور ذرائع اپنے زمانوں کے لحاظ سے جدید ترقی یافتہ ذرائع ہوتے تھے) تو ایسے دعاۃ حق کی سادگی پر صرف افسوس کیا جاسکتا ہے (جیسا کہ عصر حاضر میں بھی کچھ لوگ جماعت کے دوران مائیکروفون کے استعمال کو درست نہیں سمجھتے اور دورانِ جماعت امام کے تکبیر پڑھنے کے بعد مکبر ہوتے ہیں جو متعین فاصلے سے دوبارہ تکبیر پڑھتے ہیں تاکہ عوام کو انسانی آواز کی تکبیر سنائی دے)

مولانا اصلاحی نے لکھا ہے کہ "اگر اہل حق انبیاء کی پیروی میں گھر گھر جاکر تبلیغ کرنے کو اولیٰ سمجھے اور ان ذرائع کو ہاتھ نہ لگائے تو یہ طریق انبیاء کی پیروی نہیں بلکہ شیطان کا بہت بڑا دھوکا ہوگا کہ جب تک آپ اپنے طریقہ پر چل کر دو آدمیوں سے کوئی بات کہیں تب تک وہ ان سائنٹفک وسائل سے کام لے کر کروڑوں آدمیوں تک اپنی دعوت باطل نہایت مؤثر طریقے پر پہنچادے۔"[3]

اگر سیرت طیبہ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو آپ ﷺ کی سیرت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دعوت دین کے لئے آپ ﷺ نے اپنے عہد کے رائج طریقے اختیار کئے البتہ اگر کسی بات کا خیال رکھا تو صرف یہ کہ اُس میں کوئی غیر شرعی پہلو نہ ہو۔ اور اگر کسی چیز میں صحیح وغلط کو خلط ملط پایا تو غلط کو چھوڑ کر صحیح کو اختیار فرمایا۔ مثلاً پہلی دعوت آپ نے اس طرح دی کہ خاندان عبدالمطلب و ہاشم کو دعوت بعام پر مدعو کیا اور پھر ساتھ اپنا مقصد بتایا۔ پھر آپ نے عربوں میں رائج نذیر عریاں (مفہوم پیچھے گزر چکا ہے) کا طریقہ اختیار کیا مگر اس میں سے عریانیت کے پہلو کو چھوڑ دیا اور اللہ نے آپ کے ترمیم کردہ طریقے پر آپ ﷺ کو نذیر مبین کا خطاب بھی دے دیا۔

آپ ﷺ نے تجارتی میلوں، ثقافتی میلوں اور حج کے اجتماعات غرض ہر ذریعے کو دعوت کے لئے استعمال کیا۔ ذیل میں دعوت کے وسائل وذرائع پر گفتگو کی جائے گی۔

---

3 دعوت دین اور اس کا طریق کار: صفحہ ۸۹

1۔انفرادی ذرائع

دعوت کے انفرادی ذرائع و وسائل درج ذیل ہیں:

1.1۔تقریر

دعوت کا سب سے زیادہ استعمال ہونے والا ذریعہ تقریر ہے۔ نیز عوام الناس کی ایک بڑی تعداد کے لئے تقریر نہایت مؤثر ذریعہ دعوت بھی ہے۔ البتہ داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ دورانِ تقریر درج ذیل امور کا لحاظ رکھے:

۱۔ جس موضوع پر بھی وہ دعوت دینا چاہے اس کو چاہئے کہ وہ آیات قرآنی احادیث اور اقوال صحابہ سے استشہاد کرے۔

۲۔ قصص اور ضرب الامثال کو حسب ضرورت استعمال کرے جس طرح آنحضور ﷺ نے نماز سے خطاؤں کے صاف ہونے کی تمثیل دن میں پانچ بار نہر میں غسل سے دی۔

۳۔ یہ کہ مقرر اپنی تقریر کو بہت زیادہ طویل نہ کرے۔

۴۔ یہ کہ وہ تقریر میں وقفہ کرے۔

۵۔ داعی کا کلام واضح ہونا چاہئے کیونکہ سننے والوں میں اکثر اوسط درجہ کی عقل و فہم کے مالک ہوتے ہیں۔

۶۔ یہ بات پسندیدہ ہے کہ داعی کلام کا آغاز خدا کی حمد سے کرے۔

۷۔ داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے امور جن میں کوئی تنبیہ ہو اسی انداز سے سنائے تاکہ قلوب ان کا درست اثر لیں۔

۸۔ داعی کو چاہئے کہ اس کا کلام بہت تیز نہ ہو آواز کو معتدل رکھے بلا ضرورت بلند نہ کرے۔

۹۔ لکھی ہوئی تحریر پڑھنا تقریر نہیں ہوتی۔ یہ انداز تحقیقی مقالہ جات پڑھنے میں اختیار کیا جاتا ہے جن کے سامعین خاص ہوتے ہیں وہ اس کو غور سے سنتے اور اس سے اثر لیتے ہیں۔

1.2۔درس

دعوت کے لئے ایک زریعہ درس ہے۔ درس میں قرآن یا احادیث یا فقہ وغیرہ کی تشریح کی جاتی ہے۔ درس کی عموماً یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس میں افراد کی تعداد کم ہوتی ہے لہٰذا داعی کو یہ موقع میسر آجاتا ہے کہ وہ حاضرین کو اچھی طرح بات سمجھا سکے۔ اگرچہ حاضرین کی تعداد زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ داعی کو چاہئے کہ درس کے لئے باقاعدہ تیاری

کرے اور زیادہ طویل بیان نہ کرے کیونکہ اس سے سامعین اکتا جاتے ہیں۔ قرآن پاک کا درس دینے لئے داعی کو چاہئے کہ تفسیر القرآن بالقرآن کا اصول خاص طور پر پیش نظر رکھے درس قرآن کے علاوہ احادیث سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اقوال مفسرین سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ یہی طریقہ حدیث کے درس میں استعمال ہوتا ہے۔

1.3۔ توسیعی لیکچر

دور حاضر میں دعوت کا ایک رائج طریقہ توسیعی لیکچرز کا ہے۔ اس سے مراد ایسا انداز بیان جس میں کسی متعین موضوع سے متعلقہ معلومات ترتیب سے جمع کر کے بیان کی جاتی ہیں یہ ایک علمی طریقہ ہے اسے کبھی تو خود مضمون نگار پڑھ کر سامعین کو سناتا ہے اور کبھی کوئی دوسرا بھی پڑھ دیتا ہے۔ سامعین کو آخر میں سوال و جواب اور بحث و مباحثہ کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ اس میں مقالہ نگار موضوع پر لکھے ہوئے بنیادی مباحث کو اچھی طرح سے پڑھتا ہے۔ اس سے دعوت کے سلسلہ میں کئی طرح کے کام لئے جاتے ہیں کبھی کسی مخفی چیز کی وضاحت کی جاتی ہے کبھی اعتراضات کا دفاع کیا جاتا ہے اور کبھی ان اوہام و خرافات کا پردہ چاک کیا جاتا ہے جن کی پوری تفصیل تقریروں کے ضمن میں بیان ہو چکی ہے۔

درج بالا خصوصیات کے علاوہ لیکچرز میں کچھ اور خصوصیات بھی ہونی چاہئیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ حوالہ جات صحیح ہوں کیونکہ لیکچرز میں تحقیق اور تنقید کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کے بیشتر اجزاء دوٹوک ہوتے ہیں۔ اس لئے مقالہ نگار کو چاہیے کہ جن چیزوں کا وہ حوالے دے رہا ہے اسے ان پر مکمل اعتماد ہو۔

۲۔ ہلکے پھلکے جملے ہوں۔ اچھا مقالہ پیچیدہ اور بھاری جملوں سے پاک ہوتا ہے تصنع سے بھرے ہوئے الفاظ اور طول طویل جملوں کا استعمال مقالے میں کوئی خوبی پیدا نہیں کرتا بلکہ خامی شمار ہوتا ہے۔

۳۔ متعین نکات کی پابندی ہونی چاہئے۔ اس کو مرتب کرنے میں مقالہ نگار کو کافی عرق ریزی اور دماغ سوزی سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ اس میں برجستگی کا کوئی موقع نہیں ہوتا اس کے برخلاف مدعا کے اظہار کے لئے بالکل واضح الفاظ کا انتخاب کیا جانا چاہئے۔

۴۔ آیاتِ قرآنی، احادیث نبوی اور اقول سلف بالکل درست اور وضاحت کے ساتھ درج کئے جائیں۔

۵۔ مقالہ اصل موضوع سے مربوط ہو۔ مقالے کے تمام اجزاء میں ایک مقصدی ربط ہونا چاہئے کیونکہ داعی کا مقصد تفریح طبع نہیں بلکہ ہمہ گیر اصلاح ہے۔ مقالہ کا مقصد حق کی اشاعت اور معروف اور خیر کے نفاذ کی کوشش ہونی چاہئے۔

۶۔ مقالہ نگار مقالے پر اٹھنے والے اعتراضات کا نہایت تحمل کے ساتھ جواب دے۔

1.4۔ تحریر

دعوت کے انفرادی ذرائع میں تحریر ایک نہایت اہم ذریعہ دعوت ہے داعی اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں تک اپنی بات منتقل کر سکتا ہے انسانی طبائع مختلف صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہیں۔ بعض لوگ تقریر سے زیادہ تحریر سے متاثر ہوتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے یہ ذریعہ نہایت موئثر ہے۔ دعوت بذریعہ تحریر کی بھی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں مثلاً یہ کہ داعی جن کو دعوت دینا چاہتا ہے ان کو خط لکھے کتب اور مضامین تحریر کرے آنحضور ﷺ نے غیر مسلم حکمرانوں کو دعوت اسلام پر مشتمل خطوط تحریر فرمائے علمائے کرام مسلمان حکمرانوں کو نصیحت و موعظت پر مشتمل خطوط لکھتے رہے مثلاً امام اوزاعیؒ نے شام کے والی عباس کو ذمیوں کے حقوق کے بارے میں ایک خط لکھا۔ اسی طرح امام ابو یوسفؒ نے خلیفہ ہارون کو جو رسالہ معاشی معاملات کے متعلق لکھا وہ بعد میں ان کی بڑی مشہور "کتاب الاصول" کے نام سے مشہور ہوا۔ اسلامی مفاہمت پر تصانیف اور بحثیں اور مقالات تحریر کرنا بھی دعوت کا ایک بہت عمدہ طریقہ ہے اور دین اسلام پر مشتمل تصانیف کو دنیا کی زبانوں میں منتقل کر کے شائع کرنا کار دعوت کے لئے بے حد مفید ہے۔

2۔ اجتماعی ذرائع

عصر حاضر میں کسی بھی مقصد کے لئے انفرادی کوششوں کی نسبت اجتماعی کوششوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے جدید ایجادات اور مشینوں کے استعمال کی وجہ سے تیز رفتاری کا رجحان ہر چیز میں عام ہو گیا ہے۔ فرد کی نسبت اجتماع کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ دعوت الی اللہ کے فریضہ کے لئے بھی انفرادی کوششوں کے بجائے اجتماعی کوششوں کے نتائج مثبت ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ان ذرائع کا جائزہ لیا جائے جن کو اجتماعی ذرائع کہا جا سکتا ہے۔

2.1۔ علمی مجالس

علمی مجالس دعوت کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ دعوت کی تاریخ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مختلف ادوار میں علمی مجالس تعلیم و تدریس کے دوران ہی دعوت الی اللہ کے تقاضے بھی پورے کئے جاتے رہے ہیں موجودہ دور میں دو قسم کے تعلیمی ادارے رائج ہیں ایک دینی تعلیم کے ادارے اور دوسرے سائنسی و فنی تعلیم کی درگاہیں۔ جبکہ دور اول میں یہ تفریق نہیں تھی اور علماء قرآن و حدیث کے عالم بھی ہوتے سائنس کی ایجادات بھی کرتے۔ اور ایسے ہی ماحول میں دعوت کا فریضہ کامیابی کے ساتھ ادا کیا جا رہا تھا۔ عصر حاضر میں سائنسی و فنی تعلیم کے ساتھ ڈگری کے درجہ تک اسلامیات کی تعلیم لازمی

ہے۔ مگر اس کو موئثر کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ موجودہ معیار سائنسی وفنی ماہرین کے اندر ایک مومن کی روح بیدار کرنے میں ناکام ہے سکول کالج یونیورسٹی کی سطح مختلف مضامین کی تعلیم کے دوران عصر مسائل اور دعوت کے موضوعات پر لیکچرز کا اہتمام ہونا چاہیئے۔ اس کے علاہ اہل علم کی مختلف اسلامی موضوعات پر مجالس دعوت الی اللہ کے عام ہونے کا ایک ذریعہ ہیں۔ سالانہ سیرت کانفرنس سالانہ قرآن کانفرنس اس کے علاوہ قرآن سرکلز دعوت الی اللہ کے ذرائع ہیں۔

2.2۔ تربیتی مراکز

دعوت کا ایک اہم ذریعہ مختلف نوعیت کے تربیتی مراکز ہیں۔ صفہ کی تربیت گاہ سے تربیت یافتہ ہو کر نکلنے والے صحابہ کرام بہترین داعی ثابت ہوئے تربیت گاہ میں رہ کر تربیت حاصل کرتے ہوئے انسان دعوت ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے اور جب اس ماحول میں دعوت دی جاتی ہے تو وہ اس کے دل ودماغ کی گہرائیوں میں جگہ بناتی ہے، مختلف جماعتیں اپنے افراد کی تربیت کے لئے سہ روزہ، دس روزہ اور چالیس روزہ اور پھر کئی مہینوں پر مشتمل تربیت کے پروگرام تشکیل دیتی ہیں اور اسی طرح وہ داعیوں کی تربیت کرتی ہیں۔ لہٰذا مختلف تربیتی مراکز داعیوں کی تیاری اور دعوت کی حکمت عملی کے وضع کرنے نیز دعوت کو زیادہ موئثر طریقوں سے عام کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مختلف تعلیمی اداروں کے ساتھ جو اقامت گاہیں ہیں ان کے قواعد وضوابط کی اصلاح کی جائے اور اُن کے موجودہ پروگراموں میں دعوت کے عنصر کو شامل کیا جائے تاکہ پھر ان اداروں سے نکلنے والے طلباء **اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً**[4] کی عملی تفسیر ثابت ہو سکیں۔ آنحضور ﷺ تربیت کے پہلو پر بہت زور دیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں

"کان الرجل منا اذا تعلم عشر آیات لم تجاوزھن حتی یعرف معانیھن والعمل بھن"[5]

ترجمہ: جب ہم میں سے کوئی شخص دس آیات سیکھ لیتا تھا تو ان سے آگے نہیں بڑھتا تھا یہاں تک کہ ان کے معانی نہ پہچان لے اور ان پر عمل نہ کر لے۔ یعنی آنحضرت ﷺ تعلیم قرآن کے ساتھ تربیت کا پورا اہتمام فرماتے تھے تب ہی وہ صحابہ کی ایسی جماعت تیار فرما سکے جس نے مشرق مغرب میں دعوت کا فریضہ باحسن طریق انجام دیا۔

2.3۔ علمی مذاکرے

علماء اور ہال علم کے علمی مذاکرے اشاعت دعوت کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔

---

4 القرآن البقرہ: ۲۰۸

5 تفسیر ابن کثیر جلد ۱، صفحہ ۳

2.4۔ معاشرتی مراکز

دعوت کی توسیع واشاعت کا ایک ذریعہ مختلف معاشرتی مراکز وادارے ہیں گو کہ ہر معاشرتی ادارہ اپنے مخصوص مقصد کے لئے قائم کیا جاتا ہے مگر اسلامی حکومت کا ادارہ ہونے کی وجہ سے اس کے کردار میں دعوت کا عمل شامل ہوتا ہے چنانچہ ذیل میں چند معاشرتی اداروں کا ذکر کیا جائے گا نیز یہ وضاحت کی جائے گی کہ یہ ادارے اپنی مخصوص حیثیت کے ساتھ کس طرح دعوتی کام میں معاون ہو سکتے ہیں۔

2.5۔ ہسپتال

ہسپتال بنیادی طور پر مریضوں کے علاج کا مقام ہے مگر درج ذیل تدابیر کے اختیار کرنے سے اس مقام کی فنی حیثیت کے ساتھ ساتھ اسے دعوتی مرکز بھی بنایا جاسکتا ہے۔ گو کہ ایک حد تک ان کو مد نظر رکھا جاتا ہے:

۱۔ ڈاکٹرز کی تربیت اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کی جائے۔ان کے اندر اسلامی اقدار کو راسخ کیا جائے اور انہیں اسلامی آداب کا پابند بنایا جائے۔

۲۔ ڈاکٹرز کے اندر جذبہ خدمت خلق پیدا کیا جائے جس سے خدمت ان کی ترجیح اول بن جائے۔

۳۔ نرسنگ ایجوکیشن کو اسلام کے مطابق فروغ دیا جائے۔

۴۔ مردوں میں بھی نرسنگ کو فروغ دیا جائے۔

۵۔ نرسوں کی عزت نفس کے لئے نرسنگ کو معاشرے میں باوقار پیشہ کے طور پر متعارف کرایا جائے۔

۶۔ ڈاکٹرز مریض کے جسمانی علاج کے ساتھ ساتھ روحانی علاج کی طرف بھی توجہ کریں حالت مرض میں دل نرم ہوتا ہے اس لئے اللہ کی طرف رجوع کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ بیمار آدمی ذہنی ونفسیاتی طور پر پریشان ہوتا ہے لہٰذا اس کو اس وقت میں ایسے انداز میں دعوت کی طرف راغب کیا جائے کہ وہ اس کو تسلیم کرے اور واپس جا کر بھی اس پر عمل پیرا ہو۔

2.6۔ جیلیں

اسلام کا تصور سزا عصر حاضر کے تصور سزا سے بہت مختلف ہے۔ عہد نبوی ﷺ میں ہمیں جیل کا کوئی تصور نہیں ملتا سوائے اس کے کہ جن لوگوں کے کسی جرم کے بارے میں کوئی حتمی حکم نازل نہ ہوا ان کو محدود مدت کے لئے گھر میں نظر بند رکھا گیا اور جو نہی حکم آیا اس کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا۔ جیل کے آغاز کا ذکر عہد

فاروقی میں ملتا ہے مگر وہ دورِ حاضر کے عقوبت خانوں سے بہت مختلف ہے۔ اس میں بنیادی فرق تصور سزا کا ہے۔ اسلام کے ابتدائی ادوار میں سزا اصلاح کے نقطۂ نظر سے ہوتی تھی عصر حاضر کی طرح انتقام کی غرض سے نہیں ہوتی تھی۔ اور قیدیوں کو ایسا ماحول فراہم کیا جاتا تھا جس میں وہ اپنی اصلاح کرتے اور ذمہ دار شہری بن کر واپس معاشرے کا حصہ بنتے۔ مگر موجودہ دور کے عقوبت خانوں میں اگر غلطی سے کوئی بے گناہ بھی چلا جائے تو مجرم بن کر واپس آتا ہے۔ نیز اسلامی تصور سزا میں عمر قید کا تصور بھی نہیں ملتا کیونکہ اس سے نہ تو مجرم کو کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی معاشرے کو۔ امام غزالیؒ اور علامہ ابن خلدون نے تصور سزا پر بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے اور ان کا سارا زور قصور وار کی اصلاح کر کے اس کو معاشرے کا ذمہ دار شہری بنانے پر ہے۔ جبکہ عصر حاضر کی جیلیں اس کے بالکل برعکس نتائج پیدا کرتی ہیں۔ ذیل میں چند تجاویز ذکر کی جائیں گی جن پر عمل کر کے اس معاشرتی مرکز سے دعوتی مقاصد میں معاونت حاصل کی جاسکتی ہے اگرچہ ان میں سے بہت سی تجاویز جیلوں کے چارٹر میں موجود بھی ہیں مگر اصل مسئلہ عمل درآمد کا ہے۔ تجاویز درج ذیل ہیں:

۱۔ جیل کے اندر خدا ترس، انسانی ہمدردی رکھنے والے اور مجرموں کی اصلاح کے لئے مناسبت اہلیت رکھنے والے عملے کا تقرر کیا جائے۔

۲۔ جیل کے عملے میں ماہر نفسیات اور اس کے امدادی عملے کو شامل کیا جائے تا کہ ہر وہ شخص کی نفسیات کو جان کر ان کی اصلاح کے لئے مناسب اقدام کر سکے۔

۳۔ جیل کے اندر دینی تعلیم کا انتظام لازمی ہونا چاہئے اگرچہ تاحال جیلوں میں صرف ناظرہ قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام ہے۔

۴۔ جیل کے اندر پانچ وقت کی نماز باجماعت کو لازمی قرار دیا جائے۔ مگر اس بات کا خاص خیال ہو کہ نماز اور درس وغیرہ کا شوق پیدا کیا جائے ان میں شمولیت خوف کی بناء پر نہ ہو کیونکہ خوف کی بنا پر کیا ہوا عمل بے نتیجہ ثابت ہوتا ہے۔

۵۔ ہفتہ میں ایک دن اسلامی اقدار پر کسی اہل علم سے لیکچر چلایا جائے۔

۶۔ طہارت اور صفائی کی تربیت کا لازمی نظام ہو۔

۷۔ فنی تعلیم کا بندوبست بھی ہو تا کہ قیدی ایک مفید کارکن بن کر نکلے اور جیل سے باہر نکلنے کے بعد معاشرے کے لئے فائدہ مند ثابت ہو۔

۸۔ قیدیوں کو سمعی و بصری معاونات کے ذریعے تعلیم دی جائے۔ سبق آموز اور اسلامی موضوعات پر مبنی فلمیں دکھائی جائیں کیونکہ تمثیلی ذریعہ تعلیم زیادہ مؤثر ذریعہ ہے۔

۹۔ جیل میں ہر قسم کے نشہ حتیٰ کہ سگریٹ پر بھی پابندی لگائی جائے۔

۱۰۔ قیدیوں کی عزت نفس کی حفاظت کی جائے اور انہیں ایک معزز فرد کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جائے۔

۱۱۔ درج بالا امور پر عمل کرنے والے قیدیوں کو سزا میں چھوٹ دی جائے۔

۱۲۔ قیدیوں کے ساتھ برتاؤ میں اسلامی عدل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے۔

2.7۔ سرائے

اسلامی تعلیمات کا ایک قابل فخر پہلو یہ ہے کہ اس میں مسافر کو بہت زیادہ سہولتیں دی گئی ہیں۔ حتیٰ کہ مسافر کو نماز میں بھی قصر کا حکم ہے رمضان کا روزہ قضاء کرنے کی رخصت ہے اسی طرح دیگر شرعی معاملات میں بھی رخصتیں ہیں۔ اسلامی تعلیمات کو مسلمانوں نے پوری طرح نافذ و رائج کیا۔ مسلمان حکمرانوں نے ہر ایک منزل پر سرائے تعمیر کرائیں جن میں مناسب سہولیات اسلامی نظامِ معیشت نہایت مضبوط اور پائیدار بنیادوں پر قائم ہے۔اس کا بنیادی اصول سود کا خاتمہ اور زکوٰۃ کا رواج نہایت دور رس نتائج کا حامل ہے۔ سود کا خاتمہ اس بات کی ضمانت ہے کہ دولت ایک محدود طبقہ میں جمع نہ ہونے پائے۔اور زکوٰۃ اس بات کی ضمانت ہے کہ دولت کی گردش کسی سماج کے دونوں (خواص و عوام) طبقات میں جاری رہی۔ اور اسی میں انسانیت کی فلاح ہے۔ ضروری ہے کہ کاروباری مراکز میں اس بنیادی اصول کے رواج کا اہتمام کیا جائے۔ تجاویز درج ذیل ہیں اس معاشرتی مقام کو بھی دعوت کی اشاعت کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے لہٰذا حکومت اور با اثر عوام کو چاہئے کہ وہ ایسے اقدامات کریں کہ مسافر دورانِ سفر میں بھی اسلامی تعلیمات سے متاثر ہوں۔ درج ذیل تجاویز کو عمل میں لانا ضروری ہے:

۱۔ مسافر خانوں میں ضرورت مند مسافروں کے طعام کا بلا معاوضہ انتظام ہو۔

۲۔ تہی دست مسافروں کے لئے مالی مدد کا انتظام ہو۔

۳۔ ہر مسافر خانے پر مسجد ہو۔

۴۔ طہارت کا مناسب انتظام ہو۔ اگرچہ بہت سے مقامات پر ایسا ہے مگر اس کو وسیع کیا جائے۔

۵۔ مسافر خانوں میں بھی آیاتِ قرآن واحادیث کی تعلیم پر نٹ والیکٹرانک میڈیا کے ذریعے جاری ہو (مگر مؤثر اور مناسب انداز اور مقدار میں)

2.8۔ کاروباری ادارے

معیشت کسی بھی نظام کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے معاشی آزادی دورِ حاضر کی سب سے بڑی ضرورت بن گئی ہے۔ اسلام کا پورا نظام معیشت ہے۔ اور اس میں غیر سودی معیشت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اس پر عمل نہ کرنے والوں کے لئے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی وعید ہے۔ لیکن دور حاضر میں ان مراکز میں بھی کچھ تبدیلیاں کر کے دعوت الی اللہ کے فریضہ کی ادائیگی ممکن ہے۔

۱۔ معیشت کی تعلیم میں اسلامی اقتصادیات کی تعلیم کو نمایاں اہمیت دی جائے۔

۲۔ پاکستان میں اور اسلامی دنیامیں اسلامی نظام معیشت کو رائج کیا جائے۔

۳۔ بیرونی ممالک پر انحصار کے بجائے امت مسلمہ کو آپس میں اعتماد اور اتفاق کے ساتھ چلنا چاہئے۔

۴۔ اسلامک ڈویلپمنٹ بینک کو مؤثر کیا جائے وغیرہ۔

2.9۔ تفریحی مقامات

قدیمی زمانہ سے تجارتی و تفریحی اغراض کے لئے میلوں کے انعقاد کا سلسلہ جاری ہے۔ داعی کو اس قسم کے اجتماعات سے غیر شرعی باتوں کی بنا پر اعراض کرنے کی بجائے اس ذریعہ کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ میلوں میں تفریح کا اسلامی تصور واضح کیا جائے۔ اس کے علاوہ دیگر تفریحی مقامات پر تفریح کے اسلامی تصور کو عام کیا جائے اور اس میں سے غیر شرعی باتوں کو چھوڑ کر دیگر کو اپنایا جائے اور کیونکہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس قسم کے مقامات پر ہوتی ہے لہٰذا لوگوں کو بشارت سنا کر تالیف قلب کے ذریعے سے دلچسپ طریقے سے دعوت کی اشاعت کرنی چاہئے اور اس معاشرتی مرکز سے دعوت کے مقاصد کے حصول کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔

2.10۔ فلاحی ادارے

عصر حاضر میں انسانی آبادی کے بہت بڑھ جانے نیز اس وجہ سے مسائل کے بہت بڑھ جانے اور وسائل کے محدود ہونے کی وجہ سے بہت سی خدمات حکومت کے علاوہ نجی سطح پر افراد اور ادراوں نے اپنے ذمہ بھی لے لی ہیں ایسے اداروں کو

(این،جی،اوز) کہتے ہیں یہ ملکی بھی ہوسکتی ہیں اور غیر ملکی بھی۔ ملکی فلاحی ادارے جو عالمِ اسلام میں مدد کرتے ہیں یا داعی اگران سے اپنے مقاصد کے لئے مدد لے تو یہ "استعانت بالغیر" کے حکم میں آئے گا۔ ذیل میں اس پر گفتگو کی جاتی ہے۔

استعانت کا مطلب ہے مدد چاہنا۔ مدد اپنوں سے بھی مانگی جاسکتی ہے اور غیر مسلموں سے بھی اور اس کا سبب یہ ہے کہ داعی اپنی دعوت پہنچانے پر حریص ہوتا ہے اور اس کے لئے وہ ہر اس وسیلہ کو پسند کرتا ہے جو اس کے مقصد میں مددگار ثابت ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اللہ سے اپنے بھائی کی استعانت چاہی۔ داعی کے لئے یہ جائز ہے کہ اس دعوت سے روکا جائے تو وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے بااثر افراد و طبقات کی مدد لے۔ اس سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس مقصد کے لئے غیر مسلم سے بھی مدد لی جاسکتی ہے ؟ اگر ہاں پھر ان امور کا تعین کیا جائے گا جن میں مدد لی جائے گی اور پھر اس استعانت کی شرائط ذکر کی جائیں گی:

۱۔ داعی کے لئے جائز ہے کہ دعوت کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے جہاں ضرورت ہو غیر مسلموں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ اس کا جواز یہ ہے کہ

۲۔ آنحضرت ﷺ حضرت ابو طالب کی استعانت کی وجہ سے تبلیغ کر پاتے تھے۔ جب کہ حضرت ابو طالب اپنی قوم کے دین پر تھے اور ان کے وفات پاتے ہی قریش کے مظالم اسقدر شدید ہو گئے کہ آپ کو دعوت کے لئے مکہ سے باہر دیکھنا پڑا۔

۳۔ جب آپ ﷺ طائف گئے تو واپسی پر آپ ﷺ ایک مشرک مطعم بن عدی خزاعی کی جوار میں مکہ میں داخل ہوئے۔

۴۔ جب مکہ میں مظالم ناقابل برداشت ہو گئے تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کا مشورہ دیا اور حبشہ کا بادشاہ عیسائی تھا۔

۵۔ ابن الدغنہ نے حضرت ابو بکر کو جوار دی جبکہ وہ غیر مسلم تھا۔ گویا دعوت کے بلند تر مقاصد کے حصول کے لئے اگر غیر مسلموں سے بھی مدد لینا پڑے تو لی جاسکتی ہے۔ مگر یہ خیال ضروری ہے کہ اس مدد سے غرض داعی کا اپنی زندگی کا تحفظ یا مشکلات سے بچ کر آسانیوں کا حصول یا کفار سے مداہنت نہ ہو بلکہ صرف اس وقت مدد لی جائے جب وہ دعوت کے مقاصد کے حصول کے لئے معاون ہو۔

شرائط

غیر مسلموں سے معاونت حاصل کرنے کی کچھ شرائط ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے داعی کے مقصد میں کوئی سمجھوتہ نہ کرنا پڑتا ہو۔ جیسا کہ حضور ﷺ کے چچا ابو طالب نے جب آپ ﷺ سے یہ کہا:

"فابق علی وعلی نفسك ولا تحملنی من الامر مالا اطیق"

مجھ کو اور اپنی جان پر رحم کرو. مجھ پر ایسا بوجھ نہ ڈالو جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔

تو آپ ﷺ نے جواب دیا:

"یاعم واللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علی ان اترك ھٰذا الامر حتی یظھرہ اللہ او اھلك فیہ ما ترکتہ"[6]

ترجمہ: یعنی آپ ﷺ نے ذرا بھی سمجھوتہ نہ کیا تو پھر انہوں نے خود ہی آپ کو بلا کر کہا کہ جو آپ چاہیں کریں یہ لوگ (قریش) آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔

اسی طرح حضرت ابو بکرؓ نے ابن الدغنہ کی پناہ بھی چھوڑ دی تھی جب اس نے آپ علی الاعلان نماز نہ پڑھنے کا مطالبہ کیا۔

داعی مختلف امور میں استعانت حاصل کر سکتا ہے مثلاً ہجرت کے موقع پر جب آپ ﷺ نے اپنے اسی مقصد کے لئے تیار کی ہوئی اونٹنیاں نکالیں تو ایک مشرک کو راستہ دکھانے کے لئے اجرت پر رکھا۔ اسی طرح بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر حضرت عباسؓ جو کہ اس وقت تک مسلمان نہ تھے نے اہل مدینہ سے آپ ﷺ کی حفاظت کی ضمانت چاہی۔

ان سب امور میں استعانت اس وقت حاصل کی جائے گی جب معاون کے بارے میں اخلاص کا یقین ہو۔ اور داعی کے پیش نظر اپنے مقصد کی خدمت ہو۔ دورِ حاضر میں غیر مسلم ممالک کی (این، جی، او) اس مقصد کے لئے مدد فراہم کر سکتی ہیں۔

3۔ ادارتی ذرائع

عصر حاضر کے حالات اور روز افزوں تمدنی ترقی نے اجتماع کو پہلے سے کہیں زیادہ اہم اور ناگزیر بنا دیا ہے نیز جدید ذرائع ابلاغ و مواصلات نے دنیا کو سمیٹ کر ایک گلوبل ویلج میں تبدیل کر دیا ہے۔ دورِ حاضر میں فرد کی نسبت اجتماع کو بہت زیادہ

---

6 ابن ہشام: جلد ۱، صفحہ ۲۷۸

اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔اور اس پس منظر میں ہر شعبہٗ زندگی میں اداروں کی اہمیت پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔دعوت کے فرئضہ کی ادائیگی کے لئے بھی ادارے ناگزیر ہیں۔بلکہ آج اگر کوئی داعی ان جدید ذرائع سے کام لینے سے انکار کرتا ہے تو یہ بات ظاہر ہے کہ وہ دعوت ناکام کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ذیل میں دعوت کے اداراتی ذرائع کا ذکر کیا جائے گا۔

3.1۔ریڈیو

عصر حاضر میں الیکٹرانک میڈیا میں ایک اہم ذریعہ ریڈیو ہے۔۱۹۲۲ میں مارکونی نے خبروں کی ریڈیائی نشریات کا آغاز کیا۔دور حاضر میں ریڈیو کا حلقہٗ اثر بہت وسیع ہے۔ریڈیو کی رسائی ان تمام علاقوں تک بھی ہے جہاں ابلاغیات کے کسی اور ذریعے کی رسائی نہیں ہے۔ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگوں تک ریڈیو کی پہنچ ہے۔نیز عصر حاضر میں مصروفیات کے حد سے بڑھ جانے کی وجہ سے مطالعہ کتب کا تناسب بہت کم رہ گیا ہے۔لہٰذا ریڈیو کے ذریعے انسان کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکتا ہے۔داعی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس طرح کے قوی الاثر ذریعہ کو تبلیغِ حق میں استعمال کرے اور اس سے اپنے مقصد کے حصول کے لئے مدد لے موجودہ دور میں الیکٹرانک میڈیا سے مذہبی پروگرام بھی پیش کئے جاتے ہیں۔لیکن ایک تو ان کا تناسب دیگر پروگراموں کے مقابلے میں بہت کم ہے دوسرا پیشکش کے حوالے سے بہت سی خرابیاں ہیں۔تیسرا ان پروگراموں کے اوقات بھی ایسے ہوتے ہیں جن میں زیادہ لوگ متوجہ نہیں ہوتے لہٰذا ان امور کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

ریڈیو کی اہمیت کا اندازہ مسیحی مبلغین نے خوب لگایا انہوں نے اس بات کا درست اندازہ لگایا کہ ریڈیو ایک اہم اور وسیع الانتشار ذریعہ ابلاغ ہے۔اور ایک ایسا وسیلہ ہے کہ انسان کسی کام میں مشغول ہونے کے ساتھ اسے سن سکتا ہے۔چنانچہ انہوں نے ریڈیو کو بکثرت استعمال کیا۔ان کے تقریباً پچاس مشینری ریڈیائی اشاعتی ادارے کام کر رہے ہیں ان نشریاتی اداروں میں ایک لائبیریا کا ریڈیو اسٹیشن ہے جو ریڈیوالوا کے نام سے مشہور ہے اور ۱۹۵۴ میں افریقی اتحاد کے تعاون سے قائم ہوا۔یہ در حقیقت کئی امریکی نشریات کا مجموعہ ہے۔جو افریقہ اسلامی مشرق اور شمالی امریکا کے درمیان واقع ہے۔اس کے علاوہ انگریزی، عربی، فرانسیسی ائر افریقی زبانوں میں پروگرام نشر کرتا ہے۔اسی طرح ایک مشینری ریڈیو اسٹیشن مومنت کارلو ہے جس کو طنجہ سے منتقل کر کے ۱۹۶۰ میں اسی مقام پر قائم کیا گیا۔صوتِ انجیل نامی ریڈیائی نشریات اویس ابابا ایتھوپیا (حبشہ) سے نشر کی جاتی ہیں۔یہ ریڈیو لوتھر کلیا کے اتحاد کی راہنمائی میں کام کرتا ہے لیکن اس پر زیادہ تر

اشترا کیوں کا قبضہ ہے اسی طرح ایک مشنری ریڈیو سروس آسمانی سر گوشی کے نام سے لبنان اور مقبوضہ فلسطین کی درمیانی پٹی کے علاقے میں قائم کی گئی ہے اس سرمایا کہ ضرورت عالمی امریکی مسیحی مبلغین کے ادارے پوری کرتے ہیں۔

مگر اسلامی دنیا میں اب تک اس طرح کے اسٹیشن قائم نہیں کئے گئے نہ ہی کوئی مسلمان ادارہ یا ملک اس طرح کی کسی تحریک کو سپانسر کر رہا ہے مسلمانوں نے اس اہم ذریعہ کی تبلیغی اہمیت کو تا حال محسوس نہیں کیا ہے کہ صورت حال مزید بدتر اسطرح ہوتی ہے کہ مغربی ممالک اور ادارے اس ذریعہ کو نہ صرف ابلاغ بلکہ پروپیگنڈہ کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً برطانوی ریڈیو سے ہمیشہ مغرب اور صیہونیت کے حق میں اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔اس کی ایک مثال یہ ہے کہ سوڈان میں نفاذِ شریعت کے مسئلہ پر بی بی سی نے پروپیگنڈہ کیا جب کہ اس وقت حکمرانوں کا رویہ نفاذ شریعت کے بارے میں واضح نہیں تھا مگر بی بی سی نے اس قانون کی تنقید پر واویلا شروع کر دیا لہٰذا ضرور اس امر کی ہے کہ مسلمان ممالک اور ادارے الیکٹرانک میڈیا کی اہمیت کا درست ادراک کریں اور مناسب پالیسیاں وضع کریں۔

3.2۔ٹیلی ویژن

ٹیلی ویژن کی تاسیس ۱۹۲۸ میں عمل میں آئی۔آہستہ آہستہ دنیا کے تمام ممالک میں ٹی وی اسٹیشن قائم ہو گئے۔ٹیلی ویژن ایک ایسا آلہ ہے جس میں صوت و حرکت اور مناظر جمع ہوتے ہیں اس لئے ٹیلی ویژن کسی دوسرے ذریعہ ابلاغ کی نسب زیادہ مؤثر ہے۔ نیز عصر حاضر میں اس ایجاد کے ذریعہ وقت اور اخراجات کے کم از کم خرچ سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں دنیا کے مختلف معاشروں میں اس ایجاد کے بارے میں مختلف نقطہٗ نظر پائے جاتے ہیں۔اگرچہ ہر جگہ اس کا غالب استعمال تو بغرض تفریح ہی ہے مگر اس کے علاوہ بھی دیگر کئی مقاصد اس سے وابستہ ہیں۔اشتراکی دنیا میں یہ اشتراکی پروپیگنڈے کا وسیلہ ہے۔اسی طرح اس کا ایک اہم مقصد معلومات کا حصول ہے۔

ٹیلی ویژن محض ایک آلہ ہے جو کہ بذاتِ خود اچھا یا برا نہیں ہے بلکہ اس کی اچھائی یا برائی اس کے استعمال سے وابستہ ہے۔ دورِ حاضر میں اسلامی ممالک کی اس بارے میں کوئی متعین پالیسی نہیں ہے۔پوری اسلامی دنیا میں ٹیلی ویژن کی نشریات کے صرف دو مقاصد ہیں:

۱۔ تفریح ۲۔ حکمرانوں کے نقطہٗ نظر کی ترجمانی

دورِ حاضر میں ٹی وی کے ان اثرات کے پیش نظر جو حل تجویز کئے جا سکتے ہیں۔اُن میں

۱۔ ٹیلی ویژن کو اپنے گھروں سے ختم کر دیا جئے۔ مگر یہ کوئی قابل عمل حل نہیں ہے کیونکہ اس کے اثرات سے بچاؤ پھر بھی ناممکن رہے گا۔

۲۔ ٹی وی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اور اس کی اچھائی برائی پر غور کرنا چھوڑ دیا جائے جیسا کہ امت مسلمہ کا وطیرہ ہے۔ اور جس کے نقصانات کا امت کو سامنا بھی ہے۔

۳۔ ٹی وی کو محتاط طریقے پر استعمال کیا جائے۔

۴۔ ٹی وی کو دعوتی مقصد کی نشریات کے لئے عقیدے اور فکر کی روشنی میں لائحہ عمل مرتب کیا جائے اس ذریعہ کو خیر اور ہدایت کے لئے کام میں لایا جائے۔ آخری حل ہی امت مسلمہ کے لئے مفید اور قابل عمل ہے۔ اور اس کو اختیار کرنے کی صورت میں امت مسلمہ تمام علمی و تحقیقی پہلوؤں میں ابلاغ نیز صنعتی اور تجارتی امور میں فوائد حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ اس ادارے کے ذمہ داران ایسے لوگ ہوں جو امت مسلمہ کی ضرورتوں اور فریضہ دعوت الی اللہ کی ضرورت کا پور شعور رکھتے ہوں۔ دعوت الی اللہ ایک ہمہ گیر اور وسیع فریضہ ہے۔ اس کے لئے کوئی لگا بندھا طریقہ کار گر نہیں ہو سکتا۔ فہمی البخار لکھتے ہیں: "دعوت کے لئے گفتگو، واقعات، قصص سے لے کر زمین و آسمان و سمندر میں پھیلی ہوئی بے شمار نشانیوں کا مشاہدہ اور ان کے مناظر دعوت الی اللہ کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔[7]

ان سب مقاصد کے حصول کے لئے ٹی وی ایک موئثر مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ﴾[8]

(عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ اُن پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے)

دورِ جدید میں دیگر بہت سے تحریکیں اپنی دعوت کو عام کرنے کے لئے ٹی وی سے کام لے رہے ہیں اور اپنی غلط بات کو بھی اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ حق کا اس کے علاوہ کہیں اور پائے جانے کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔

---

7 اسلام اور ذرائع ابلاغ: صفحہ ۹۲

8 سورۃ حٰم السجدہ ۴۱:۵۳

3.3۔انٹرنیٹ، سی ڈیز، ڈی وی ڈیز اور سٹیلائٹ ٹی وی چینلز کے وسائل

جدید ترین ایجادات جن کا تعلق ذرائع ابلاغ، مواصلاتی نظام، آپسی روابط اور پیغام رسانی کے عمل اور اس کے تبادلے سے ہے، جیسے انٹرنیٹ (Internet) سی ڈیز (CDs)، ڈی وی ڈیز DVDs) اور سٹیلائٹ ٹی وی چینلز (Satellite TV Channels)۔ان وسائل کی دعوتی نقطہ نظر سے بہت اہمیت ہے۔انٹرنٹ، فضائی ٹی وی چینلز، سی ڈیز، ڈی وی ڈیز کا استعمال اس دور میں بڑے پیمانہ پر عام ہو رہا ہے، اور ساری دنیا میں پھیل رہاہی؛اسی لئے عصر حاضر کو الیکٹرونک میڈیا(Electronic Media)) اور انفارمشین ٹیکنالوجی (Information Technology)) کا زمانہ کہا جاتاہی۔الیکٹرونک میڈیا کے ذریعہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنا پیغام چاہے وہ جس مقصد کے لئے ہو، پہنچایا جارہاہے۔انٹرنیٹ اور ٹی وی چینلز نے تو خاص طور پر ساری دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کردیاہے، آپ اپنے کمرہ میں بیٹھے ہوئے ساری دنیا کے واقعات وحالات سے واقف ہو سکتے ہیں، بلکہ دنیا کے کسی کونے میں رونما ہونے والے حادثات وواقعات کا براہ راست مشاہدہ کر سکتے ہیں، اور لحظہ بہ لحظہ تفصیلات جان سکتے ہیں، بہ طور خاص انٹرنیٹ کے ذریعے جس طرح کی معلومات چاہیں، گھر بیٹھے حاصل کرسکتے ہیں۔جہاں تک دعوتی مقصد کے لئے ان دونوں وسائل یعنی انٹرنٹ اور ٹی وی چینلز کے استعمال کا تعلق ہے تو اس میں شک نہیں کہ دونوں ہی نہایت کارگر اور مفید ہیں۔ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہونے کے ناطے اس بات کا مکلف بنایا گیا ہے کہ دین کی دعوت ساری دنیا کے لوگوں تک پہنچائیں، بلکہ ہمیں ''خیر امت''،یعنی بہترین امت کا خطاب اسی بنیاد پر دیا گیا ہے کہ اللہ پر ایمان کے بعد امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کو بہتر طور پر انجام دیں، اگر ہم تبلیغ دین کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے انٹرنیٹ اور فضائی ٹی وی چینلز کا استعمال کما حقہ کر سکتے ہیں، تو بآسانی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں اور ایک ہی وقت میں دنیا کے مختلف حصوں میں کروڑوں لوگوں کو مخاطب کر سکتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی دعوت کی تبلیغ کے لئے زبان وبیان کے وہ سارے ذرائع استعمال کئے یا اجازت دی جو جاہلی معاشرہ میں رائج تھی، چاہے وہ خطابت ہو یا شعر، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے میلوں اور بازاروں میں بھی تشریف لے گئے اور دین کی دعوت پیش کی۔اس بناپر یہ پورے اطمینان ووثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اللہ کے حکم کو بلند کرنے اور دین کو عام کرنے کے لئے انٹرنیٹ اور سٹیلائٹ ٹی وی کو کام میں لانا عصری تقاضوں کے عین مطابق اور وقت کی اہم ضرورت ہے۔انٹرنٹ کی کئی خدمات لوگوں کے لئے بالکل مفت ہیں، جیسے ای میل(E-mail)

چیٹینگ (Chating) اور ویڈیو کالنگ (Video calling)۔ ان کے ذریعے انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی دعوت کا کام کیا جا سکتا ہے۔ چیٹینگ کر کے براہ راست لوگوں سے تعارف حاصل کیا جا سکتا ہے اور مناسب موقعہ پر ان کو دینی نصیحت کی جا سکتی ہے، دینی کتابوں اور اسلامی مواد کا شوق دلایا جا سکتا ہے، برادران وطن کو اسلام کی دعوت دی جا سکتی ہے، اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جا سکتا ہی۔ ای میل کے ذریعے بآسانی خط وکتابت کا سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہے اور رابطوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا جا سکتا ہی، سیکنڈوں میں مطلوبہ مواد منتقل کئے جا سکتے ہیں اور ان کا آپس میں تبادلہ ہو سکتا ہے۔

دینی دعوت کے لئے انٹرنٹ کا بہترین استعمال یہ بھی ہے کہ اچھے اور معیاری اسلامی سائٹس (sites) کا قیام عمل میں لایا جائے۔ گرچہ ایک معتد بہ تعداد اس طرح کے سائٹس کی پہلے سے موجود ہیں، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ بڑے پیمانے پر علم شرعی میں مہارت رکھنے والے لوگ اس طرف متوجہ ہوں، اور بہم پہنچائی جانے والی معلومات مدلل اور واضح ہوں۔ ان سائٹس پر مختلف زبانوں میں، ورنہ کم از کم چند مشہور زبانوں میں مواد فراہم ہو، چھوٹی چھوٹی جامع دعوتی الیکٹرونک کتابوں کا ذخیرہ ہو، عقائد صحیحہ کو سب سے زیادہ اجاگر کیا گیا ہو، تاکہ کتاب وسنت پر مشتمل عقائد کا علم حاصل ہو سکے۔ دعوتی مقاصد کے لئے مخصوص سائٹس پر اگر ایسے تقاریر ودروس بھی پیش کئے جائیں جن کو سننے اور محفوظ کرنے کی بھی سہولت موجود ہو تو زیادہ بہتر ہی۔ بچوں اور نوجوانوں کی نفسیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے یا تو مستقل سائٹس ورنہ کم از کم لنکس (Links) ایسے ہوں جن میں ایمان واخلاق اور عبادات سے متعلق خوش الحانی کے ساتھ پیش کئے گئے ترانے ہوں، سیرت وتاریخ سے مستند اور صحیح معلومات پر مبنی انبیاء اور رسولوں کے قصے ہوں، صحابہ کرام اور قرون اولی کے مسلمانوں کے واقعات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیرت کا بیان ہوتا کہ ان کے اندر شوق عمل بیدار ہو۔ بالخصوص ان دنوں ایسے سائٹس کی تو نہایت اہم ضرورت ہے جن میں دین اسلام کے محاسن بیان کئے گئے ہوں۔ اس کے دین رحمت ہونے کی خصوصیت کو ابھارا گیا ہو، انسانی حقوق اور خواتین کے سلسلے میں اس کی واضح تعلیمات کو اچھے انداز واسلوب میں سمجھایا گیا ہو، اسلام کے اعتدال پسندی، میانہ روی اور صلح وآشتی کے مزاج کو خوش اسلوبی کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہو، تشدد اور دہشت گردی سے اس کی فطری دوری کو آشکارا کیا گیا ہو، نئے مسلمانوں کے اسلام میں داخل ہونے کے اسباب بتائے گئے ہوں؛ تاکہ ان لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو سکیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غلط پروپگنڈوں اور بیانات کے شکار ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں۔

3.4۔اشتہارات

اشتہار سازی کا مطلب ہے کہ کم از کم وقت میں موئثر ترین ابلاغ۔اس مقصد کے لئے اشتہار میں مختصراًضروری معلومات آسان زبان میں اور تصاویر کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں عصر حاضر میں اشتہارات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مقولہ مشہور ہے کہ اشتہار کے ذریعے مٹی کو سونے کے بھاؤ بیچا جا سکتا ہے۔

اگرچہ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ سے پیش کئے جانے والے اشتہارات کا بڑا حصہ مصنوعات کے فروغ اور خرید و فروخت سے متعلق ہے۔ لیکن خدمات کا اعتراف اور نظریات کو رواج دینے کے لئے بھی اشتہارات موئثر ذریعہ ہیں۔ عصر حاضر میں ساری دنیا میں اشتہارات سے کام لیا جا رہا ہے۔ چین اور روس میں ہورڈنگز پر ماؤزے تنگ، لینن اور دیگر اشتراکی راہنماؤں کے اقوال لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔اشتراکی ممالک میں عام طور پر دو طرح کے اشتہارات نظر آتے ہیں۔(۱) اطلاعاتی(۲) نظریاتی۔

نظریاتی اشتہارات کا مقصد ان ممالک کے مخصوص نظریات کا پرچار اور وہاں کے لوگوں کو اس نظریئے کا حامی اور رکن بنانا ہے۔ نازیوں نے جنگ عظیم اول اور دوم میں جنگی مقاصد کے لئے لوگوں میں لڑنے کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے اشتہارات کا استعمال کیا۔ مثلاً جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھے گئے ایک اشتہار کا ترجمہ ہے اے ماؤں۔ اپنے بیٹوں کو بیدار کرو۔اے بہنو! اپنے بھائیوں کو جھنجوڑو۔[9]

امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلے کے اشتہارات دیکھے جا سکتے ہیں۔ عصر حاضر میں اشتہارات کی اہمیت اور تاثیر کے باعث ان کو تبلیغ اسلام کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔اور کچھ حد تک کیا بھی جا رہا ہے۔

الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سے اسلام کے مقرر کردہ اصولوں کی روشنی میں اشتہارات سے اسلام کی دعوت اور تبلیغ کے لئے کام لیا جا سکتا ہے۔اور میڈیا کے حوالے سے موئثر پالیسی مرتب کر کے اس کام کو موئثر بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً پاکستان سٹیل مل کے افتتاح کے وقت اخبارات و رسائل نے "الحدید" کے حوالے سے قرآنی آیات پر مشتمل خوبصورت اشتہارات تیار کئے تھے۔ جن میں لوہے کی اہمیت و افادیت کا ذکر تھا۔اور جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ اسلام دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ایک ایسا دین ہے جو سائنسی ترقی اور نئی مثبت ٹیکنالوجی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے۔ ہمارے مذہبی اور قومی تہواروں کے موقع پر الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سے قومی اور مذہبی فکر کی ترجمانی کرنے والے اشتہارات پیش

---

9 تحریر مقالہ: اشتہارات کا کردار: شعبہ صحافت اردو کالج کراچی: ۱۹۸۷

کئے جاتے ہیں۔ سماجی مسائل کے حوالے سے بھی مختلف نوعیت کے اشتہارات اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پیش کئے جاتے ہیں۔ مثلاً عطیۂ خون، انسداد منشیات وغیرہ۔ لیکن ایسے اشتہارات کی تعداد بہت کم ہے زیادہ تر اشتہارات مغربی تصورات و نظریات سے ماخوذ ہوتے ہیں جو کہ ہماری تہذیبی روایات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ دور جدید میں اشتہارات کی بڑی تعداد محض بلند معیار زندگی ناآسودہ رہنے والی خواہشات اور مغربی نیز ہندوستانی کلچر کی نقالی اور فحاشی کے فروغ کے لئے کام کرتے ہیں۔ اور اس طرح غیر محسوس طریقے سے نئی نسل کی تربیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عصر حاضر میں تبلیغ اسلام کا کام کرنے والوں کو اس طرح سے کام کرنا ہے:

۱۔ اسلام کی ترویج واشاعت اور اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لئے مؤثر اشتہارات تیار کرنا۔

۲۔ موجودہ اور مروجہ اشتہارات میں اصلاح کر کے ان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا۔ اس ضمن میں اصلاح احوال کے لئے کچھ تجاویز کارگر ہو سکتی ہیں۔

۳۔ مسلمان مشتہرین کو بامقصد اشتہارات کے لئے قائل کرنا۔

۴۔ ذرائع ابلاغ کو اشتہارات کے سلسلے میں ضابطہ اخلاق کی اہمیت سے آگاہ کرنا۔

۵۔ حکومت کی توجہ دلائی جائے کہ وہ اشتہارات میں غیر ضروری مبالغے کی حوصلہ شکنی کرے۔

عصر حاضر میں میڈیا کے حوالے سے یہ امر ضروری ہے کہ تبلیغ دین کے لئے تیار کئے گئے پروگرامز میں اسلامی کلچر کو دلچسپ اور لطیف پیرائے میں پیش کرنا ضروری ہے تاکہ ناظرین کے لئے کشش کا باعث ہوں۔ تبلیغی پروگرام مرتب کرتے ہوئے مغربی، ذرائع ابلاغ کے نظام کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ مغربی ذرائع ابلاغ نے انسانی جبلت کو بنیاد بتایا ہے مگر اسلامی نظریہ حیات میں محض جبلت کافی بنیاد نہیں ہے۔ اس وقت عالم اسلام کو بہت بڑے ثقافتی چیلنج کا سامنا ہے۔ نئی نسل میں اسلامی تہذیب کے اثرات کو قائم رکھنے کے لئے میڈیا کے حوالے سے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اسلام محض عبادات یا محض کلچرل یا محض معاشی قوت کا نام نہیں ہے بلکہ اسلام مکمل انسانی رویے کا نام ہے۔ اور یہ کہ ہم محض روایتی طریقۂ تبلیغ سے اقوام عالم کو متاثر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا عالم اسلام کو اس میڈیم کے حوالے سے مؤثر منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی دنیا کو ایک مرکز ابلاغ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ غیر اسلامی ممالک کے کلچرل غلبہ کو توڑنے کے لئے کمیونیکیشن کی پالیسی بھی ترتیب دی جانی چاہئے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ چونکہ اس وقت بالعموم اسلامی دنیا میں ٹیلی ویژن پر سٹیٹ کنڑول ہے۔ لہٰذا کوئی منصوبہ بندی کرتے ہوئے اپنے ممالک کی حکومتوں سے قریبی رابطہ رکھنا ضروری ہے۔تاکہ جو منصوبہ سازی کی جائے وہ محض کاغذی کاروائی اور دانشمندانہ سوچ تک محدود نہ رہے بلکہ اس کو عملی شکل بھی دی جاسکے۔

خودآزمائی

1۔ دعوت میں انفرادی وسائل وذرائع کی اہمیت بیان کریں۔

2۔ دعوت میں اجتماعی وسائل کون کون سے ہیں بیان کریں۔

3۔ جدید وسائل دعوت میں الیکٹرونک میڈیا کی کیا اہمیت ہے بیان کریں۔

4۔ انٹرنٹ اور دیگر وسائل وذرائع کو دعوت میں کیسے موثر استعمال کیا جاسکتا ہے۔